حسن کی دیوی
(ناول)
پیرالوئی
ترجمہ: عابد علی عابد

فرانس کے مشہور ناول نگار **پیر الوئی** کا شہرۂ آفاق ناول

افروڈائٹ (APHRODITE) کا مکمل ترجمہ

حُسن کی دیوی

مترجم

عابد علی عابدؔ

ISLAMIC BOOK CENTRE
Near Masjid-e-Muqaddas
Urdu Bazar, Karachi.
Mobile: 0320-4046053

تخلیقات

اکرم آرکیڈ، ۲۹ ٹمپل روڈ (صفاں والا چوک) لاہور۔ پاکستان فون: ۷۲۳۸۰۱۴

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر: تخلیقات لاہور

زیرِ نگرانی: لیاقت علی

سن اشاعت: 1999ء

پرنٹرز: اجالا پرنٹرز، لاہور

ٹائٹل: ریاض

قیمت: 120 روپے

تعارف

جدید فرانسیسی ناول نگاروں نے کتنے ہی کلاسیکل ناول لکھے ہیں، لیکن فرانس کے صرف اور صرف ایک ناول نگار پیرالوئی نے قدیم یونان کے واقعات اور تہذیب پر مبنی ناول لکھا۔ رچرڈ ویگز کے بقول یونانی دنیا کے کھنڈر بھی ہمیں یہ نکتہ سمجھا سکتے ہیں کہ دنیائے حاضر کی تلخ زندگی کو کس طرح رسیلا اور قابل برداشت بنایا جاسکتا ہے۔

پیرالوئی نے "افروڈائٹ" لکھ کر رچرڈ ویگز کے اس بیان کو درست ثابت کردیا ہے اس نے فرانسیسی ادب کو وقت کے دبیز پردوں کے دور سے باہر نکال لیا۔ فرانس میں پیرالوئی کے ہمعصر ناول نگار اگر آگ، ریت، پانی یا ایسی قبیل کی دوسری چیزوں پر لکھ رہے تھے تو گویا اس نے پتھروں پر لکھنا شروع کیا۔ لوئی کے ہمعصروں نے تصوراتی دنیاؤں کے بارے میں مزاح اور جذباتی قسم کے ناول لکھے لیکن وہ قلم کے ہتھوڑے سے چٹانوں کو توڑ پھوڑ کر حسن کے مجسمے تراشتا رہتا تھا۔

اس کا لکھا ہوا شہرۂ آفاق ناول "افروڈائٹ" ایک ایسا ہی پتھر کا مجسمہ یا ٹکڑا ہے جس کے بے شمار پہلو ہیں اور ہر پہلو سے طرح طرح کے رنگ و نور کی بارش ہوتی ہے۔ بہت سے ناقدین کی رائے ہے کہ لوئی کا یہ ناول بھی کلاسیکل انداز میں لکھا گیا ہے لیکن وہ افروڈائٹ کو تصوراتی فنکارانہ جوانی اور ہوس کا سنگ میل ضرور قرار دیتے ہیں۔

لوئی نے یہ ناول مفکرانہ انداز میں لکھا ہے "افروڈائٹ" پڑھتے ہوئے اس کا فن ہمیں کہیں کہیں غیر شائستہ یا جذباتی ضرور نظر آتا ہے لیکن اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ یونان کی قدیمی روایات کے تحت لکھے گئے بے شمار ناولوں سے کافی حد تک متاثر تھا اسی لیے ہر وہ شخص جس نے قدیم یونان کے ادب کا عمیق مطالعہ کیا ہوگا "افروڈائٹ" کو ایک یونانی مصنف کا لکھا ہوا ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اسے فرانسیسی ناول ماننے سے قطعی طور پر انکار کر دے گا۔ وہ اسے قدیم زمانے کی ایک کتاب قرار دے گا۔ بہر حال "افروڈائٹ" لوئی کے فن کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے لوئی کو اپنے ہمعصروں کی تحریروں میں کوئی دلچسپی نظر نہ آئی۔ اسی لئے اس نے ان سب کی تحریروں سے الگ تھلگ یونان کی تہذیب اور سکندریہ کے ماحول کو اپنی کتاب میں سمونے کی کوشش کی۔

"افروڈائٹ" یا زہرہ یونانیوں کے نزدیک حسن کی دیوی کا نام ہے۔ لوئی نے اس دیوی کے حسن کو یونانی دیومالائی انداز میں بڑے حوصلے کے ساتھ لکھا ہے۔ اس میں اس نے قدیمی یونان کے باشندوں کی زندگی کے عشقیہ اور رومانی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا لوئی نے یونانی عورت کو خواہ وہ کسی طرح کی داشتہ ہو یا کسبی' نہایت اچھوتے اور دلکش طریقے سے پیش کیا ہے اس نے اپنی اس کتاب کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ :

"ناول کا مرکزی کردار قدیم یونان کی ایک کسبی ہے لیکن قارئین بد دل نہ ہوں آخر کار یہ کسبی اپنی گناہ آلود زندگی ترک نہیں کرے گی اور نہ ہی کسی راہب یا دیوتا کو اس سے محبت ہوگی۔ ایک کسبی کی حیثیت سے اس ناول کی ہیروئن زندگی کے اسٹیج پر اپنا کردار اس بے باکی' ذوق اور تمکنت کے ساتھ نبھائے گی جیسے اس نے سماج کے اس خود کار نظام میں خود اپنی حیثیت اور فریضہ حیات کو منتخب کر لیا ہو۔"

اور واقعی ہم "افروڈائٹ" کی ہیروئن زرینہ کو بالکل اسی طرح کا پاتے ہیں یہ ناول قدیم یونان کے شہر سکندریہ کے ماحول میں لکھا گیا ہے۔ شہر سکندریہ جو ایک لمبے عرصے تک حکومت کرتا رہا ہے اور جس کے شہریوں کے نزدیک محبت کرنا جائز تصور کیا جاتا تھا اور جن میں ہوس پرستی اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ صرف سکندریہ ہی نہیں بلکہ ان تمام شہروں میں بسنے والے افراد جو دنیا میں حکومت کرتے رہے ہیں جن میں بابل' روم' ایتھنز' وینس اور پیرس بھی شامل ہیں بہت زیادہ ہوس پرست تھے۔

سکندریہ کے لوگوں کی ہوس پرستی عظیم ترین آدمیوں کی پیشانیوں پر ایک نور کی شعاع کی طرح ناچتی نظر آتی ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہے کہ شہوانیت ذہن کے ارتقاء کا نہایت پراسرار، لیکن لازمی اور اخلاقی حصہ ہے اور جن لوگوں نے اپنی جسمانی آرزوؤں کا تقاضا پوری طرح محسوس نہیں کیا وہ لازمی طور پر دماغی آرزوؤں کے تقاضوں کی اہمیت کو بھی پوری طرح سمجھ لینے سے محروم رہے ہیں۔ جسم کی طاقت اور قوت بھی دماغ کو تروتازہ اور شاداب بنادیتی ہے۔ ڈی لاکرو نے انسان کے مقابلے میں اہانت اور تذلیل کا ایک بدترین لفظ سوچا تھا اور جسے وہ اپنے دور کے کچھ ادیبوں کے لیے استعمال بھی کرتا تھا وہ لفظ تھا: ''مخنث''!

ناول کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم قدیم یونان کے کسی عجائب گھر کی سیر کر رہے ہوں جس میں سکندریہ کی تمام تہذیب کو پتھر کا بنادیا گیا ہے اور اس میں رکھے گئے تمام بت ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے زندہ ہو کر اپنی تہذیب کو اپنے عمل سے بیان کرنے لگتے ہیں۔

اس کا شمار فرانس کے کلاسیکل ناولوں میں ہوتا ہے جس میں پیرالوئی نے بے باکانہ انداز میں مقدس شہر عرب کی عشقیہ اور رومانی زندگی کو بیان کیا ہے۔

ابتدا میں بہت سے ادیب زیادہ تر ایسے لوگوں کے لیے ناول لکھتے رہتے تھے جن کی ذہنی اور دماغی حیثیت کسی طرح بھی کم عمر لڑکیوں اور مڈل پاس لڑکوں سے بہتر نہیں تھی لیکن پیرالوئی نے اپنے دور کے ان مصنفوں جیسا انداز نہیں اپنایا۔ اس نے سکندریہ کے منظر میں محبت، حسن و عشق (جو قدیم یونانیوں کے لیے شریف ترین جذبہ تھا اور اپنی عظمت کے لحاظ سے سب سے زیادہ بارآور اور آبرومند زندگی) کا عکس نہایت بے باکانہ انداز میں اتارا۔

عیسائی قوم میں محبت کے ساتھ فحاشی اور بے حیائی کے جو تصورات وابستہ ہیں وہ ان پر بنو اسرائیل کی روایات کے اثر کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن یونان میں بسنے والے لوگوں کے دل و دماغ اس قسم کے خیالات سے یکسر خالی تھے۔

پیرالوئی اپنی کتاب کے بارے میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ:

''میں نے اس کتاب کے واقعات کی تحریر میں وہی سادگی ملحوظ رکھی ہے جو یونان میں رہنے والے لوگ اس طرح کی کتابیں لکھتے وقت جائز سمجھتے تھے اور مجھے امید

ہے کہ اسی ذہنی کیفیت اور نقطہ نظر سے یہ کتاب پڑھی بھی جائے گی"۔

اور یہ بات ہے بھی حقیقت۔ یونانی ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اس ناول کو فرانسیسی ناول خیال نہیں کرتے۔

ارسطو کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے جب اپنی زندگی کا آغاز کیا تو اس نے اپنا تمام تر ورثہ کسبیوں اور پیشہ ور عورتوں کی محبت اور لطف اٹھانے میں ضائع کر دیا۔ سیفو کے نام ایک خاص گناہ منسوب کیا جاتا ہے سیزر کو گنجا زانی کہہ کر بلایا جاتا تھا اور پھر ہمارے لیے یہ بھی حیران کن ہے کہ راسائن تھیٹر کی ناچنے گانے والیوں سے نفرت کیا کرتا تھا۔ یا نپولین معاملات محبت میں اپنے آپ کو الجھائے رکھتا تھا۔

فرانس کے ایک انتہائی شریف اور متین مصنف بفن نے عشق کے بارے میں مشورہ کے انداز میں ایک بہت ہی پر لطف بات لکھی ہے وہ لکھتا ہے کہ ؛

"کیا وجہ ہے کہ محبت تمام جانداروں کے لیے سرمایہ نشاط و افتخار ہے لیکن انسان کے لیے باعث زحمت و کلفت۔ جواب یہ ہے کہ جذبہ محبت کی جسمانی حیثیت فرحت بخش اور لذت خیز ہے اور باقی ہر ایک چیز بے کار و فضول۔"

محبت دراصل ایک غیر فانی جذبہ ہے۔ یہ ہر شے میں جاری و ساری نظر آتا ہے اگر محبت کا جذبہ دنیا سے ختم ہو جائے تو ہر شے 'ہر انسان بے کار اور بے لذت ہو کر رہ جائے۔ بہت سے لوگوں نے یا "مصلحین" نے دنیا سے محبت' حسن اور خوبصورتی کے وجود کو مٹانے کی بہت کامیاب کوششیں کی ہیں اور ہماری دنیا بد صورتی کے ان حملوں کی تاب نہ لا سکی اور ان کا شکار ہو کر رہ گئی۔ پیرالوئی کہتا ہے کہ ؛

"قدیم یونان میں الوسس تھیٹر کی نشستوں پر ہزاروں تماشائی بیٹھے انسانی جسم (جس سے کامل تر چیز نہ وجود میں آئی ہے اور نہ ہی تصور میں آسکتی ہے کہ یہ شے خدا کے حسن و جمال کا نمونہ ہے) کی نفیس ترین خوبصورتی کو دیکھتے تھے اور یہ وہ وقت تھا کہ ہوس پرستی سے لبریز محبت بے غیب سمجھی جاتی تھی۔ نہ اس سے بے حیائی کا تصور وابستہ تھا نہ گناہ کا"۔

اسی لیے مصنف نے قدیم یونان کی اس تمام تر زندگی کو اپنے الفاظ میں سمو دیا ہے اس کے لکھنے کا انداز اتنا خوبصورت تھا کہ اس کی تحریروں کے مترجمین کہتے ہیں کہ پیرالوئی کے انداز تحریر کو مکمل طور پر دوسری زبان میں سمونا بہت مشکل مرحلہ ہے

لیکن سید عابد علی عابدؔ مرحوم نے اپنی جوانی کے دور میں اسے اردو کا جامہ پہنایا جس میں انہوں نے پیرالوئی کے انداز تحریر کا عکس اتارنے کی بہت کوشش کی ہے۔ اور یہ بات کہنے میں ہمیں کوئی باک نہیں کہ وہ اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔

کفیل احمد صدیقی

پیر الوئی اور اس کی تخلیقات

انیسویں صدی کے آخر میں ایک نوجوان فرانسیسی انشاء پرداز نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس کا نام "استرتی" رکھا گیا تھا۔ اس وقت مصنف کی عمر اکیس سال تھی۔ اپنے دوستوں کے حلقے میں اس کی کافی شہرت تھی۔ اسے یونانی اور لاطینی ادبیات پر عبور تھا۔ پانچ چھ مشہور زبانوں میں لکھنے پڑھنے پر قادر تھا اور معاش کی طرف سے بے فکری تھی۔

ان حالات میں اس کے ذہن کی رسائی کا کیا عالم ہوگا!

"استرتی" کی اشاعت کے بعد دو تین سال کے عرصے میں اس نے گوناگوں تصانیف شائع کیں ان میں بلیتس کے گیت (بلیتس سیفو کے عہد کی ایک فرضی طوائف کا نام ہے) لیڈا اور افروڈائٹ کا پہلا باب بہت مشہور ہیں۔ اس زمانے میں اس کی تمام توجہ افروڈائٹ کی طرف منعطف ہوگئی۔ چنانچہ ایک سال بعد کتاب مکمل ہو کر شائع ہوئی۔ پہلے اس کتاب کا نام غلامی تھا اور بالا قساط ایک فرانسیسی رسالے میں چھپتی رہی تھی۔ پہلا ایڈیشن ۶۹۰ نسخوں پر مشتمل تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں افروڈائٹ لکھی گئی ہے اس وقت مصنف شباب کی بہار آفریں منزلوں سے گزر رہا تھا۔ ذکاوت اور جودت اپنے نقطہ عروج پر تھی۔ اس عہد کے مشہور انشاء پردازوں کے فیضِ صحبت سے اس کا اندازِ تحریر پختہ ہو چکا تھا۔ باوجود اس کے اس کی قدردانی صرف افروڈائٹ کی اشاعت سے شروع ہوتی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی گویا لوئی زندہ جاوید ہو گیا۔

اس عہد کا ایک مشہور نقاد لکھتا ہے:

"اس کتاب کی فن کاری بے مثال ہے، زبان بے عیب اور اندازِ تحریر پختہ

کارانہ۔ اس کتاب کے ایک ایک لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مصنف نے لاطینی اور یونانی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے باوجود تصنع اور تکلف اسے چھو کر بھی نہیں گیا۔ یہ کتاب دراصل ایک حقیقت کا مظہر ہے' ایک تمثیل ہے اور اربابِ نظر سے اس کی تشکیلیت کا راز پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ کتاب فرانسیسی روایات کے عین مطابق ہے۔"

اس تنقید کی اشاعت کے بعد افروڈائٹ کے لاکھوں نسخے ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ لوئی کی مقبولیت عالمگیر ہو گئی' لوئی نے اور کتابیں بھی لکھی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تخلیقی قوت سرد پڑ گئی ہے۔ یہ بات خود مصنف نے بھی محسوس کی' چنانچہ ایک دو کتابوں کی اشاعت کے بعد اس نے لکھنا بالکل ترک کر دیا۔

صرف یہی ایک بات اس کے ذوقِ نظر اور اصابتِ رائے کی قاطع دلیل ہے۔

وہ خود اپنی کتاب افروڈائٹ میں فراسیلاس کی زبانی کہتا ہے ؛

"ہم میں سے ہر ایک کو اپنی زندگی میں صرف ایک بات کہنی ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے اپنے کلام کو طول دینے کے معاملے میں ضد کی ہے انہوں نے گویا ضرورت سے زیادہ بلند معیار اپنے سامنے رکھا ہے۔ مجھے ان لوگوں کی ناکامیابی سے زیادہ کروڑوں انسانوں کی خاموشی پر افسوس ہے جنہوں نے کوئی بات کہی ہی نہیں۔"

مندرجہ بالا فقروں میں جس عیبِ تحریر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اسے علی گڑھ کی اصطلاح میں "جھانپلزم" کہتے ہیں یعنی یوں کہ ملٹن نے "جنتِ گمشدہ" لکھی۔ خوب! لیکن "جنت بازیافتہ" لکھ کر اس نے "جھانپلزم" کے جرم کا ارتکاب کیا۔ آج کل کے اکثر انشاء پرداز اور مصنف اس جرم کے اکثر مرتکب ہوتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ افروڈائٹ کے سلسلے میں لوئی نے یونانی اور لاطینی ادبیات کی خوش چینی کی ہے' ہیلس' لیڈا اور ڈائینا کی صنمیاتی روایات کا ذکر بار بار آتا ہے۔

پھر بیقس اور اس کے آئینے کی کہانی دراصل اتھی نوس سے ماخوذ ہے (بوہن ۶۶۴۳) دیمیطر لیس کے خواب کا ماخذ پلوٹارک ہے۔ (دیمیطر لیس ۲۷)

ان معمولی ماخذوں سے کام لے کر لوئی نے پرانے سکندریہ کی تصویر کھینچی ہے' تصویر کیا کھینچی ہے کہ اس نے اس زمانے کی شہوانی اور نسوانی زندگی کا ایسا عکس اتارا ہے کہ ہم محسوس کرتے ہیں گویا خود ان تمام واقعات میں شریک ہیں' جو اس تیزی

سے واقع ہو رہے ہیں۔ بعض لوگ شاید اس کتاب کو پڑھ کر جھنجھلائیں گے! لیکن ان کی جھنجھلاہٹ سے ہمیں کوئی بحث نہیں ہے۔ آج کل تعلیمی وسائل کی کثرت اور علوم و فنون کے ارتقاء کے باعث وہ تمام رموزِ حیات منکشف ہو چکے ہیں جن پر کبھی شرم و حیا کا پردہ پڑا تھا۔ ELLIE کی کتاب "نفسیاتِ جنسی" کے مطالعے کے بعد افروڈائٹ کا مطالعہ شاید بار خاطر ہو جائے' ان حالات میں کتاب کی صنعت کاری کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اس کی بے باکی پر جھنجھلانا گویا علوم و فنون کے انکشافات کو باطل تصور کرنے کے برابر ہوگا۔ ہمیں لوئی کی حسن کاری اور ذوقِ نظر کی داد دینی پڑے گی۔ اس بات کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کی عکاسی تمثیلی ہے۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ لذتِ جسمانی کی پرستش صرف شباب کا مذہب ہے اور جس نظامِ حیات میں (قدیم سکندریہ کے نظام کی طرح) تمام ذہنی طاقتوں کا محرک صرف حصولِ لذت ہو وہ نظام کبھی پائیدار نہیں ہو سکتا۔

اس کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ لوئی نے ہمیں زندگی کی مسرتوں سے دو چار کرنے کی صناعانہ کوشش کی ہے۔ اس نے ایک رومانوی دنیا تخلیق کی ہے جس میں داخل ہو کر ہم کچھ عرصے کے لئے اپنی بے کیف زندگی کی اکتا دینے والی ساعتوں کو بھول جاتے ہیں۔ وہ از سرِ نو ہمیں صرف انسان بنا کر فطرت اور اس کے مناظر سے لذت یاب ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

شبزاد نغمے' بہاریں' تنہائیاں' چاندنی' تاروں بھری راتوں کی رسیلی کہانیاں' سمندر کے ہلکورے' یہ وہ چیزیں ہیں جو اس کے تصور کے چوکھٹے کا کام دیتی ہیں۔ اور اس چوکھٹے میں وہ اپنی کہانی اس طرح جڑتا ہے کہ زندگی کے رموز منکشف ہو جاتے ہیں۔

ہمیں آج کل اقتصادیت' فکرِ سود و زیاں اور مشینیت سے بیزار کرنے کے لئے اور زندگی کے شباب آفرین پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ایسے ہی مصنف کے سحر کار قلم کی ضرورت ہے۔

عابد علی عابد

حصہ اول

پہلا باب

زرینہ

حسن کی انتہا نہیں جلوۂ دلربائے ناز
حسن میں اک چیز ہے اور بھی ماورائے ناز
ساغرِ حسنِ یار میں بادہ و زہر جمع ہیں!
زہر جگر گداز قہر بادۂ جانفزائے ناز!

سینے کے بل لیٹ کر کہنیاں بڑھائے' رانیں کشادہ کئے' رخسار پر ہاتھ رکھے وہ ایک لمبے سنہری پن سے کتانِ سبز کے تکیے پر چھوٹے چھوٹے سوراخوں کی حاشیہ کاری کر رہی تھی۔ دوپہر کے دو گھنٹے بعد جب وہ جاگی ہے' تو کثرتِ خواب کی وجہ سے جسم میں ایک گرانی سی محسوس کرتی تھی' اور اس لمحے سے لے کر اس وقت تک وہ تنہا اپنے بے ترتیب بستر پر لیٹی رہی تھی' اس طرح کہ اس کے جسم کا ایک حصہ لہراتے ہوئے لمبے بالوں سے ڈھنپا تھا۔

اس کے بال گھنے' تابانِ سمور کی طرح نرم' پرِ پرواز سے طویل تر' ملائم اور بے حصر ۔۔۔۔۔۔ اور ان میں گرمیٔ حیات لرز رہی تھی۔

اس کی پشت کا نصف سے زیادہ حصہ' ان بالوں سے ڈھنپا تھا۔ یہی بال پھیلتے ہوئے اس کے عریاں بدن کے نیچے ہوتے ہوئے' زانوؤں کے پاس جمع ہو گئے تھے' گھنے' گھنگریالے' چمکدار' اس پشمینہ گراں ارز کو دیکھ کر' ان بالوں کی وجہ سے جن میں

گندم کی سرخی اور چمکدار دھات کی تابانی موجود تھی' اور جو اس وقت اس کم عمر نازنین کو اپنی آغوش میں لئے تھے' سکندریہ کی کسبیاں اُسے زرینہ کہہ کر بلاتی تھیں۔

یہ بال نہ تو شام کے محبوبانِ سلطانی کے ملائم بالوں کی طرح تھے' نہ ایشیائی نازنینوں کے خضاب آلودہ بالوں کی طرح' ان میں مہ پیکرانِ مصر کے بھورے اور سیاہ بالوں کی شان بھی نہ تھی' یہ بال آریائی اقوام سے خاص ہیں۔۔۔۔۔۔ جلیلویوں کے بالوں کی طرح جو ریگ زار کے اُس پار رہتے ہیں۔

زرینہ۔۔۔۔۔۔ اُسے خود اس نام سے محبت تھی۔ جو نوجوان اس کی بارگاہِ جمال میں حاضر ہوتے تھے' اور ہر صبح پھولوں کے ہار اور اشعار اس کے آستانے پر رکھ جاتے تھے' وہ اپنے الفاظ میں اسے زہرہ (۱) (حسن و جمال کی دیوی) زائیدہ کفِ دریا سے تشبیہہ دیتے تھے۔ اسے زہرہ پر اعتبار نہیں تھا لیکن اُسے یہ بات پسند تھی کہ لوگ اُسے زہرہ سے تشبیہہ دیں اور کبھی کبھار وہ خود بھی ہیکلِ زہرہ میں جاتی تھی اور ایک مخلص سہیلی کی طرح اس کے آستاں پر عطر دان اور نقاب بھینٹ چڑھاتی تھی۔

وہ جھیل ناصرت ایسی سرزمین میں پیدا ہوئی تھی جہاں دھوپ کا لطف بھی تھا اور سایوں کی دلکشی بھی' جہاں چپے چپے پر گلبن اور گیراس تھے۔

اکثر رات کے وقت اس کی ماں مسافروں اور شاہراہِ یروشلم کے سوداگروں کا انتظار کیا کرتی اور سنسان کھیتوں کی لمبی گھاس میں اپنے آپ کو اُن کے حوالے کر دیتی۔ اس کے ہم وطن اس پر جان چھڑکتے تھے' راہب اس کے گھر کے در و بام سے احتراز نہ کرتے تھے کہ وہ مخیّر اور رسومِ مذہبی کی پابند تھی۔ اس نے قربانی کے بکروں کی قیمت ادا کرنے سے کبھی انکار نہ کیا تھا۔ فرشتگانِ قضا و قدر ربِ جلیل کی نعمتیں اس کے گھرانے پر نچھاور کرتے تھے۔

جب اُسے حمل ٹھہر گیا تو چاروں طرف سے بڑی لے دے ہوئی کیونکہ اُس کا شوہر نہ تھا۔ ایک کاہن نے جو اپنی پیشین گوئیوں کے لئے مشہور تھا' کھلے الفاظ میں کہا "اس عورت کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہو گی اور ایک دن ایسا آئے گا کہ ایک بہت بڑی قوم کا ایمان اور اس کی دولت اس لڑکی کے گلے کی زینت ہو گی۔"

غریب ماں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسا کیونکر ہو گا' لیکن اس نے لڑکی کا نام سارہ رکھا۔ عبرانیوں کی زبان میں اس کے معنی "شہزادی" ہیں۔

زرینہ کو ان تمام واقعات کا کوئی علم نہ تھا کیونکہ کاہن نے اس کی ماں کو تنبیہہ کر دی تھی کہ جو لوگ کسی پیشین گوئی کا موضوع ہوتے ہیں ان کو پیشین گوئی کی تفصیلات سے مطلع کرنا خطرناک ہوتا ہے۔ اسے اپنے مستقبل کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے خیالات اکثر اسی محور کے گرد پھرتے تھے۔ اسے بچپن کے حالات بھی کم یاد تھے اور اسے ناپسند تھا کہ کوئی اس زمانے کی باتیں کرے۔

اس کے حافظے میں جس واقعہ کی یاد خوب روشن تھی وہ یہ تھا کہ جب اس کی ماں آوارہ گردی کے لئے نکلا کرتی تو روز "بہ خیالِ احتیاط" اسے ایک حجرے میں مقفل کر جاتی۔ قید کی ان نہ گزرنے والی گھڑیوں میں اس کے خوف و خستگی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ اسے وہ دائرہ نما کھڑکی بھی خوب یاد تھی جہاں سے اسے جھیل کی سطحِ آب، کھیتوں کا دُود آسا نیلا نیلا رنگ، اور اپنے وطن کا شفاف آسمان نظر آتا تھا جو نرم اور سبک رَو ہواؤں کو محیط تھا۔ گھر کے دائیں بائیں طرفا اور کتانِ سرخ شگفتہ تھے۔

ان نتھرے ہوئے پانی کی نہروں میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں نہایا کرتی تھیں، جن کے کنارے شگفتہ گیر اس کی جھاڑیوں میں پھول ہی پھول تھے اور کمرِ کوہ پر بڑے بڑے سوسن کے پھول شگفتہ تھے۔

جب وہ بارہ سال کی ہوئی تو نوجوان شہسواروں کے ایک گروہ کے ساتھ بھاگ گئی جو اسے گاؤں کے کنوئیں کے پاس ملے تھے، وہ ہاتھی دانت فروخت کرنے کے لئے ٹائیر (۲) کی طرف جا رہے تھے اور ذرا کنوئیں کے پاس ٹھہر گئے تھے کہ اپنے گھوڑوں کی دموں میں گوناگوں پھولوں کے طرے لگائیں۔ اسے خوب یاد تھا کہ جب وہ اسے پشتِ اسپ پر بٹھا کر لے اڑے تو شدتِ جذبات سے اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا اور اسے خوب یاد تھا کہ اسی شب وہ پھر ٹھہرے تھے۔ وہ رات ایسی تابناک اور صاف تھی کہ ستارے نظر ہی نہ آتے تھے۔ اسے یہ بات بھی نہ بھولی تھی کہ جب وہ ٹائیر میں داخل ہوئے تو وہ سب سے آگے ایک کوتل گھوڑے کے کجاوے میں بیٹھی تھی اور گھوڑے کی ایال کو بھینچ کر پکڑ رکھا تھا۔ غرور کی ایک ادائے خاص سے وہ اپنی پنڈلیاں ہلاتی چلی جا رہی تھی تاکہ شہر کی عورتیں وہ خون بھی دیکھ سکیں جو اس کی نوکِ پا تک بہہ آیا تھا۔ اسی رات وہ مصر کی طرف روانہ ہو گئے اور وہ انہی ہاتھی دانت کے سوداگروں کے ساتھ بازارِ مصر جا پہنچی تھی۔ دو ماہ بعد وہ سوداگر اسے ایک مکان میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس مکان میں

مہتابی تھی، ایک سلکِ ستون، ایک روئیں آئینہ، غالیچے نئے تکئے، اور ہندو کنیز جسے کسبیوں کے بال بنانے میں کمال حاصل تھا۔

جس رات سوداگر گئے ہیں اسی رات اور تماشبین آئے اور دوسری رات اور، اور، اور۔۔۔۔۔

اس کا مکان شہر کے مشرقی حصے کے کنارے واقع تھا اور وہ بھی ایسے محلے میں جسے براشین کے یونانی نوجوان بہ نظرِ حقارت دیکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ دیر تک اس کے گاہک اس قسم کے لوگ رہے جن سے اس کی ماں آشنا تھی یعنی سوداگر اور مسافر! کسی دوسرے طبقے کے آدمی سے اسے واسطہ ہی نہ پڑا۔

وہ ان تماشبینوں، ان مختصر لمحاتِ محبت کے خریداروں سے بیگانہ سی رہی۔ وہ ان کی محبت سے لذت اندوز ہونے کے گر جانتی تھی اور ان کے دامِ عشق میں گرفتار ہونے سے پہلے ان کو دھتا بتا دیتی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے بعض تماشبین مستقلاً اس کے دامِ گیسو میں اسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ قافلہ سالاروں نے اپنی چیزوں کو اونے پونے بیچ ڈالا ہے تاکہ اس کی لذتِ التفات خرید سکیں اور چند راتوں کے بعد پھر قلاش ہو جائیں۔ اس دولت سے اس نے جواہرات، بسترِ عشرت کے تکئے، نادر خوشبوئیں، منقش عبائیں، اور چار کنیزیں خریدیں۔

اسے بہت سی زبانیں آتی تھیں، ہر ملک کے افسانے اسے ازبر تھے، اسیریا والوں نے اسے ڈانزی اور اشتر کے افسانے سنائے تھے، فونیشیا والوں نے استوریت (۳) اور اڈونس (۴) کے۔ جزیرے کی یونانی لڑکیوں نے ایفس (۵) کی حکایت سناتے ہوئے اسے پیار کرنے کے وہ عجیب طریقے سکھائے تھے جن کو سیکھ کر پہلے پہل تو زرینہ حیران ہوئی تھی لیکن بعد میں ان کے بغیر ایک لمحہ کے لئے رہ بھی نہ سکتی تھی۔

وہ اطلانتا کی داستان ہائے محبت سے بھی واقف تھی اور خوب سمجھتی تھی کہ اس کی طرح نازک اندام بنسی بجانے والیاں قوی سے قوی نوجوان کی جوانی کا رس نچوڑ کر اسے ایک مشتِ استخوان بنا سکتی ہیں۔

اور سات سال کے عرصے میں اس کی ہندو کنیز نے بڑے صبر و تحمل سے اسے پالی بوتھرا کی کسبیوں کے فنِ محبت کی تمام پیچ دار اور لذت انگیز تفصیلات سے مطلع کر دیا تھا۔ محبت بھی نغمہ گری کی طرح ایک فنِ لطیف ہے۔ کیفِ نغمہ کی طرح لذتِ

محبت سے بھی نفیس و لطیف ‘شدید و قوی ‘اعصاب کو جھنجھنا دینے اور رگوں کو مرتعش کر دینے والی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ زرینہ ‘جو اس فن کے تمام ترنمات اور تمام نزاکتوں سے باخبر تھی ‘اپنے آپ کو جائز طور پر ہیکلِ زہرہ کے مغنی پلنگو سے زیادہ باکمال سمجھتی تھی۔

سات سال اسی طرح گزر گئے اور اسے کبھی خیال نہ آیا کہ زندگی اس سے زیادہ مسرور یا متنوع ہو سکتی ہے لیکن بیسویں سال میں قدم رکھنے سے پہلے ‘جب وہ لڑکی سے عورت بنی ‘اور اس نے اپنی چھاتیوں کے نیچے اس جمیل شکن کو دیکھا جو آغازِ بلوغت کا نشان ہے تو ناگاہ اس کے دماغ میں بلند نظری پیدا ہو گئی۔

اور اب دوپہر کے دو گھنٹے بعد جب وہ سو کر اٹھی اور کثرتِ خواب سے اس نے اپنے جسم میں ایک گرانی سی محسوس کی تو سینے کے بل لیٹ کر کہنیاں بڑھائے ‘ رانیں کشادہ کئے ‘رخسار ہاتھ پر رکھے ‘وہ ایک لمبے سنہری پن سے کتانِ سبز کے ایک تکیے پر چھوٹے چھوٹے سوراخوں کی حاشیہ کاری کرنے لگی۔

وہ فکر میں غرق تھی۔

پہلے اس نے چار چھوٹے چھوٹے نقطوں سے مربع بنایا اور مرکز میں ایک نقطہ لگایا‘ پھر ایک دائرہ بنانے کی کوشش کی ‘لیکن یہ کام مشکل نظر آیا‘ چنانچہ اس نے بے پروایانہ تکیے میں جہاں جی چاہا پن چبھونی شروع کی اور پھر بلند آواز سے کہا :

”جلوہ۔۔۔ جلوہ“

جلوہ اس کی ہندو کنیز کا نام تھا۔ دراصل تو اس کا نام جلتند چندرایالا تھا‘ یعنی ”جلوہ مہتاب کی طرح پانی پر رقصاں“ لیکن زرینہ مختصراً اسے جلوہ کہہ کر پکارا کرتی تھی۔

کنیز آگے بڑھی ‘لیکن آستان کے پاس کھڑی رہی۔

”جلوہ ! کل یہاں کون آیا تھا ؟“

”آپ کو خبر نہیں کیا ؟“

”نہیں ‘میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں ‘کیا کچھ صورت شکل کا اچھا تھا‘ میں تو سمجھتی ہوں کہ میں سارا وقت سوئی ہی رہی ‘ تھک گئی تھی میں ! مجھے کچھ یاد بھی تو نہیں ‘کس وقت واپس گیا تھا بھلا وہ ؟ کیا صبح ہی صبح ؟“

"پو پھٹنے کے وقت۔"

"کیا کچھ دے گیا ہے؟ اچھی رقم؟۔۔۔۔۔۔ خیر! مجھے نہ بتاؤ' کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔۔ ہاں کیا کہتا تھا۔۔۔۔۔۔ اس کے جانے کے بعد کیا کوئی اور نہیں آیا؟۔۔۔۔۔۔ کیا وہ پھر واپس آنے کو کہتا تھا؟ میرے کنگن لاؤ!"

کنیز ایک صندوقچہ لے کر حاضر ہوئی لیکن زرینہ نے مشکل سے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا ہوگا۔ اپنی بانہیں سر سے بلند کیں اور کہا:

"جلوہ! جلوہ' میں چاہتی ہوں کہ کچھ ہو! عجیب' عجیب سی باتیں' نئے نئے واقعات' کیا کیا کچھ!"

جلوہ نے کہا "ہر بات نئی ہے' ہر بات عجیب ہے' ہر بات یا پھر کوئی بات بھی نہیں؛ تمام دن ایک ہی جیسے ہیں۔"

زرینہ نے کہا "نہیں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ تمام دن ایک ہی جیسے نہ ہوتے تھے' تمام دنیا میں' ہر ملک میں دیوتا زمین پر اترتے تھے اور فانی عورتوں سے محبت کرتے تھے' آہ! کون سے بستروں پر ان کے آنے کا انتظار کیا جائے؟ وہ ہمیں کس جگہ ملیں گے جو آدمیوں سے کچھ بلند تھے' کیا دعائیں مانگوں تاکہ ان کا دیدار نصیب ہو' جو مجھے کچھ سکھا سکتے ہیں' اگر دیوتا نیچے نہیں اترتے' اگر وہ مر چکے ہیں' یا بوڑھے پھونس ہو چکے ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے وہ محبت نصیب نہ ہوگی جو زندگی کے ساز سے درد بھرے گیت نکال سکے؟"

اس نے کنیز کی طرف سے منہ پھیر لیا اور اپنی انگلیاں مروڑنے لگی' پھر کہا "مجھے تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ اگر کوئی مجھے دیوی کی طرح پوجتا تو مجھے اس کے ستانے میں لطف آتا' چاہے وہ گھل گھل کر مر ہی کیوں نہ جاتا۔ لیکن یہ جو میرے پاس آتے ہیں' یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کو رلایا جائے اور سچ پوچھو تو قصور بھی میرا ہی ہے' میں انہیں خود بلاتی ہوں۔۔۔۔۔۔ تو مجھ سے محبت کس طرح کریں۔"

"آج کون سا کنگن پہنئے گا؟"

"تمام۔۔۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔۔۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں' جاؤ' دروازے پر کھڑی ہو جاؤ اور اگر کوئی آئے تو اسے کہہ دو کہ میں ایک سیاہ فام حبشی کی بغل گرم کر رہی ہوں جو مجھ سے روپیہ سے اینٹھتا ہے۔"

"جاؤ۔"

"باہر نہیں جائیں گی آپ؟"

"ہاں۔ لیکن تنہا' کپڑے بھی تنہا پہنوں گی' اور جا کے واپس نہ آؤں گی۔ جاؤ۔۔۔ جاؤ۔"

زرینہ نے ایک پاؤں غالیچے پر رکھا اور تن کر کھڑی ہو گئی' جلوہ چپ چاپ باہر جا چکی تھی۔

زرینہ اپنے حجلے میں آہستہ آہستہ اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر' پھرتی رہی۔ ہاتھ گردن کے پیچھے' کمرے کی ٹھنڈی سلوں پر' جو پسینے کو خشک کر دیتی ہیں' ننگے پاؤں رکھنے میں جو لذت ہے' اس میں محو تھی۔ پھر وہ حمام میں داخل ہوئی۔

پردۂ آب میں سے اپنے جسم کو دیکھنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اس وقت اسے اپنا جسم پتھر پر پڑی ہوئی کھلی سیپی کی طرح معلوم ہوتا تھا' اس کی جلد بے عیب اور رنگ میں آہنگ ہو جاتی تھی' اس کی رانوں کے خطوط لمبے ہوتے' ایک نورِ نیلامی میں تحلیل ہو جاتے تھے۔ اس کا تمام جسم سیال ہو جاتا تھا اور اس کے ہاتھ پہچانے نہ جاتے تھے' اس کا جسم اتنا سبک ہو جاتا تھا کہ وہ دو انگلیوں کے بل اپنے آپ کو سنبھال کر قائم رکھ سکتی تھی' تیر سکتی تھی اور پھر سنگِ مرمر کے فرش پر بیٹھتے وقت پانی میں نرم و نازک بلبلے پیدا ہوتے تھے جو اس کی ٹھوڑی سے چھو جاتے تھے۔

پانی ایک حرکتِ بے صدا کے ساتھ اس کے کانوں میں داخل ہوتا تھا اور اس میں ایک بوسے کی نازک تحریکِ لذت شامل تھی۔ اس کے بدن کا ہر حصہ عشق انگیز تعریف کا سزاوار اور پیار کا عذرِ مجسم بن جاتا تھا۔ یہی وہ ساعت تھی جب زرینہ اپنی پرستش کرتی تھی۔

دن ڈھل رہا تھا۔ وہ کھڑی ہوئی' پانی کے ٹب سے باہر نکلی اور دروازے کی طرف چلی' اس کے پاؤں کے نشان سنگِ مرمر پر چمکنے لگے۔ لڑکھڑا کر' گویا تھک گئی ہے' اس نے دروازہ کھولا اور چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ ہاتھ بڑھا ہوا چٹخنی پر تھا' پھر اندر گئی اور اپنے بستر کے پاس جا کر بھیگی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ کنیز سے کہا۔ "میرا بدن پونچھو۔"

مالابار کی کنیز نے اسفنج کا ایک ٹکڑا لیا اور بھیگے' بھاری سنہری بالوں میں پھیرا'

بال خشک کیئے، لٹیں اٹھا کر، نرمی سے جھٹکیں، پھر اس نے اسفنج روغن کے برتن میں ڈال کر تر کیا اور پاؤں سے لے کر گردن تک، ہر حصہ جسم پر پھیرا، پھر ایک سرخ کپڑے کا ٹکڑا لے کر زور زور سے ملا ڈالا، جس سے ملائم جلد آگ بھبھوکا ہو گئی۔

زرینہ کانپتی ہوئی سنگ مرمر کی ایک نشست گاہ پر بیٹھ گئی اور ہولے سے کہا۔ "بال بناؤ۔"

کم ہوتی روشنی کی متوازی شعاعوں میں، بال جو ابھی تک بھاری اور گیلے تھے، دھوپ میں بارش کی طرح چمکنے لگے۔ کنیز نے مٹھیاں بھر بھر کر لچھے اٹھائے اور انہیں گوندھا اور ایک پیچ دار شکل دے دی جس میں جگہ جگہ، تیر کی طرح سیدھی پنیں لگی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا سانپ نے بل کھائے ہیں اور جسم پر تیر ہی تیر کھبے ہیں۔ اس گندھی چوٹی میں تین بل سبز موباف کے دیئے گئے اور اس کی آب و تاب میں ریشمی گیسوبند کی درخشانی اضافہ کر رہی تھی۔

زرینہ ایک ہاتھ بڑھائے، ذرا دور رکھ کر چمکتے ہوئے تانبے کا آئینہ دیکھ رہی تھی، جس میں اسے کنیز کے سیاہ ہاتھ گھنے بالوں میں چستی سے حرکت کرتے نظر آتے تھے۔ اُن ہاتھوں نے گھنگھریالے بالوں کو اپنی جگہ پر بٹھایا، آوارہ بالوں کو چن چن کر دوسرے بالوں میں شامل کیا اور اب بالوں کی شکل مٹی کے اس ظرف کی سی ہو گئی جو شاخِ آہو سے ملتا جلتا ہو۔

جب یہ سب کچھ ہو چکا تو کنیز اپنی مالکہ کے سامنے دوزانو ہو گئی اور "جبلِ زہرہ" کی تزئین کی تاکہ اس کے عاشق زرینہ کے بدن میں فنِ مجسمہ سازی کا کمالِ عریانی دیکھ سکیں۔

زرینہ نے متانت سے کہا۔ "غازہ لگاؤ۔"

جزیرہ ڈیاس کورس سے آئی ہوئی ایک چھوٹی سی صندوقچی میں جو شجرِ گل سے بنائی گئی تھی، ہر قسم کا غازہ اور سامان آرائش موجود تھا۔

کنیز نے اونٹ کے بالوں کے برش کو سیاہ غازہ میں ڈبویا، اور مژگانِ خمدار کو اس سے سیاہ تر کیا گیا تاکہ آنکھوں کی نیلگونی دوچند ہو کر نظر آئے، گلِ سیاہ سے آنکھوں کو سرمئی بنایا گیا، جس سے آنکھیں زیادہ غلافی ہو گئیں، شنگرف کے دو نقطوں سے گوشہ ہائے چشم کے سرخ و نازک ترین حصوں کو سرخ تر بنا دیا گیا، غازے کی پائیداری کے

لئے چہرے اور چھاتیوں پر روغن ملا گیا۔ ایک نرم و نازک پر کو سفیدہ میں ڈبویا گیا اور گردن و بازو پر سفید خطوط کھینچے گئے۔

پھر ایک برش کو شبِ خار میں ڈبو کر لبِ لعلیں اور دہانِ شکریں کو سرخ رنگا گیا اور اسی چیز سے نوکِ پستاں پر بھی ہلکی سی رنگ آمیزی کی گئی۔ پھر اس نے اپنی انگلیوں سے گالوں پر پسی ہوئی سرخی ملی' جیسے سبک' لطیف شنجرفی بادل ہوں اور کمر کے نیچے کولہوں کے گوشت میں چاہِ ذقن کی طرح دو گڑھے پیدا ہو گئے جو بدن کی حرکت کے ساتھ ساتھ متحرک ہو جاتے تھے۔ پھر فلس پوست سے کہنیاں رنگی گئیں اور دسوں ناخن سرخ کئے گئے۔

آرائش ختم ہو چکی تھی ؛

آخر زرینہ مسکرائی اور کہا۔ "گا کر سناؤ۔"

وہ سنگ مرمر کی کرسی پر تن کر بیٹھی تھی۔ اس کی پنوں سے طلائی شعاعیں نکل رہی تھیں' اس نے گلے پر ہاتھ رکھ لئے' اس طرح کہ انگلیاں پھیلی ہوئی تھیں' اس کے غازہ آلود سرخ ناخن' شانوں کے درمیان سلک یاقوت معلوم ہوتے تھے' اس نے سفید پاؤں فرشِ سنگی پر' ایک دوسرے سے قریب رکھے تھے۔ جلوہ دیوار سے لگ کر ہندوستان کے نغمہ ہائے عشق گانے لگی۔

اس نے یک آہنگ آواز میں کہا۔ "زرینہ تیرے بال ان شہد کی مکھیوں کی طرح ہیں جو کسی درخت کی شاخوں میں ہجوم کر رہی ہوں' جنوب کی گرم ہوائیں تیرے بالوں کو جنگِ عاشقاں کی شبنم سے تر کر رہی ہیں اور ان میں سے شب زاد پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔"

اور زرینہ نے مدھم سروں اور زیادہ سریلی آواز میں کہا ؛

"میرے بال اس نامحدود دریا کی طرح ہیں جو غروبِ آفتاب کے آتشیں منظر کے وقت کسی میدان میں بہہ رہا ہو۔"

جلوہ : "تیری آنکھیں سوسنِ آبی کی طرح ہیں' جو سطحِ آب پر نیلگوں' بے بُن' اور بے حرکت نظر آتی ہیں۔"

زرینہ : "میری آنکھیں' میری پلکوں کے سائے میں گہری جھیلوں کی طرح ہیں جن پر سیاہ شاخیں جھکی پڑتی ہوں۔"

جلوہ : ''تیرے لب دو نازک پھول ہیں جو آہوئے سرخک کے خون سے رنگین ہیں۔
زرینہ : ''میرے لب زخم کے سوزاں کناروں کی طرح ہیں۔''
جلوہ : ''تیری زبان وہ خنجرِ خون فشاں ہے جس سے تیرا زخمِ دہان عیاں ہے۔''
زرینہ : ''میری زبان جواہرات سے مزین ہے اور میرے لب ہائے لعلیں کے سائے سے رنتار۔''
جلوہ : ''تیرے بازو ہاتھی دانت کی طرح سڈول اور بھرے بھرے ہیں اور تیری بغلیں منہ کی طرح ہیں۔''
زرینہ : ''میرے بازو ساقِ سوسن کی طرح طویل و گاؤدم ہیں اور میری انگلیاں برگ ہائے گل کی طرح آویزاں۔''
جلوہ : ''تیری پنڈلیاں پیلِ سفید کی طرح خرطوم ہیں اور تیرے پاؤں دو گلِ سرخ۔''
زرینہ : ''میرے پاؤں سطحِ آب کے کنول کی طرح ہیں اور میری پنڈلیاں غنچہ سوسن کی طرح۔''
جلوہ : ''تیرے پستان سپرِ سیمیں کی طرح ہیں، جن کے فلس خون سے لبریز ہیں۔''
زرینہ : ''میرے پستان مہتاب کی طرح ہیں اور پانی میں عکسِ مہتاب کی طرح۔''
جلوہ : ''تیری ناف گلگوں ریگزار کا چاہِ عمیق ہے اور تیرا شکم اس بچہ بُز کی طرح ہے جو اپنی ماں کی چھاتیوں سے چمٹا ہو۔''
زرینہ : ''میری ناف ایک جامِ واژگوں ہے جس پر ایک مروارید مدوّر رکھا ہو اور جسم خفی اس ماہِ نو کی طرح ہے جو درختوں کے جھنڈ میں سے نظر آرہا ہو۔''

خاموشی طاری ہو گئی، کنیز نے ہاتھ اٹھا کر سر جھکا لیا۔

زرینہ نے کہا ''وہ ایک گلِ ارغواں ہے جو شہد و خوشبو سے لبریز ہے، وہ ایک مارِ دریائی ہے، زندہ اور نرم، وہ دیارِ موت کی طرف جانے والے انسانوں کے لئے جائے پناہ ہے۔''

کنیز نے جھکے ہوئے نہایت آہستہ سے کہا ''وہ ایک شے ہے مہیب و ہولناک وہ ڈائن میڈوسا (۲) کا چہرہ ہے۔''

زرینہ نے کنیز کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جلوہ۔''

رفتہ رفتہ تاریکی بڑھتی جارہی تھی' رات اپنے آشیانہ فلکی سے اتر آئی تھی لیکن چاند ایسا تابناک تھا کہ جھلے میں ایک نیلگوں نور کا سیلاب جاری تھا' زرینہ نے اپنے عریاں بدن کی طرف دیکھا' جسم کے نقطہ ہائے نور جامد تھے اور سائے تاریک وسیاہ۔

ناگاہ وہ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی "جلوہ ہم کیا سوچ رہے ہیں' رات ہو گئی اور میں ابھی باہر نہیں گئی۔ اب تو ساحل دریا کے چبوترے پر سوئے ہوئے ملاحوں کے سوا اور کوئی نہ ہو گا' جلوہ بتا تو سہی کیا میں خوبصورت ہوں؟ کیا تجھے خبر ہے کہ سکندریہ کی تمام عورتوں میں سب سے زیادہ حسین ہوں؟ کیا یہ سچ نہیں کہ جو شخص میرے گوشہ چشم کے اشارے کے دائرے میں ایک بار گردش کر چکتا ہے وہ پھر کتے کی طرح میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے؟ کیا سچ نہیں؟ میں چاہوں تو اسے غلام رکھ سکتی ہوں؟ جو چاہوں اس سے سلوک کر سکتی ہوں' کیا یہ سچ نہیں کہ جن سے میں ملوں ان کو موہ سکتی ہوں' کہ میرے حکم ماننے کے سوا کچھ اور کر ہی نہ سکیں؟ کپڑے پہناؤ جلوہ۔"

زرینہ کے بازوؤں کے ارد گرد سانپ کی طرح پیچ و تاب کھائے بازوبند تھے' جلوہ نے چپلیاں پہنائیں اور گندم رنگ پنڈلیوں پر چرمی تسمے باندھ دیئے۔ خود زرینہ نے اپنے شکم نرم و گداز کے ارد گرد ایک کمر بند دوشیزگی لپیٹ لیا جو کمر سے بنِ ران تک لٹکتا تھا' کان میں بڑے بڑے چھلے پہنے' انگلیوں کو انگوٹھیوں اور نگینوں سے سجایا اور گلے میں وہ طلائی زنجیریں پہنیں جو پیقس کی دیوداسیوں نے بنائی تھیں۔

کچھ عرصہ وہ عریاں' صرف زیورات میں ملبوس کھڑی اپنے جسم کو دیکھتی رہی' پھر ایک دراز سے تہ کی ہوئی کتانِ زرد کی' صاف و نازک و تابناک شال نکالی' پاؤں تک اپنے آپ کو اس میں لپیٹ لیا۔ اس باریک کتان میں سے اس کے جسم کا جو ذرا سا حصہ نظر آرہا تھا اس پر آڑے ترچھے جھول نظر آتے تھے' دوسرے ہاتھ میں وہ شال کا دامن اٹھائے تھی کہ خاک آلود زمین سے مس نہ ہونے پائے۔ پروں کی ایک نازک سی پنکھیالے کر وہ باہر نکلی۔

آستان کی سیڑھیوں پر کھڑی' دیوار سفید پر سر ٹیکے جلوہ اپنی مالکہ کو محوِ خرام دیکھ رہی تھی' وہ آہستہ آہستہ خالی بازار کے نورِ مہتاب میں نہائے ہوئے مکانوں کے پاس سے گزر رہی تھی اور ایک بے قرار سایہ اس کے عقب میں تڑپ رہا تھا۔

حوالہ جات

(۱) زہرہ، حسن و جمال کی دیوی، اس کا ایک مندر سکندریہ میں تھا، جہاں بڑی دھوم دھام سے اس کی پرستش ہوتی تھی۔

(۲) ٹائیر (Tyre) دنیائے قدیم کا ایک مشہور شہر، تجارتی منڈی۔

(۳) استوریت (Astorath) دیوی زہرہ کا ایک نام۔

(۴) اڈونس (Adonis) دیوی زہرہ کا محبوب، ایک حسین و جمیل نو خیز نوجوان۔

(۵) ایفس (Aphis) روایاتِ قدیم کے مطابق ایک حسین لڑکی۔۔۔ایک نو خیز و حسین و جمیل نوجوان کا بھی یہی نام ہے۔

(۶) میڈوسا، روایاتِ قدیم کے مطابق ایک ڈائن، بالوں کی بجائے اس کے سر پر زہرناک سانپ تھے۔اس کا ایک چہرہ دیکھنے سے آدمی پتھر کا ہو جاتا تھا۔

دوسرلباب

ساحلِ دریا

کسی کو گرمیٔ تقریر سے اپنی لگا رکھا
کسی کو منہ چھپا کے نرمیٔ آواز سے مارا
غزل سنتے ہی میری یہ مغنی کی ہوئی حالت
کہ اس نے ساز مارا سر سے اور سر ساز سے مارا

سکندریہ کی ساحلی مہتابی پر ایک لڑکی کھڑی گا رہی تھی اس کے پاس سنگِ سفید پر بیٹھی ناز نینیں بنسی بجا رہی تھیں۔ گیت کے الفاظ یہ تھے۔

''دیووں سے پیچھا چھڑانے کے لئے' مرغزار کی سبک رفتار پریاں جنگل میں جا چھپی ہیں' کوہسار کی پریوں کے پیچھے بھی دیو لگے ہوئے تھے' ان کی سیاہ آنکھیں خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں' وہ اڑی جا رہی تھیں کہ دیووں نے ان کے پروں کی طرح نرم بال اور اچھوتی چھاتیاں پکڑ کر گرا لیا' اب وہ شبنم آلود سبزے پر لیٹی ہانپ رہی ہیں اور ان کے خوبصورت جسم' نصف انسانی و نصف قدسی' شدتِ اضطراب سے لرزاں ہیں۔۔۔۔۔۔ اے عورت یہ کام دیو (۱) ہی ہے جو تیرے منہ سے وفورِ لذت کی شیریں اور اضطراب انگیز (لیکن ہلکی ہلکی) چیخیں نکلوا دیتا ہے۔''

بنسی بجانے والیوں نے بھی کہا: ''کام دیو۔۔۔ کام دیو۔۔۔ اور بنسیوں سے درد ناک سریں نکلنے لگیں۔

گیت پھر شروع ہوا؛

"ذرا دیکھنا ام خدایاں (۲)' دیویوں میں سب سے بڑی دیوی' کھلے میدان میں عطیس کے پیچھے بھاگ رہی ہے جو اپالو کی طرح حسین و جمیل ہے' کام دیو نے اس کے دل میں عطیس کی محبت کا تیر ترازو کر دیا ہے' ہاں' لیکن عطیس کے دل میں اس کی محبت نہیں ہے' ظالم دیوتا! شریر کام دیو!! تیری محبت کا راز محبت نہیں' نفرت ہے' دیکھو میدانوں میں اور مرغزاروں میں کھلے اور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں سے گزرتا ہوا عطیس بھاگا جا رہا ہے اور اس کی رگوں میں دیوی نے موت کا خنک سانس پھونک دیا ہے کیونکہ اسے عطیس سے محبت تھی اور عطیس کو اس سے نفرت۔

"ہائے یہ شیریں و اضطراب انگیز آرزو۔"

کام دیو۔۔۔ کام دیو۔۔۔ بنسیوں میں سے دردناک سُریں نکلنے لگیں۔

گیت جاری تھا۔

"ساحلِ دریا پر بکرے کے سموں والا دیوتا (۳) پری سرنکز کے پیچھے بھاگ رہا ہے' زرد رُو کام دیو نے جسے آنسوؤں سے ذوق ہے' پرواز ہی میں گال سے گال بھڑا کر سرنکز کا منہ چوم لیا ہے اور ڈوبتی ہوئی کنواری کے جسم کا نازک و بے حقیقت سایہ خس دریائی کی شکل میں کانپ رہا ہے۔

لیکن کام دیو کائنات کا اور دیوتاؤں کا آقا ہے' بلکہ موت کا بھی۔

سرنکز کے مرقدِ دریائی پر جو خار و خس تھے ان کو جمع کر کے اس نے بنسی بنائی ۔۔۔ "اے عورت' اس بنسی میں ایک مردہ روح کی اضطراب انگیز و شیریں آرزو کی گونج لرز رہی ہے۔"

جب بنسری بجانے والیاں گیت کی آخری استھائی بجا چکیں تو گانے والی نے ہاتھ پھیلا کر مانگنا شروع کیا اور راہ گیروں سے سکے وصول کر کے اپنی چپلی میں چھپا لئے۔ آہستہ آہستہ ہجوم عام آنکھوں میں اشتیاق کی سبک سی رو لئے گزر رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سے اور گفتگو سے جو آواز پیدا ہوتی تھی وہ شورِ دریا سے بھی زیادہ تھی۔ ملاح درختوں کی چھال لئے آ رہے تھے اور بوجھ سے دہرے ہوئے جاتے تھے' پھل بیچنے والے بھری ٹوکریاں لئے ادھر سے ادھر پھر رہے تھے۔ بھک منگے کانپتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر بھیک مانگ رہے تھے۔ گدھے بیچارے لدے پھندے چرمی بوتلوں کے بوجھ تلے دبے'

مار کھاتے چلے جا رہے تھے۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا اور تماشائی اتنے تھے کہ پھیری والے گانے والے اور دوسرے پیشے والے مل کر اتنے نہ ہوں گے۔ چوک میں مزدوروں کے جھنڈ کے جھنڈ کھڑے تھے' عورتیں ان میں سے اس طرح گزر رہی تھیں جس طرح تانے میں بانا' نوجوان فلسفیوں کو گھور رہے تھے اور فلسفی کسبیوں کو۔

کسبیاں ہر طرح کی تھیں۔ کچھ تو خوب مشہور و معروف' مانی ہوئی کسبیاں تھیں' جن کا لباس نازک ریشم کا تھا' پاؤں میں سونے سے مڑھے ہوئے چمڑے کی جوتے تھے' پھر کچھ غریب تھیں جو ننگے پاؤں پھر رہی تھیں' غریب کچھ ان سے کم خوبصورت نہ تھیں' بس صرف اتنی سی بات تھی کہ بدنصیب تھیں اور تماشینوں میں جو دانا تھے وہ انہی کی طرف زیادہ دیکھتے تھے جن کی فطرتی سادگی کمر بندوں اور مرصع زیورات کے تصنع سے بری تھی۔

ہیکل زہرہ کا میلہ (۴) قریب تھا۔ عورتوں کو اجازت تھی کہ جگ بھاتا لباس پہن لیں' اسی لئے بعض کسبیوں نے لباسِ عریانی کو ترجیح دی تھی اور یہ بھی نہیں تھا کہ کوئی ان کی عریانی کو دیکھ کر دھک سے رہ گیا ہو۔ اگر ان کے جسم میں کسی قسم کا عیب ہوتا تو وہ غروبِ آفتاب کے وقت عریاں ہو کر گھر گھر ہستیوں کے مذاق کا نشانہ بننے کے لئے تیار نہ ہوتیں۔

"طرفہ ـــ طرفہ ـــ اے طرفہ"

ایک البیلی چھبیلی کسبی' بھیڑ کو چیر کر' اپنی سہیلی طرفہ کی طرف دوڑی آ رہی تھی۔

"کیوں طرفہ تمہیں بھی بلایا گیا ہے کیا؟"

"کہاں' سیسو۔"

"سیقس کے ہاں"

"ابھی تک تو نہیں! کیا کوئی دعوت دے رہی ہے؟"

"کوئی دعوت سی دعوت! اس دھوم کا جلسہ ہو گا جانی کہ واہ وا! دعوت کے دوسرے دن وہ اپنی سب سے قبول صورت کنیز افروڈیزیا (ناہید) کو آزاد کر دے گی۔"

"اچھا یہ بات ہے۔ تو آخر اسے پتہ لگ ہی گیا کہ لوگ باگ اس کے گھر ناہید

کے لئے آتے ہیں۔"

"نہیں میں سمجھتی ہوں یہ بات تو اسے معلوم نہیں' بظاہر تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بوڑھا شیرس' جس کا جہازوں کا کارخانہ ہے ناہید کو بڑی قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہے' ایک ہزار درہم دیتا تھا' بیقس نے لینے سے انکار کر دیا' پھر اس نے دو ہزار تک قیمت لگادی' بیقس راضی نہ ہوئی۔"

"ہیں! سچ مچ' سر پھر گیا ہے کم بخت کا۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے' لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ گھر میں آزاد کنیز بھی ہونی چاہئے' اور سچ تو یہ ہے کہ سودا جو چکا رہی ہے تو اچھا کر رہی ہے۔ شیرس پینتیس سو درہم بھی دے مرے گا اور اسی قیمت پر کنیز کو آزاد کیا جا سکتا ہے۔"

"پینتیس سو درہم؟ پینتیس سو درہم' ایک حبشن کنیز کے لئے۔"

"اس کا باپ تو گوری نسل سے تھا۔"

"لیکن ماں جو حبشن تھی موئی۔"

"بیقس کہتی تھی اس سے ایک درہم کم نہ ہو گا اور بے چارے شیرس کو اتنی محبت تھی ناہید سے کہ ماننے ہی بن پڑی۔"

"اسے تو ضرور بلایا ہو گا؟"

"نہیں' اس دعوت میں ناہید بھی مہمانوں کے آگے رکھی جائے گی' پھلوں کے بعد اس کی باری آئے گی' اور مہمان اسی ترنوالے سے منہ میٹھا کریں گے' جس طرح کسی کا جی چاہے گا' چکھوتیاں چکھے گا اور اس کے بعد شیرس کے حوالے کر دی جائے گی۔"

"میرا خیال ہے شیرس کو اس دن ایسا معلوم ہو گا کہ پیاری ناہید کی طبیعت ذرا سست ہے۔"

"تم خواہ مخواہ اس کے لئے دل بھاری نہ کرو' شیرس کے پاس رہ کر اسے تھکنے کا موقع ذرا کم ملے گا' میں شیرس کو جانتی ہوں سیسو' اسے سوتے دیکھا ہے میں نے۔"

دونوں کسبیاں ہنسنے لگیں اور پھر ایک دوسرے کو سراہنا شروع کیا۔

سیسو نے کہا "کتنی اچھی عبا ہے تمہاری طرفہ' کیا اس کے پھول گھر ہی کاڑھے تھے؟"

طُرفہ کی عبا سمندری سبز رنگ اور باریک ریشم کی تھی جس پر شگفتہ پیل گوش کڑھے ہوئے تھے' شانے کے پاس عبا کا پہلو چنٹیں ڈال کر گھنڈیوں میں پھنسا دیا گیا تھا' جس پر ایک طلائی حاشیے والا گوہر شب چراغ بہار دے رہا تھا' اس سے چھاتیوں کے درمیان عبا نے شال کی شکل اختیار کر لی تھی اور جسم کا دایاں پہلو دھات کے کمر بند تک عریاں تھا۔ اس سے نیچے ایک تنگ شگاف تھا جو حرکتِ جسم کے ساتھ کھل کر ساقِ بلوریں کی جھلک دکھاتا تھا۔

کسی اور نے پکار کر کہا۔ "آؤ سیسو' طُرفہ ! کچھ اور کام نہیں ہے تو چلو میرے ساتھ۔ دیوار شعر (۵) دیکھنے جا رہی ہوں کہ کسی نے میرا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔"

"موسارین' ایلو۔۔۔ تم کہاں سے آنکلیں ؟"

"مینارِ نور سے آ رہی ہوں' وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو' موٹے شکار تو وہیں پھنستے ہیں۔"

"میرے لئے تو وہاں کوئی مرغی نہ تھی' اسی لئے تو دیوارِ شعر کی طرف جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ آؤ نا چلیں !"

راہ میں سیسو نے پھر بیقس کے جلسہ کا ذکر کیا اور موسارین نے کہا۔

"اوہ ! بیقس ! تمہیں پچھلی دعوت یاد ہے طرفہ ؟ زرینہ کی کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔"

"خیر یہ ذکر رہنے دو' سیسو اس کی سہیلی ہے۔"

موسارین کو ذکر چھیڑنے پر افسوس ہوا' اور سیسو فکر مند سی ہو گئی۔

"کیا بات ہو گئی تھی ؟"

"ہوں ! بس یہی لے دے' طعنے تشنے' لاگ ڈانٹ۔"

سیسو نے کہا۔ "جو کسی کا جی چاہے کہہ لے' زرینہ ہم سب سے اچھی ہے اور وہ اگر اپنا محلہ چھوڑ کر کبھی اس طرف آنکلی تو ہمارے چاہنے والے نظر بھی نہ آئیں گے۔"

"سچ مچ۔"

"بالکل' میں تو اس پر جان چھڑکتی ہوں' ہم میں ویسی البیلی کسبی تو کوئی ہے ہی نہیں۔"

اب وہ دیوارِ شعر کے قریب جا پہنچی تھیں۔لوگوں نے لکھ لکھ کر' ایک سرے سے دوسرے سرے تک' اس کی عظیم الشان سفید سطح کو کالا کر دیا تھا' جب کوئی شخص کسی کسبی سے لذت یاب ہونا چاہتا تھا تو اس دیوار پر اپنا اور کسبی کا نام لکھ دیتا تھا' ساتھ ہی حسن کی قیمت بھی رقم کر دی جاتی تھی اور اگر کسی کسبی کو عاشق پسند ہوتا تھا' اور قیمت بھی مناسب معلوم ہوتی تھی' کسبی اس دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی تھی اور اپنے گاہک کا انتظار کرتی تھی۔

طُرفہ نے ہنس کر کہا: "ذرا دیکھنا کسی شریر نے کیا لکھ دیا ہے۔"

جلی قلم سے دیوار پر لکھا تھا:

"بیقس"

"تھری سایٹ"

"چالیس پیسے"

"یہ کیا واہیات بات ہے' اس طرح کسبیوں کا مذاق اڑانا شریفوں کا کام نہیں ہے۔اگر میں مہتمم ہوتی تو اس کا ضرور انتظار کرتی۔۔۔لیکن سیسو ذرا آگے کچھ لکھا ہوا پڑھ رہی تھی۔یہ مذاق نہ تھا۔

سیسو

ٹائمن ابن یسیاس

ایک درہم

اس کا رنگ زرد پڑ گیا' اس نے کہا: "میں ٹھہروں گی یہاں۔"

دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی' گزرنے والی کسبیاں اس کی طرف رشک آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

اب دیر ہو چکی تھی اور بھیڑ چھٹنے لگی تھی' لیکن گانے والی لڑکی اور بنسی بجانے والیاں ابھی موجود تھیں' طُرفہ نے اس کے شانے پر تھپکی دے کر پوچھا۔ "کہیے۔"

"آپ سکندریہ کے رہنے والے معلوم نہیں ہوتے۔"

"سچ ہے بچی! تیری بات ٹھیک ہے' خوب پہچانا! کیا شہر ہے' کیا لوگ ہیں!"

"کیا آپ بوٹاسس سے آئے ہیں؟"

"نہیں، کباسا سے، غلہ بیچنے آیا تھا، کل واپس جاؤں گا، باون ہزار درہم کمائے ہیں میں نے دیوتاؤں کی مہربانی سے، فصل اچھی تھی اس سال۔"

ناگاہ طرفہ کو اس اجنبی سے دلچسپی سی ہو گئی۔

اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ "کیوں بچی میرا ایک کام کرے گی، تیری بڑی مہربانی ہو گی، جی چاہتا ہے کہ واپس جا کر اپنی بیوی اور تین بچیوں کو بتاؤں کہ سکندریہ میں کیسے بڑے آدمی دیکھ آیا ہوں، تم تو جانتی ہو ان سب کو۔"

"کسی کسبی کو؟"

"اچھا تو جب وہ پاس سے گزریں تو مجھے بتاتی جایئو، مجھے پتہ ہے کہ پچھلے دو دنوں میں بازار میں سے گزرتے ہوئے میں نے بڑے بڑے فلسفی اور حکومت کے بارسوخ امیر وزیر دیکھے ہوں گے، بڑا دکھ ہوتا ہے مجھے میں کسی کو پہچانتا ہی نہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں، دیکھئے وہ ناقریطس ہے۔"

"اور ناقریطس کون ہے؟"

"فلسفی۔"

"اور کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے چپ رہا کرو۔"

"زوس کی قسم! یہ سیکھنے اور سکھانے کے لئے کسی جوہر دماغی کی ضرورت تو نہیں ہے، مجھے یہ فلسفی ایک آنکھ نہیں بھایا۔"

اور وہ فریسی لاس جا رہا ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

"احمق، گدھا۔"

"تو پھر مجھے کیوں دکھاتی ہو۔"

"لوگ سمجھتے ہیں وہ بہت بڑا آدمی ہے۔"

"اور یہ احمق کیا کہتا ہے؟"

"بس جو بات کہتا ہے، مسکرا کر کہتا ہے، تاکہ اس کی غلطیاں جانی بوجھی معلوم ہوں اور اس کی عامیانہ باتیں دقیق۔ اور یہ طریقہ ہے بھی اچھا، اس نے سب لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونک دی ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آیا' کیا کہہ رہی ہو' یہ فریسی لاس تو ریاکار سا معلوم ہوتا ہے۔"

"اور یہ ہے فلاڈیمس۔"

"مدبر؟"

"نہیں' ایک لاطینی شاعر' شعر یونانی زبان میں کہتا ہے۔"

"وہ تو ہمارا دشمن ہے' اسے دیکھ کر تو مجھے رنج ہوا۔"

اس مرحلے پر بھیڑ میں ایک حرکتِ اضطراب سی پیدا ہوئی' سب لوگوں کی زبان پر ایک ہی نام تھا۔ دیمیطرس۔

طرفہ ایک لکڑی پر کھڑی ہو گئی اور سوداگر سے کہا:

"دیمیطرلیس، تم سب سے مشہور آدمی کو دیکھنا چاہتے تھے نا؟"

"دیمیطرلیس' ملکہ مصر کا عاشق! کیا سچ مچ؟"

"بڑے خوش نصیب ہو تم' سکندریہ آکر آج پہلی بار میں نے اسے یہاں دیکھا ہے۔"

"کون سا ہے وہ؟"

"وہ جو آگے جھک کر بندرگاہ کی طرف دیکھ رہا ہے۔"

"دو آدمی جھک کر دیکھ رہے ہیں۔"

"نیلے لباس والا۔"

"اچھی طرح نظر نہیں آتا' اس کی پیٹھ ہے اس طرف۔"

"تم جانتے ہو نا! وہ کون ہے۔ یہ وہی بت تراش ہے جس نے ہیکلِ زہرہ کے لئے زہرہ کا بت بنایا تھا' ملکہ کو دیکھ کر اور اسے سامنے بٹھا کر یہ بت تراشا گیا تھا۔"

"اسے محبوبِ سلطانی کہتے ہیں نا! کہتے ہیں وہ مصر کے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔"

"وہ اپالو کی طرح حسین ہے۔"

"اور وہ اس طرف مڑ کر دیکھ رہا ہے' بڑا خوش ہوں میں کہ یہاں آگیا' اس کے متعلق تو میں بہت کچھ سن چکا ہوں' سنتا ہوں کہ کسی عورت نے اس کی بات نہیں موڑی' بڑے عشق وِشق کر چکا ہو گا یہ تو' کیا ملکہ کو پتہ نہیں ہے؟"

"ملکہ کو سب کچھ پتہ ہے، لیکن کیا کرے دل سے مجبور ہے، اسے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی، ڈرتی ہے کہ واپس اپنے ملک فراکو کے پاس رہوڈز نہ چلا جائے۔ وہ اسی لیے سیاہ و سفید کا مالک ہے، ملکہ کی مرضی بھی یہی تھی۔"

"خوش تو نہیں معلوم ہوتا، اتنا دکھی کیوں نظر آرہا ہے۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو پھولا نہ سماتا، مزا آجائے جو ایک رات کے لئے مجھے اس کی جگہ مل جائے۔"

سورج ڈوب چکا تھا، تمام عورتیں اس مردِ جمیل کی طرف دیکھ رہی تھیں جو ان سب کے جواب ہائے عشق کا مرکز تھا، اور وہ بظاہر اس تمام اضطراب و ہیجان سے بے پرواو بے خبر، سنگ سفید کی دیوار پر جھکا ہوا، بنسی والیوں کے گیت سن رہا تھا۔ بنسی بجانے والیاں رک کر پھر بھیک مانگ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے اپنی بنسیاں شانوں پر ڈال لیں، گانے والی نے دونوں کی گردنوں میں ہاتھ ڈال لئے اور تینوں شہر کی طرف چل نکلیں۔"

رات ہو گئی تھی۔ باقی عورتیں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو کر سکندریہ کے شاندار شہر کی طرف جارہی تھیں۔ پیچھے پیچھے مردوں کی بھیڑ تھی، چلتے چلتے عورتیں دیمیطر لیس کی طرف دیکھتی جاتیں۔ سب سے آخر میں جو عورت گزری اس نے ست ہاتھوں سے دیمیطر لیس کی طرف پھول پھینکا اور مسکرائی۔

ساحل پر خاموشی مسلط ہو گئی۔

حوالہ جات

(۱) کام دیو ؛(Satyrs)صنمیات وروایات کے مطابق یہ انسانوں سے کچھ بلند تر بزرگوار تھے ، اور فطرت کی قوتِ نمو کے مظہر۔ 'دیو' کے لفظ میں یہ دلالتیں بظاہر نہیں ہیں لیکن شاید کثرتِ استعمال سے ان کا مفہوم ادا کرنے لگے۔ بہر نوع مجھے تو اس سے بہتر کوئی لفظ نہیں مل سکا۔ کامدیو عشق و محبت کا دیوتا، اندھا طفلِ کمسن' ہاتھ میں تیر و کمان۔

(۲) امِ خدایاں' دیوی دیوتاؤں کی Cybele۔

(۳) بکری کے سموں والا دیوتا(Godpan)فطرت کی قوتِ نامیہ کا مظہر۔

(۴) زہرہ' حسن و جمال کی دیوی' لذت و مسرت کی مظہر' اس کی پرستش بڑی دھوم دھام سے ہوتی تھی اور اس کا میلہ بھی ایسے شاندار طریقے سے منایا جاتا تھا کہ باید و شاید۔ جگہ جگہ اس کے مندر قائم تھے۔ مختلف قوموں نے اس کے مختلف نام تجویز کئے۔ آئندہ صفحات میں اُن کا ذکر آئے گا۔ سکندریہ خاص طور پر اس کی پرستش کا مرکز تھا۔ وہاں زہرہ کا مندر بھی دنیا کے عجائبات میں سے تھا۔

(۵) دیوار شعر ؛ ہیکلِ زہرہ کے پاس ایک دیوار تھی۔ کسبیوں کے عاشق اس دیوار پر اپنا اور اپنی محبوبہ کا نام لکھ دیتے تھے ، جس سے یہ مراد ہوتی تھی کہ وہ اس کے عشق میں گھل رہے ہیں۔ اگر کسی کو ان کے حال پر رحم کرنا منظور ہوتا تو بات طے ہوتی ورنہ ٹکا سا جواب مل جاتا۔

تیسرا باب

دیمیطریس

اگر دردِ دل میں یہ لذت ہے یارو
تو میں ان طبیبوں کے درماں سے گزرا
میں نے اک نالہ ایسا کیا کل چمن میں
کہ شعلہ سا برگِ درختاں سے گزرا

دیمیطریس، تنہا، اسی جگہ جھکا کھڑا تھا جہاں سنگِ سفید کی دیوار کے پاس گانے والی اور بنسی بجانے والیاں بیٹھی تھیں۔

وہ پرشور سمندر میں گزرتے ہوئے جہازوں کی سست چرچر اور فرشِ انجم کے نیچے چلتی ہوئی ہواؤں کی آواز سن رہا تھا۔

ایک درخشاں لیکن مختصر بادل کے ٹکڑے نے جو چاند کو آغوش میں لئے تھا، تمام شہر کو پرانوار بنادیا تھا اور نکھرا ہوا آسمان ایک نرم و نازک سے غلافِ نور میں لپٹا ہوا تھا۔ یہ نوجوان نچلی طرف دیکھ رہا تھا، اسے وہ جگہ نظر آئی جہاں بنسی بجانے والیوں کے گھسٹتے ہوئے دامنوں سے غبار پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے چہرے 'افیزیائی (۱) چہرے' اس کی آنکھوں کے سامنے آگئے' ان میں جو بری تھی وہ اسے قبول صورت معلوم ہوتی تھی۔ چھوٹی میں اسے کوئی ادا نظر نہ آئی تھی۔ بد صورتی کے تصور سے اسے تکلیف ہوتی تھی ۔اس نے چھوٹی کا خیال کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اس کے پاؤں کے پاس ہاتھی دانت کی کوئی شے

پڑی چمک رہی تھی' اس نے اٹھا کر دیکھا۔ ایک لوح کتابت (۲) تھی۔ ساتھ ہی ایک چاندی کا قلم لٹک رہا تھا۔ سطح کی لاکھ خراب ہو گئی تھی اور کسی نے بار بار وہی لفظ لکھے تھے جو وہ پڑھ رہا تھا' کیونکہ آخر کار کثرت تحریر کی وجہ سے یہ الفاظ ہاتھی دانت میں کھد کر رہ گئے تھے۔ چھ لفظ تھے۔

''مرطس کوروڈوسلیا سے عشق ہے۔''

وہ کوئی اندازہ قائم نہ کر سکتا تھا کہ دونوں بنسی بجانے والیوں میں سے اس لوح کتابت کی مالک کون تھی۔ آیا ان میں سے ایک دوسرے کی محبوبہ تھی یا محبوبہ کوئی افیریائی عورت تھی' جسے وطن چھوڑ کر یہ دونوں آگئی تھیں۔ ایک بار اسے خیال آیا کہ ڈھونڈ کر لوح مالک کے حوالے کر دے کہ یہ چیز اسے ایک بھولے بسرے زمانہ عشق کی یادگار معلوم ہوتی تھی' لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اب انہیں ڈھونڈنے میں دقت پیش آئے گی۔ علاوہ ازیں اب اس کی دلچسپی بھی کم ہو گئی تھی۔ چنانچہ بد دلی سے اس نے لوح سمندر میں پھینک دی۔ ایک سفید پرندے کی طرح دوش ہوا پر تیرتی ہوئی سمندر میں جا گری اور اسے سیاہ سمندر میں گرنے کی صدا صاف سنائی دی' اس خفیف سی صدا کی وجہ سے اسے بندرگاہ کی عالمگیر خاموشی کا از سر نو احساس ہوا۔

خنک دیوار سفید سے ٹیک لگا کر تمام تصورات اور تفکرات کو خیر باد کہہ کر صرف ان چیزوں میں محو ہو جانا چاہا جو اس کے پیش نظر تھیں۔ زندگی سے اسے خوف آتا تھا' وہ گھر سے اس وقت باہر نکلتا تھا جب زندگی کی ہاؤ ہو ختم ہو جاتی تھی اور اس وقت باہر واپس جاتا تھا جب پو پھٹنے کے بعد ملاح اور سبزی فروش شہر کی طرف جاتے تھے۔ تمام دنیا میں اسے صرف شہر کا اور اپنے مکان کا سایہ نظر آتا تھا اور یہ مسرت ایسی شدید و قوی تھی کہ اسے یاد ہی نہ تھا کہ دوپہر کا سورج آخری بار کب دیکھا ہے۔ وہ زندگی سے اکتا گیا تھا' ملکہ کی فرسودہ محبت نے اسے تھکا دیا تھا۔

آج سے تین سال پہلے جب ملکہ مصر نے کچھ اس کے جوہر دماغی' لیکن زیادہ تر اس کی شہرت حسن و جمال سے متاثر ہو کر' اسے محل شاہی میں طلب کیا تھا اور ''باب شام'' کی گھنٹیوں کے ذریعے اس کے آنے کی اطلاع دی گئی تھی' تو اس کے دل میں ایک طوفان غرور و مسرت برپا ہو گیا تھا' آج اس غرور و مسرت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ ان واقعات کے تاثرات کی طرح جو غیر معمولی طور پر شیریں ہونے کے باعث آخر کار

خشک معلوم ہونے لگتے ہیں اور جن کا وجود ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ اس استقبال شاہانہ کی یاد بھی کبھی کبھار اس کے دل میں شعلوں کی طرح بھڑک اٹھتی تھی۔

محل کے اس حصے میں جو ملکہ کی سکونت و اقامت کے لئے خاص تھا ملکہ اسے خلوت میں تنہا ملی تھی۔ یہ حصہ تین بڑے بڑے کمروں پر مشتمل تھا' جس میں فرش اور گدیلوں کا ایسا نفیس و عشرت انگیز انتظام تھا کہ خفیف سے خفیف آواز باہر نہ جا سکتی تھی۔ اس دن وہ بائیں پہلو پر لیٹی تھی اور اس کا جسم اس حریرِ سبز کے نرم بستر میں گویا غرق ہو گیا تھا جس کے عکس سے ملکہ کے مشک رنگ بالوں میں بنفشی چمک دمک پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا جسم نو بہار نہایت نازک اور باریک لباس میں ملبوس تھا۔ یہ لباس فریریہ کی ایک کسبی نے ملکہ کی موجودگی میں سیا تھا۔ اس میں بائیس شگاف تھے اور ان شگافوں سے جسم کے وہ بائیس حصے نظر آتے تھے جنہیں مَس کرنے کے بعد کوئی اپنے بس میں نہیں رہتا۔ اس لباس کو اتارنے کے بغیر ہی پوری رات عیش و نشاط میں بسر کی جا سکتی تھی' اختلاط و محبت کے تمام خواب شرمندہ تعبیر کئے جا سکتے تھے۔ دیمیطریس نے جھک کر ملکہ کا نازک ننگا پاؤں ہاتھ میں تھام کر ایک شیریں اور گراں پایہ شے کی طرح چوم لیا تھا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

نہایت سکون سے ملکہ نے اس کنیز کی طرح جو کسی بت تراش کا نمونہ (ماڈل) (۳) ہو اپنے لباس کے بند کھول دیئے' گھنڈیاں کھول دیں' کھلا سلدرانہ اتار دیا' کنگن تک علیحدہ کر دیئے' پاؤں کے چھلے بھی اتار دیئے اور ہاتھ شانوں کی بلندی تک پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بالوں میں مرجان گندھا تھا اور لرزاں لرزاں اس کے رخساروں کے دونوں طرف لٹک رہا تھا۔

اس کا باپ بطلیموس فرعونِ مصر تھا اور اس کی ماں شام کی شہزادی تھی جس کا شجرہ نسب بہ واسطہ خدایان آخر کار استرتی سے جا ملتا تھا۔ اس کو یونانی "زائیدہ کفِ دریا" کہتے تھے۔ دیمیطریس کو یہ بات معلوم تھی اور یہ بھی علم تھا کہ وہ اپنے نژادِ خدائی پر مغرور ہے' اس لئے اسے کوئی تعجب نہ ہوا' جب ملکہ نے کہا؛

"میں استرتی ہوں' سنگِ مرمر اور اپنا تیشہ سنبھالو' اہلِ مصر کو بتاؤ کہ میں کیا ہوں' میرے بت کی پرستش کی جائے گی۔"

دیمیطریس نے اس کی طرف دیکھا تو اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے اچھوتے

بدن میں ایک نوزائیدہ اور صاف شہوانیت کروٹیں لے رہی تھی۔اس نے ملکہ کو چھاتی سے لپٹالیااور کہا: ''تمہارا پہلا پرستار میں ہوں۔''

ملکہ پیچھے ہٹ گئی تھی،لیکن ناخوش معلوم نہ ہوتی تھی۔

''کیا تم اپنے آپ کو ایڈونس(۴) سمجھتے ہو کہ تمہیں دیوی کو چھونے کی جرات ہوئی؟''

اس نے جواب دیا: ''ہاں!''

ملکہ نے اس کی طرف دیکھا'اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم پیدا ہوا'اور پھر اس نے کہا: ''سچ کہتے ہو۔''

اس وقت سے دیمیطر لیس دین و دنیا سے گیا۔اس کے بہترین دوست اس سے علیحدہ ہو گئے لیکن عورتوں نے اس کی پرستش شروع کر دی۔جب وہ محل کے عظیم الشان کمروں میں سے گزرتا تو کنیزیں رک کر گھورنے لگتیں'دربار کی نازنینوں کو چپ لگ جاتی'اجنبی اشتیاق سے گوش بر آواز ہو جاتے کیونکہ اس کی آواز میں ایک ساحرانہ کشش تھی۔جب وہ ملکہ کے کمروں کی طرف چلا جاتا تو عورتیں طرح طرح کے بہانوں سے اس کے پیچھے جاتیں۔جب وہ بازار میں سیر کرنے نکلتا تو اس کی عبا کے شکن پارچوں سے بھر جاتے'جن پر راہگیر عورتوں نے اپنے نام اور دردِ محبت کی مختصر کہانیاں لکھی ہوتیں۔وہ ان پارچوں کو توڑ مروڑ کر پھینک دیتا کہ ان کو دیکھ دیکھ کر اکتا گیا تھا۔جس دن ہیکلِ زہرہ میں اس کا بنایا ہوا بت'استرتی کا مجسمہ رکھا گیا ہے اس دن پرستار عورتوں کا ایک ہجوم ہیکل میں گھس آیا کہ سنگ مرمر پر اس کا نام پڑھ کر آنکھیں روشن کر سکیں اور اپنے زندہ معبود کے نام پر گلاب کے پھولوں اور قمریوں کی بھینٹ چڑھائیں۔

بہت جلد اس کا گھر تحفوں سے بھر گیا۔پہلے پہل تو وہ بے پروایانہ قبول کرتا گیا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ دینے والے اس سے کیا توقع رکھتے تھے (وہ اسے کسبی خیال کرتے تھے!!) تو اس نے تحفے لینے سے انکار کر دیا۔اس کی اپنی کنیزیں اس سے محبت کی بھیک مانگتی تھیں اور وہ انہیں کوڑوں سے پٹوا کر ریکاٹس کے چکلے والوں کے ہاتھ بیچ دیتا۔اس کے غلام جنہیں انعام واکرام سے خرید لیا جاتا تھا'اجنبی عورتوں کو اس کے مکان میں داخل ہونے کی اجازت دے دیتے تھے اور اکثر رات کو اسے بستر پر یہ

عورتیں اس ادا سے محوِ استراحت ملتی تھیں کہ ان کی گرم جوش آرزوؤں کے متعلق کسی شک کی گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔

اس کے سنگھار میز سے چھوٹی چھوٹی چیزیں غائب ہو جاتی تھیں اور یہ راز کھلتا ہی نہ تھا۔ سکندریہ میں کئی عورتوں کے پاس ایسی چپلیاں تھیں جو کبھی اس نے پہنی تھیں، ایسی شالیں جو کبھی اس نے استعمال کی تھیں، ایسے پیالے جن سے اس نے پانی پیا تھا، پھلوں کے بیج تک عورتیں سنبھال کر رکھتی تھیں۔ اگر سیر کے دوران ایک پھول اس کے ہاتھ سے گر پڑتا تو غائب ہو جاتا۔ اس کے پاؤں کے نیچے کی مٹی تک عورتیں جمع کر کے لے گئی تھیں

اس بات سے قطع نظر کہ اس خطرناک یورش سے اس کے احساسات لطیف کے مردہ ہو جانے کا خدشہ تھا، وہ اب عمر کے اس مرحلے پر آ پہنچا تھا، جب ایک سوچ بچار کرنے والا آدمی اپنی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے تاکہ جسم کی آرزوؤں اور ذہن کے تقاضوں میں ایک حد فاصل قائم کر دی جائے۔

اس کے خیال میں زہرہ، استرتی، زائیدۂ کفِ دریا کا مجسمہ اس انقلابِ اخلاقی کا محرک تھا۔ دیمیطر لیس نے ملکہ کے جسم و ذہن کا ہر عصرِ جمال، اس کے بدن کے نرم و نازک خطوط کی ہر معیاری آرائش، سنگِ مرمر سے کھینچ کر نکال لی تھی اور بت کی تکمیل کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ دنیا کی کوئی عورت اس خوابِ حسن کے نقطہ عروج تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہی بت اس کی آرزوؤں کا مرکز بن گیا۔ وہ صرف اس کی پرستش کرتا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں بہ جوشِ تمام دیوی کا تصورِ اعلیٰ اس کی حیثیتِ جسمانی سے علیحدہ کر لیا تھا اور جب سے دیوی اس کی زندگی کا ایک جزو بن کر رہ گئی تھی اس دن سے زیادہ غیر مادی بھی ہو گئی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ جب اس کی نظر پھر ملکہ پر پڑی تو وہ اس دلربا کشش سے خالی نظر آئی جس نے کبھی اس پر جادو کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ کے لئے ملکہ کے ذریعے اس کی بے مقصد آرزوؤں کی فریب کارانہ تکمیل ہوتی رہی لیکن دیمیطر لیس کے دل کو تسلی نہ ہو سکتی تھی کہ ملکہ دیوی سے بہت مشابہ بھی تھی اور اس سے بہت مختلف بھی۔ جب کبھی وہ تھک کر اس کی آغوش سے نکل کر بستر پر گر پڑتی اور فوراً گہری نیند سو جاتی تو وہ ملکہ کی طرف اس طرح دیکھتا گویا وہ کوئی اجنبی ہے، جس سے فریبِ مشابہت سے کام

لے کر بسترِ عشرت پر اس کے محبوب کی جگہ لے لی ہے۔

اس کے محبوبِ حقیقی کے مقابلے میں اس کے بازو نسبتاً نازک تر' اس کی چھاتیاں زیادہ نوک دار' اس کے کولہے زیادہ تنگ تھے' اس کی بُنِ ران کے قریب وہ نقیس شکن موجود نہ تھے جو اس نے تیشے سے پنسل کے خطوطِ خفی کی طرح مرمر میں تراش دیئے تھے' آخر کار وہ اس سے اکتا گیا۔

دیمیطر لیس کے پرستار بہت جلد اس حقیقت سے آشنا ہو گئے اور ہر چند کہ وہ روز ملکہ سے ملنے کے لئے جاتا تھا لیکن ہر ایک کو معلوم تھا کہ اس کو ملکہ سے محبت نہیں رہی۔ اس سے عورتوں کی محبت میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ اسی طرح بے پروا رہا۔ جس تغیر کا وہ خواہشمند تھا اس کی نوعیت کچھ اور ہی تھی۔

جب کبھی کسی شخص نے دو مخدوموں کی خدمت کی ہے تو اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی وقفے میں اس نے اپنے اندر عامیانہ عشرت کاری کی طلب و آرزو محسوس کی ہے۔ دیمیطر لیس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

وہ ملکہ سے ملنے پر مجبور تھا اور مجبوری کا احساس کرنے کے بعد جب وہ معمول سے زیادہ بیزار ہو جاتا تو وہ ایک رات اس باغ میں بسر کرتا جس نے ہیکل زہرہ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور جہاں مقدس کسبیاں رہا کرتی تھیں۔ اس باغ کی کسبیاں اس سے ناواقف تھیں۔ دراصل زائد از ضرورت عاشقوں کی کثرت نے انہیں اس قدر تھکا دیا تھا کہ رونا اور آنسو بہانا بھی ان کے بس میں نہ رہا تھا اور ان کی آغوش میں اسے وہ سکونِ لذت میسر ہوتا تھا جس کی اسے آرزو تھی۔ ملکہ کی عادت تھی کہ ایسے موقعوں پر بلیوں کی طرح دیوانہ وار چیخ چیخ کر لذت کے احساس کو ضائع کر دیتی تھی۔ یہ بات دیمیطر لیس کو سخت ناپسند تھی' کسبیاں کم از کم اس بات سے تو پرہیز کرتی تھیں۔

باغ کی ان مہ پیکروں سے وہ ادھر اُدھر کی باتیں بڑے مزے سے کرتا رہتا تھا' کسبیاں اپنے گاہکوں کے قصے سناتیں' موسم کا ذکر چھیڑتیں' سبزے کی ملائمت کی باتیں کرتیں یا رات کی ہواؤں کے افسانے سناتیں' اور اسے بڑی خوشی ہوتی' انہیں اس بات کی ضد نہ تھی کہ دیمیطر لیس فنِ سنگ تراشی پر اپنے خیالات کا اظہار کرے' وہ اکیلیس اور سکویاز کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی نہیں کرتی تھیں۔

اگر کبھی ایسا ہوتا کہ وہ اپنے نئے گاہک دیمیطر لیس کا شکریہ ادا کرتیں یا اس کی

قوتِ مردانگی کی تعریف کرتیں تو اسے اختیار ہوتا کہ وہ ان کی تعریف کو خوشامد سمجھے اور ان کی بے غرضی کا اعتبار نہ کرے۔

ان کی آغوش سے نکل کر دیمیطر لیس ہیکلِ زہرہ کی سیڑھیاں طے کر کے دیوی کے بت کے سامنے ایک حالتِ وجد میں کھڑا ہو جاتا۔ نازک ایونین ستونوں کے درمیان 'سنگِ سرخ کے چبوترے پر' گلے میں قربانی کے ہار پہنے 'دیوی زندہ و متحرک معلوم ہوتی تھی۔

اس کے ایک ہاتھ میں پریاپس (۵) کے دستے والا آئینہ تھا' دوسرے ہاتھ سے موتیوں کے ست لڑے ہار کو درست کر رہی تھی کہ اپنی جگہ پر بیٹھ جائے۔ اس ہار کے درمیان ایک بڑا موتی تھا' بیضوی' سفید و تابناک ۔۔۔ یہ موتی اس کی چھاتیوں کے درمیان لٹکتا ہوا اس طرح معلوم ہوتا تھا جس طرح بادلوں کے دو گول ٹکڑوں کے درمیان نیا چاند۔

دیمیطر لیس دیوی کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہتا' عام لوگوں کی طرح اس کا بھی یہی مان لینے کو جی چاہتا تھا کہ یہ موتی وہی مقدس و پاکیزہ موتی ہیں جو استرتی (۶) زائیدۂ کفِ دریا کے صدف میں رقصاں تھے۔

وہ کہا کرتا "اے خواہرِ قدسی! اے گلِ شگفتہ! اے حقیقتِ مجسم! تو اب وہ حقیر ایشیائی عورت نہیں جسے میں نے تیرا نمونہ سمجھا تھا (کہ وہ نمونہ تیرے حسن کا سزاوار تھا ہی نہیں) تو لازوال تصور ہے' تو اب استرتی کی روح زمینی ہے جو اپنی نسل کی ماحصل تھی۔ اس وجودِ سنگ میں آنے سے پہلے' یہ روپ دھارنے سے پیشتر' بے شک تو استرتی تھی' تو اس کی فروزاں آنکھوں میں روشن تھی' تو اس کے لبِ لعلیں پر شعلہ کار تھی' تو اس کے نازک سفید ہاتھوں میں محوِ خواب تھی' تو اس کے پستان میں لرز رہی تھی' اور تو اس کے خم کھاتے ہوئے اعضاء میں کروٹیں لے رہی تھی' وہی چیز' جس کے بغیر ملاح کی لڑکی لذت یاب نہیں ہو سکتی' تجھے بھی مفتوح کر سکتی ہے' اے دیوی! دیوتاؤں اور آدمیوں کی ماں! دنیا کا دکھ اور سکھ تجھی سے ہے۔

لیکن میں نے تجھے دیکھا' بلایا' پھر اپنی صنعت کی گرفت میں لے لیا۔ اے معجزہ کار' اے سائیتھریا! میں نے تجھے دنیا میں بے نقاب کیا!

میں نے یہ آئینہ اور یہ ست لڑا ہار تیرے بت' تیرے عکس کو نہیں دیا' تو خود'

تو ہے' جسے میں نے یہ تحفے دیئے ہیں تو جو خون رنگ آسمان اور کفِ دریا کے تبسم سے پیدا ہوئی تھی' اس وقت جب تباشیرِ صبح شبنم آلود تھی۔ تو جسے نیلگوں سمندری دیوتا اپنے سینگوں پر اٹھائے ساحل قبرص پر چھوڑ گئے تھے۔"

اس قسم کی عبادت کے بعد آج وہ ساحلی مہتابی کی طرف آگیا تھا۔ لوگ باگ شہر کی طرف واپس جا رہے تھے اور بنسی بجانے والیاں اپنے درد بھرے گیت گا رہی تھیں۔ اس شب وہ باغ کی کنیزوں کے پاس نہ رکا تھا کیونکہ گھاس میں ایک جوڑے کو محوِ اختلاط دیکھ کر وہ بیزار سا ہو گیا تھا اور اس کی روح کو اس کام سے گھن آنے لگی تھی۔

آہستہ آہستہ رات کے کیف آور تأثرات اس پر چھا گئے' اس نے ہوا کے رخ کی طرف منہ موڑا' جو اب سطحِ آب پر رواں تھی اور گویا امیتھسن کے تمام گلابوں کی خوشبو مصر کی طرف لیے آ رہی تھی' اس کے صفحۂ دل پر عورتوں کے خوبصورت جسموں کی تصویریں اترنے لگیں۔ لوگوں نے اسے کہا تھا کہ ہیکلِ زہرہ کے لئے امید' ایمان اور سخاوت کے بت بنائے اس طرح کہ ان کے جسم گتھے ہوئے ہوں۔ اس نے غرورِ جوانی میں یہ تجویز رد کر دی تھی کہ وہ ایک عامیانہ رسم کی نقل نہیں اتارنا چاہتا تھا۔ جو خواب وہ اکثر دیکھا کرتا تھا وہ یہ تھا کہ سنگِ مرمر کے ایک ٹکڑے میں نسوانیت کی سہ گونہ شیریں حرکات جمع کر دے۔ دو شکلیں تو اپنے کپڑوں میں ملبوس ہوں' اس طرح کہ ایک آنکھ نیم وا کئے دستِ نازک میں پنکھا لیے پروں کے خفیف تموج سے لذت یاب ہو رہی ہو' دوسری اپنی عبا کے دامن پر محوِ رقص ہو' تیسری اپنی بہنوں کی آڑ میں عریاں کھڑی ہو اور اپنے گھنے بال ہاتھ میں لئے نچوڑ رہی ہو۔

اس کے ذہن میں کئی اور تجویزیں چکر لگا رہی تھیں۔ ایک یہ تھی کہ مہیب و شور انگیز سمندر کے مینارِ نور سے پیوستہ سنگِ موسیٰ سے انڈرومیڈا (۷) کا بت تراشا جائے۔ ایک تجویز یہ تھی کہ پروشیان کے چوک کے ارد گرد پَر دار گھوڑوں کی طرح "چار توسن آفتاب طالع" شکلیں تراشی جائیں۔ پھر ایک اور موضوع کا خیال آتے ہی گویا اس پر وجد طاری ہو گیا "زاگریس' دیوتاؤں کی آمد آمد سے خوفزدہ!"

اف! کیا مزہ ہو جو پھر حسن و تخلیقِ حسن کے پھندوں میں پھنس جاؤں اور محبت سے نجات حاصل ہو' کیا خوشی ہو جو دیوی کے تصورِ اعلیٰ کو اس کی حیثیتِ جسمانی سے علیحدہ کر سکوں۔ وہ پھر اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا تھا۔

سمندر کی طرف منہ موڑ کر اس نے دیکھا کہ دور ایک عورت نقابِ زرد میں پوشیدہ تنہا جارہی تھی۔

حوالہ جات

(۱) افیزیائی ؛ افیزیا کے ساکن ' افیزیا قدیم ایشیائے کوچک کا ایک مشہور شہر تھا۔اب داستانوں میں نام،باقی رہ گیا ہے۔

(۲) ہاتھی دانت کی لوح، لکھنے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ جس طرح آج کل کاغذ استعمال ہوتا ہے۔

(۳) نمونہ ؛(Model)اس کا ترجمہ تسلی بخش نہیں ہے،اس سے بہتر لفظ نہ ہونے کی بناء پر اس لفظ سے کام لیا گیا ہے۔

(۴) ایڈونس(Adonis)دیوی زہرہ کا محبوب، شکسپئر نے بھی ان کا افسانہ حسن و عشق لکھا ہے اور خوب ہولی کھیلی ہے۔اہلِ ذوق احباب شکسپئر کی نظم (Venus and Adonis) سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

(۵) پریاپس ؛ایک دیوتا کا نام۔

(۶) زہرہ' استرتی (جسے زائیدۂ کفِ دریا بھی کہتے ہیں) کے متعلق روایت ہے کہ سمندر کی جھاگ سے یکبارگی نمودار ہوئی تھی۔اس روایت کی طرف ایک مجمل سا اشارہ آگے آئے گا۔ یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زہرہ کے مختلف نام اس کتاب میں آئے ہیں۔ ان کی جگہ اکثر زہرہ یا استرتی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، ورنہ غلط فہمی پھیلنے کا اندیشہ تھا۔اس موقعہ پر انگریزی لفظ انڈو میں تھا ' یہ بھی

زہرہ کالقب تھا۔

استرتی ؛ آپ کو یاد ہو گا کہ مصر دیمیطر لیس کی محبوبہ استرتی کی اولاد میں سے تھی اور اس نے اپنا نام بھی اسی نسبت سے استرتی بتایا تھا۔ یہاں استرتی سے مراد ہے' جس کا نمونہ دیمیطر لیس نے دیوی کا یعنی زہرہ کا بت بنایا تھا۔

(۷) انڈرومیڈا ؛ پرسوس کی بیوی، جس نے آخر کار ایک سیارہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ Pagasi صنمیات کے مشہور و معروف گھوڑے، بظاہر الف لیلیٰ کا کل کا گھوڑا ان گھوڑوں کی نسل سے معلوم ہوتا ہے، الف لیلیٰ پر ان صنمیات و روایات کا کیا اثر ہے یا اثر ہے بھی کہ نہیں، بڑا دلچسپ سوال ہے اور اربابِ نظر کے لئے سرمایہ فکر! کئی علوم میں عرب یونانیوں کے زیرِ بار ہیں۔ شاید افسانوی ادب کا بھی ثابت ہوں۔

چوتھا باب

زنِ گزراں (۱)

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی' اس کا سر شانے پر ایک طرف جھکا ہوا تھا' چاندنی رات میں وہ سنسان مہتابی پر محوِ خرام تھی' ایک بے قرار سایہ اس کے پاؤں کے پاس لرزاں تھا۔

دیمیطر لیس اسے بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا' باریک کتان میں سے اس کے جسم کا جو ذرا سا حصہ نظر آتا تھا' اس پر آڑے ترچھے جھول نظر آتے تھے' اس کی ایک کہنی تنگ قبا میں سے صاف ابھری ہوئی نظر آتی تھی۔

دوسرے ہاتھ میں وہ شال کا لمبا دامن اٹھائے تھی' کہ خاک آلود زمین سے مس نہ ہونے پائے۔

زیوروں سے اس نے پہچانا کہ کسبی تھی اور وہ سڑک چھوڑ کر ہٹ گیا کہ سلام و کلام کا سلسلہ نہ شروع ہو جائے۔ وہ اس کی طرف دیکھنا بھی نہ چاہتا تھا۔ اس کا ذہن زاگریس کے عظیم الشان مجسمے کے خیالات سے لبریز تھا' اس کے باوجود اس کی آنکھیں

اس زنِ گزراں کا تعاقب کر رہی تھیں۔

اس نے دیکھا کہ وہ رکی نہیں۔ اسے گویا دیمیطر لیس کے وجود کا علم ہی نہ تھا۔ اس نے کسی طرح اپنی کسی حرکت سے جھوٹ موٹ یہ بھی ظاہر نہ کیا کہ میں تماشائے دریا میں محو ہوں' یا یہ کہ میں اپنے خیالات میں مگن ہوں۔

مختصراً سادہ الفاظ میں' وہ کسی اکیلی سیر کر رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا' انتہائی خلوت اور خاموشی کی ہلکی سی گونج کے سوا وہ اور کسی چیز کی خواہشمند نہ تھی۔

دیمیطر لیس چپ چاپ کھڑا رہا اس کی طرف دیکھتا رہا وہ تو گویا ششدر ہو گیا' یہ عورت اب دور نکل گئی تھی۔ ایک بے پروا سایہ زرد کی طرح' اس کا اپنا سایہ اس کے آگے آگے لرزاں تھا۔ ہر قدم پر وہ شاہراہ کی خاک پر اس کی چپلوں کی ہلکی ہلکی آواز سن رہا تھا۔ وہ مینارِ نور کے جزیرے تک گئی اور پھر وہاں کے پتھروں پر چڑھ گئی۔

ناگاہ' گویا دیر سے اس نامعلوم عورت سے عشق ہے' دیمیطر لیس نے اس کے پیچھے بھاگنا شروع کیا' پھر ٹھہر گیا' واپس آیا' کانپنے لگا' اپنے آپ کو برا بھلا کہا' مہتانی سے لوٹ جانا چاہا۔ لیکن اس نے آج تک اپنی قوتِ ارادی کو صرف حصولِ مسرت میں استعمال کیا تھا اور آج جو ناگاہ اسے بلندیٔ اخلاق اور اپنی زندگی کی نظم و ترتیب کی خاطر اس چیز کو استعمال کرنے کی ضرورت آن پڑی تو ضعفِ عزم کے سبب وہ کچھ نہ کر سکا اور اس کے پاؤں گویا وہیں جم گئے۔

ہر آن اس زنِ گزراں کا خیال اسے ستا رہا تھا۔ اس لئے وہ دل میں اس اضطرابِ شدید کے لئے عذر تلاش کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہتا تھا: "میری دلبستگی' میری تحسین کی وجہ۔۔۔ قطعاً و یکسر جمالیاتی ہے (کہ مجھے ہر خوبصورت چیز سے عشق ہے)' یہ عورت جو گزری ہے اس مجسمے کے لئے خوب نمونہ (ماڈل) بن سکتی ہے' جو میں بنانا چاہتا ہوں' یعنی پنکھیا والی عورت' کل ہی شروع بھی کر دوں گا کام۔"

پھر ناگاہ اس کے خیالات میں انتشار پیدا ہو گیا اور زرد لباس والی عورت کے متعلق اس کے ذہن میں اضطراب انگیز سوالات کا ایک ہجوم پیدا ہو گیا (اس وقت رات کو وہ یہاں کیا کرنے آئی)' اپنا گھر چھوڑ کر رات گئے وہ کس لئے آئی؟ اس نے مجھے سلام کیوں نہیں کیا؟ اس نے یقیناً مجھے دیکھا تھا۔ جب میں سڑک چھوڑ کر ہٹا ہوں تو اس نے مجھے ضرور دیکھا ہو گا' بغیر کسی لفظ کے وہ خاموش کیوں چلی گئی تھی؟ یہ افواہ گرم تھی کہ

بعض عورتیں صبح سے کچھ پہلے تاروں کی چھاؤں میں، ٹھنڈے ٹھنڈے، نہانے کے لئے آتی ہیں۔

لیکن لوگ مینارِ نور کے پاس نہانے کے لئے نہیں آتے، وہاں پانی بہت گہرا ہے، علاوہ ازیں زیور پہن کر کون عورت نہانے جائے گی۔ غلط! پھر کیا چیز تھی، جس کی کشش اسے ریکائس سے لے آئی تھی، کسی سے ملاقات کا وعدہ؟ کیا وہ کسی نوجوان سے ملنے آئی تھی جو تنوع کا بھوکا تھا، جس نے ان پتھروں کو اپنا عارضی بسترِ عشرت بنانا پسند کیا تھا جو لہروں کی مسلسل ضربوں سے چمکدار اور صاف ہو گئے تھے۔

دیمیطر لیس اپنے شکوک کو یقین کے درجے پر پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ کم عمر عورت خود ہی واپس آ رہی تھی۔ اس طرح دبے پاؤں چلتی، پنکھے سے مہتابی کی مٹی اڑاتی آ رہی تھی اور چاند کی ہلکی ہلکی سفیدی میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

حوالہ جات

(۱) زنِ گزراں؛ (Passing Woman) قصداً لغوی ترجمہ کیا گیا ہے، اس لئے کہ اصل میں گزراں کی جو دلالتیں خاص کر زن کے ساتھ مل کر پیدا ہوتی ہیں، وہ نمایاں ہو سکیں۔ اربابِ نظر اس ترکیب کا لطف لیں گے۔ انسان کی زوال پذیری خاص طور پر عورت کی فہرت کا مائل بہ تماشا عصرِ بے پروائی اور پھر استغنا! یہ تمام اشارات ایک لفظ Passing میں پوشیدہ ہیں۔ مہر گردوں ہے چراغ راہگزار بادیاں۔

پانچواں باب

شیشہ، کنگھی، ہار

بے رخی بھی ان کی گویا التفاتِ ناز تھی
میری نادانی کہ ان کو سرگراں سمجھا تھا میں

اس کے جمال میں ایک آن تھی، اس کے بال، بہت گھنے بال، سونے کا ڈھیر معلوم ہوتے تھے، ان گھنے سایہ دار بالوں کے لہراتے ہوئے لچھے اس کی پیشانی پر پڑے تھے، جن میں کان بالکل چھپ گئے تھے۔ گردن پر سات بار بل دے کر ان کا جوڑا باندھ دیا گیا تھا۔ اس کی ناک نفیس و نازک تھی اور پُر گوشت، سرخی آلود لبوں پر (جن کے گوشے خمدار اور شیریں حرکات تھے) گاہ گاہ پھڑکنے والے نتھنے، جذباتِ دلی کا اظہار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

چلنے میں اس کے جسم کے ملائم خطوط لچکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اس کی چھاتیوں کی حیات آفریدہ لرزشوں، اس کی چمک دار کمر اور اس کے مٹکتے ہوئے کولہوں کی وجہ سے اس کی بوٹی بوٹی پھڑکتی نظر آتی تھی۔

جب وہ دیمیطر لیس سے دس قدم کے فاصلے پر آگئی تو اس کی طرف دیکھا۔ دیمیطر لیس کانپ اٹھا۔ اس کم عمر نازنین کی آنکھیں حیرت انگیز تھیں، نیلگوں لیکن گہری، تابناک، نم آلود، تھکی ہوئی، یکسر آگ اور آنسو، پلکوں اور پپوٹوں کے بوجھ سے بند ہوتی ہوئیں۔

ان میں سے نظریں اس طرح نکلتی تھیں جس طرح پرانے زمانے کی جادو گرنیوں کے گیت' اور جو شخص ایک بار ان نظروں کے دائرے میں آگیا' وہ ساری عمر کے لئے مبتلا ہو گیا۔ وہ ان کے اثرات سے واقف تھی اور ان کا استعمال کرنا بھی خوب جانتی تھی۔ لیکن اسے زیادہ بھروسہ اپنے تغافل' اپنی آن بے پروائی پر تھا' جو وہ اس نوجوان کی طرف سے برت رہی تھی جسے آج تک مخلصانہ محبت نے ذرا بھی متأثر نہ کیا تھا۔

جو جہاز ران گنگا کے اس پار' ارغوانی سمندروں کا سفر کر چکے ہیں' وہ ان زیر آب پتھروں کی کہانیاں سناتے ہیں جو سنگِ مقناطیس سے مرکب ہیں' جب جہاز ان پتھروں کے اوپر سے گزرتے ہیں تو تمام بند اور میخیں جہاز کے پیندے سے جدا ہو کر اُن زیرِ آب پتھروں سے ہمیشہ کے لیے پیوستہ ہو جاتی ہیں اور وہی چیز جو کبھی ایک جہاز تھی' تیز رفتار انسانوں کے لیے جائے پناہ' ایک زندہ و متحرک حقیقت' ہاں وہی چیز بہتے ہوئے تختوں کا ایک مجموعہ ہو کر رہ جاتی ہے' جنہیں ہوائیں اِدھر سے اُدھر لئے پھرتی ہیں اور لہریں ریزہ ریزہ کر ڈالتی ہیں۔

عین اسی طرح ان مقناطیسی آنکھوں کے نور کے مقابلے میں دیمیطر لیس کو اپنے بدن سے تمام طاقت زائل ہوتی معلوم ہوئی' اور وہ کھو گیا۔

نازنین نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور اس کے پاس سے گزری۔ اس شانِ تغافل کو دیکھ کر وہ اتنا مضطرب ہو چکا تھا کہ زور سے چلانے کو جی چاہتا تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں' اسے خوف تھا کہ شاید وہ اپنی معمولی حالت پر واپس نہ آسکے گا۔ اسے اب اس نازنین سے باتیں کرنا تھیں۔

اس کے باوجود اس نے سلسلۂ کلام نہایت معمولی طریقے سے شروع کیا۔

اس نے کہا: "تم پر سلام ہو۔"

نازنین نے جواب دیا: "اور تم پر بھی۔"

دیمیطر لیس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "یوں ہولے ہولے کدھر جا رہی ہو؟"

"گھر"

"تنہا؟"

"ہاں تنہا"

اور نازنین نے چاہا کہ آگے بڑھ جائے۔

دیمیطر لیس کے دل میں معاً یہ خیال گزرا کہ شاید اسے کسی سمجھنے میں اس سے غلطی ہوئی ہے۔ کچھ عرصے سے میجسٹر یٹوں اور دیوانی افسروں کی بیویاں بھی کسبیوں کی طرح پاؤڈر اور غازے کا استعمال کرنے لگی تھیں۔ شاید یہ نازنین کوئی عزت دار گھر گرہستن تھی۔ اب جو اس نے بات کی تو اس میں طنز کا ذرا سا بھی اثر نہیں تھا۔

"شوہر کے پاس جا رہی ہو کیا؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے سنگِ سفید کی دیوار کو پکڑ لیا اور ہنسنے لگی۔ "آج رات میرا کوئی شوہر نہیں ہے۔"

دیمیطر لیس نے اپنے ہونٹ کاٹ کر، جھجکتے ہوئے کہا۔ "آج رات کسی شوہر کی تلاش بے سود ہے، بہت دیر ہو گئی، آس پاس کوئی نظر ہی نہیں آتا۔"

"تم سے یہ کس نے کہا کہ میں کسی کی تلاش میں ہوں۔ میں تنہا سیر کر رہی ہوں۔ مجھے کسی چیز کی تلاش نہیں ہے۔"

"تو تم آئی کہاں سے ہو؟ یقیناً تم نے یہ جواہرات کے زیور اپنے لئے نہیں پہنے ہوں گے اور پھر یہ ریشمی نقاب۔"

"تو کیا میں سر ننگی سیر کے لئے نکلوں؟ یا کسی کنیز کی طرح اونی کپڑے پہن کر؟"

"میں اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے لباس پہنتی ہوں، مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوتی ہے کہ میں قبول صورت ہوں اور چلتے چلتے خوش ہونے کے لئے میں اپنی انگوٹھیوں کو دیکھتی رہتی ہوں"

"تمہیں چاہیے کہ آئینہ لے کر سوائے اپنی آنکھوں کے اور کسی چیز کی طرف نہ دیکھو۔ یہ آنکھیں یقیناً سکندریہ کی نہیں ہیں۔ یہ حسین آنکھیں ۔۔۔ تم یہودن ہو؟ ۔۔۔ ہے نا؟ تمہاری آواز سے، جو ہم مصریوں کی آواز سے میٹھی ہے، یہی معلوم ہوتا ہے۔"

"میں یہودن نہیں، جلیلوی ہوں۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟ مریم؟ ۔۔۔ نعومی؟"

''میں تمہیں اپنا شامی نام نہیں بتاؤں گی' وہ ایک شاہانہ نام ہے' جسے تم لوگ نہیں جانتے' میرے دوست مجھے زرینہ کہہ کر پکارتے ہیں' اور تمہیں چاہیے تھا کہ میری تعریف کرتے اور یہی نام لے کر پکارتے۔''

اس نے نازنین کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

نازنین نے مذاق کے لہجے میں کہا ''نہیں! مجھے جانے دو' ان تماشوں کے لئے وقت نہیں رہا۔ بہت دیر ہو گئی' تین گھنٹے ہوئے نکلی تھی' اور اب تھک کر چور ہو چکی ہوں۔''

اس نے جھک کر اپنا ایک پاؤں پکڑ لیا اور دیمیطر لیس کو دکھا کر کہا۔ ''دیکھو' چمڑے کے تسموں سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے' بہت تنگ ہیں۔ اگر میں نے بہت جلد انہیں کھول نہ دیا تو پاؤں پر نشان پڑ جائیں گے اور جب یہی پاؤں چومے جائیں گے تو کیسے بُرے معلوم ہوں گے۔ بس مجھے جانے دو! آہ! کیا جھگڑا نکالا ہے تم نے۔ مجھے خبر ہوتی تو میں کھڑی کیوں ہوتی۔ دیکھو تو سہی' میرا زرد آنچل کمر کے پاس کیسا مسلا گیا ہے۔''

دیمیطر لیس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا' پھر اس آدمی کی طرح جو ذرا اپنے رتبے سے گر کر' کمال بے پروائی سے اپنے انتخاب کا اعلان کرتا ہے' اس نے کہا۔ ''تو چلو! راستہ دکھاؤ''

''لیکن میں نہیں چاہتی۔'' زرینہ نے اس طرح کہا گویا حیران ہو گئی ہے۔ ''تم نے تو اتنا بھی نہ پوچھا کہ میرے دل کی مرضی کیا ہے۔ اے واہ! یہ خوب رہی' ذرا سنو' چلو راستہ دکھاؤ' تم نے کیا مجھے کسی قحبہ خانہ کی معمولی کسبی سمجھا ہے جو حقیر رقم کے لئے' اپنے گاہک کی طرف دیکھے بنا' لیٹ جائے گی۔ تمہیں کیا پتہ میں پابند ہوں کہ نہیں؟ کیا تم میرا پیچھا کرتے رہے ہو؟ کیا تم نے دیکھا ہے کہ جب میں گزر رہی تھی' میرے لئے کتنے دروازے کھل گئے تھے' کیا تمہیں ان آدمیوں کی تعداد معلوم ہے جو اپنے آپ کو زرینہ کا محبوب تصور کرتے ہیں۔ واہ! ''چلو راستہ دکھاؤ''۔ کیوں نہ ہو! تمہیں دکھاتی راستہ! یہیں رہو یا بھاگ جاؤ' کھیلتے نظر آؤ' لیکن میرے مکان پر نہ آنا۔''

''تم نہیں جانتیں میں کون ہوں۔''

''خوب جانتی ہوں! تم دیمیطر لیس ہو۔ تم نے میری دیوی زہرہ کا بت بنایا

ہے۔ تم میری ملکہ کے محبوب ہو اور میرے شہر کے آقا، لیکن میری نظروں میں ایک قبول صورت غلام سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو کہ تم مجھے دیکھ چکے ہو اور میری محبت میں گرفتار ہو چکے ہو۔"

وہ نزدیک آگئی اور اس نے آرزو انگیز جوشیلے الفاظ میں کہنا شروع کیا۔ "ہاں تم میری محبت میں گرفتار ہو! بس چپ رہو، میں ایک لفظ نہیں سننا چاہتی'۔۔۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم عاشق نہیں معشوق ہو، تم "محبوب" ہو۔ "پیارے" ہو، تم "صنم" ہو۔ تمہی نے گلائی سرا کی دعوتِ محبت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، وہی گلائی سرا جو انٹیاکس کے عشق کو ٹھکرا چکی تھی۔ پھر دیموناسا جو اچھوتی رہنے کی قسم کھا چکی تھی، تمہارے بستر میں چپ چاپ دبک گئی اور تم سو رہے تھے، وہ تم سے جبراً لطفِ صحبت اٹھا لیتی، لیکن تمہارے حکم سے لیبیا کے غلاموں نے اسے اسی طرح، بالکل عریاں، اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ کیلستیون ۔۔۔۔۔۔ مشہور اور معروف کیلستیون جب تمہاری ملاقات سے مایوس ہو چکی تو اس نے تمہارے گھر کے سامنے گھر خرید لیا۔ اب ہر صبح اپنی کھڑکی میں اس طرح ننگی کھڑی ہو جاتی ہے جس طرح اور تیمس (۱) اپنے حمام میں۔ تم سمجھتے ہو مجھے یہ باتیں معلوم نہیں؟ کسبیاں ایک دوسرے سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھتیں۔ جس دن تم سکندریہ میں داخل ہوئے تھے اس دن تمہارا ذکر میں نے سنا تھا اور کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب تمہاری باتیں نہ ہوتی ہوں۔ میں وہ باتیں جانتی ہوں جو تم بھول چکے ہو اور وہ بھی جو تمہیں معلوم ہی نہیں ہوئیں۔ ابھی پرسوں کی بات ہے کہ بے چاری فلس نے تمہارے دروازے پر اپنے آپ کو پھانسی دے لی، خیر یہ بات تو فیشن میں داخل ہو گئی ہے۔ لایدی نے بھی یہی حرکت کی! آج شام میں نے اسے دیکھا تھا، چہرہ تمام نیلا ہو گیا تھا اور گالوں پر ابھی تک آنسوؤں کے نشان تھے۔ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ لایدی تھی کون۔ وہ غریب پندرہ سال کی بچی تھی، پچھلے مہینے اس کی ماں نے اسے ساموز کے ایک جہاز ساز کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا جو تھیبز کی طرف جاتے ہوئے ایک رات کے لئے سکندریہ اتر پڑا تھا۔ وہ مجھے ملنے آیا کرتی تھی اور میں اسے مشورہ دیا کرتی تھی۔ وہ کچھ جانتی ہی نہ تھی۔ جو اکھیلنا تک تو اسے آتا نہیں تھا۔ کئی بار وہ میرے ساتھ سوئی، کیونکہ جس رات اسے کوئی گاہک نہیں ملتا تھا اس رات اسے سونے کے لئے کوئی جگہ بھی نصیب نہ ہوتی تھی۔ اور اسے تم سے عشق تھا۔ کاش تم اسے اس وقت دیکھتے

جب اس نے تمہارا نام لے کر مجھے زور سے تھام رکھا تھا۔ وہ تمہیں خط لکھنا چاہتی تھی' سنتے ہو' میں نے اسے سمجھایا کہ یہ بات بالکل بے کار ہے۔"

دیمیطر لیس اس کی طرف گھورتا رہا اور منہ سے ایک لفظ نہ نکال سکا۔

زرینہ نے کہا ؛ "ہاں ان باتوں سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تمہیں اس سے عشق نہ تھا' تمہیں مجھ سے عشق ہے' تم نے سنا بھی نہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں' تم میری گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں دہرا سکو گے۔ تمہیں خیال ہے تو بس میری غلافی آنکھوں کا اور اس بات کا کہ میرے بالوں کو چھونا اور میرا منہ چومنا کیسا پُر لطف ہو گا ! کتنے آدمی ہیں جو اس مزے سے واقف ہو چکے ہیں۔ جس نے مجھے چاہا میں نے اسے اپنی من مانی بات کر لینے کی اجازت دے دی۔ مرد' لڑکے' بوڑھے' بچے' عورتیں' لڑکیاں۔۔۔ کسی کے سامنے میں نے انکار کیا ہی نہیں' سنتے ہو نا؟ دیمیطر لیس ! پچھلے سات سالوں میں صرف تین راتیں ایسی آئی ہیں کہ میں تنہا تھی۔ ذرا حساب تو کرو' عاشقوں کی کیا تعداد بنتی ہے ؟ ذرا شمار تو کرو۔ دو ہزار پانچ سو' اور اس سے بھی اوپر ! اور ابھی ان میں وہ گاہک شامل نہیں ہیں جو دن کو میرے پاس آتے تھے۔ پچھلے سال بیس ہزار آدمیوں کے مجمع میں ننگی ناچی تھی میں۔ اور میں جانتی ہوں کہ تم وہاں نہیں تھے' میں کسی سے کچھ کیوں چھپاؤں ! تمام عورتیں مجھے حمام میں' تمام مرد مجھے بسترِ عشرت پر عریاں دیکھ چکے ہیں' لیکن تم مجھے اس طرح کبھی نہ دیکھ سکو گے ! تمہیں' صرف تمہیں یہ نعمت نصیب نہ ہو گی۔ تمہاری کبھی نہ بنوں گی ! تمہیں کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ مجھ میں کیا کچھ ہے ؟ میں کیا ہوں' کیا سوچتی ہوں' کیا محسوس کرتی ہوں' میری محبت میرا حسن تمہارے لئے نہ ہو گا۔

تم اپنے آپ کو اللہ جانے کیا سمجھتے ہو ! تم سے گھن آتی ہے' تم ظلم کماتے ہو ! تمہارے جذبات مردہ ہو چکے ہیں' تم بزدل ہو ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب تک کسبیوں میں سے' ہم میں سے' کسی نے نفرت کے جوش میں تمہیں اور پھر تمہاری ملکہ کو مار کیوں نہیں ڈالا۔"

دیمیطر لیس نے بڑے اطمینان سے زرینہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا' اور وحشیانہ طور پر اسے پیچھے کی طرف جھکانا شروع کیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ ڈر گئی' لیکن اس نے اپنے زانوؤں اور کہنیوں کو اکڑا لیا اور پیچھے ہٹ کر آہستہ سے کہا "دیمیطر لیس مجھے

ذرا بھی خوف نہیں ہے ! اگر تم اطلس (۲) کے سپوت کی طرح طاقتور ہو جاؤ اور میں ایسی ہی کمزور ہو جاؤں جیسے ایک محبت کی ماری ہوئی کنواری، تو بھی تم جبراً میری صحبت کی لذت حاصل نہ کر سکو گے۔ تم صرف یہی نہیں چاہتے کہ تمہیں لذت حاصل ہو، تمہیں اس بات کی چیٹک زیادہ ہے کہ مجھے بھی لذت میسر ہو، اور تم چاہتے ہو کہ مجھے اچھی طرح دیکھو، سر سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک تم مجھے دیکھنا چاہتے ہو کہ تم سمجھتے ہو میں بڑی قبول صورت ہوں۔ اور واقعی میں ہوں بھی بڑی قبول صورت۔ دیکھو تو چاندنی کی روشنی اتنی بھی نہیں جتنی بارہ مومی شمعوں کی ہوتی ہے، یہاں تو خاصا اندھیرا ہے اور پھر میں اس مہتابی پر کپڑے اتار بھی کیسے سکتی ہوں، کیونکہ اپنی کنیز کی مدد کے بغیر پھر پہن نہ سکوں گی، مجھے اٹھنے دو، میرے بازو دکھنے لگے ہیں۔"

ایک لمحے کے لئے دونوں خاموش رہے۔ آخر دیمیطر لیس بولا۔ "بس، زرینہ تم خوب سمجھتی ہو کہ میں جبراً تم سے لذت یاب نہیں ہونا چاہتا، لیکن مجھے اس بات کی اجازت تو دو کہ تمہارے ساتھ چلوں، تم کتنی ہی مغرور کیوں نہ ہو، آج جو تم نے دیمیطر لیس کو ٹھکرا کر شانِ حسن دکھائی ہے، یہ تمہیں مہنگی پڑے گی۔"

زرینہ چپ تھی۔ دیمیطر لیس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "کس چیز سے ڈر رہی ہو تم؟"

"تمہیں اور طرح کی عورتوں سے محبت کرنے کا تجربہ ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے ہو کہ جو کسبی تمہیں پسند نہیں کرتی اس کی محبت خریدنے کے لئے تمہیں قیمت دینی پڑے گی۔"

وہ جھنجھلا گیا۔ "میں یہ تم سے کب کہتا ہوں کہ مجھ سے محبت کرو، محبوب بنتے بنتے میں اکتا گیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھ سے محبت کرے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تم اپنے کو بالکل میرے حوالے کر دو، بس، اس بات کے لئے تمہیں دنیا کا تمام سونا دینے کو تیار ہوں اور یہیں مصر میں میرے پاس جتنا چاہو سونا موجود ہے۔"

"اور سونا مجھے نہیں چاہیے، میرے بالوں میں دنیا جہان کا سونا موجود ہے، سونے کا ذکر سن سن کر میں اکتا گئی ہوں، میں تو تین چیزیں مانگتی ہوں۔ کہو دو گے؟"

دیمیطر لیس کو یوں محسوس ہوا گویا وہ ایسی چیزوں کی فرمائش کرنے والی ہے جن کا مہیا کرنا ناممکن ہے، اس نے فکر مندانہ انداز سے زرینہ کی طرف دیکھا، وہ

مسکرانے لگی اور آہستہ سے کہا' ایک تو مجھے شیشہ چاہیے' جس میں اپنی آنکھوں میں دیکھ سکوں۔"

"ملے گا' اور کیا؟ جلدی کہو!"

"پھر مجھے ایک کنگھی چاہیے' ہاتھی دانت کی' جس پر خوبصورت بیل بوٹے کھدے ہوں' جس طرح دھوپ میں چمکتے ہوئے پانی میں جال ڈالا جاتا ہے' اس طرح میں اسے اپنے بالوں میں پھیروں گی۔"

"اور تیسری چیز؟"

"کنگھی دلوادو گے؟"

"ہاں' ہاں چلو' کہہ بھی چکو۔"

"پھر مجھے موتیوں کا ہار چاہیے کہ جب میں اپنے حجرے میں تمہارے لئے اپنے وطن کے' بیاہ کے' ناچ ناچوں تو میرے گلے میں پڑا ہو۔"

اس نے بھنویں تان کر پوچھا۔ "بس؟"

"تو کیا ہار دلواؤ گے؟"

"جیسا کہو۔"

زرینہ کی آواز بہت نرم و محبت انگیز ہو گئی۔

"جیسا کہوں؟ بس میں بھی یہی چاہتی تھی کہ تم منہ سے ایسا کہہ دو' تمہاری اجازت ہے نا کہ میں اپنے تحفے خود پسند کر لوں؟"

"بے شک"

"قسم کھاتے ہو؟"

"قسم کھاتا ہوں۔"

"کس کی؟"

"جس کی تم کہو۔"

"تو اس دیوی کی قسم کھاؤ جس کا بت تم نے تراشا ہے۔ کھاؤ زہرہ کی قسم۔"

"قسم ہے زہرہ کی' زائیدۂ کفِ دریا کی جس کا بت میں نے تراشا ہے' آخر اس احتیاط کی کیا ضرورت ہے؟"

"بس! مجھے بڑی فکر تھی' لیکن اب خوش ہوں میں' تسلی ہو گئی۔"

اس نے اپنا سر اٹھایا۔ "تحفے چن لئے ہیں میں نے اپنے۔"
پھر دیمیطر لیس فکر مند ہو گیا۔ "چن بھی لئے؟"
"ہاں' تمہارا کیا خیال تھا کہ سمرنا کے کسی سوداگر' یا کسی ان جانی کسبی سے کوئی معمولی سا چاندی کا شیشہ خرید کر مجھے ٹال دو گے۔ میں تو وہ شیشہ لوں گی جو میری سہیلی بیقس کے پاس ہے۔ ان بی صاحبہ نے پہلے تو پچھلے ہفتے میرے ایک گاہک کو پھسلا لیا' اور پھر ایک بھرے جلسے میں جہاں رنگ رلیاں منائی جارہی تھیں' مجھے جلی کٹی سنائیں۔ طرفہ' موسارین اور کئی الٹرنا دانوں نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ بیقس کو یہ شیشہ پیارا بھی بہت ہے کیونکہ لوگ کہتے ہیں کبھی یہ روڈونس کے پاس ہوا کرتا تھا' جو لقمان کے ساتھ غلامی کی مصیبت بھگتا کرتا تھا' پھر سیفو کے بھائی نے اس غلام کو قیمت دے کر آزاد کروا دیا' کہتے ہیں سیفو نے اس شیشے کو برتا تھا' یہی تو وجہ ہے کہ بیقس کو یہ شیشہ اتنا پیارا ہے' اس سے بڑھ کر وہ اور کسی چیز کو نہیں سمجھتی' لیکن میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ اسے رکھتی کہاں ہے۔ جہاں پوجاپاٹ کرتی ہے نا! وہاں تیسرے پتھر کے نیچے اسے چھپا دیتی ہے۔ شام کو سیر کے لیے نکلتی ہے تو پہلے یہ شیشہ چھپا جاتی ہے' کل شام کے وقت اس کے گھر جاؤ اور ڈرنا بالکل نہیں' وہ اپنی کنیزیں اور غلام ساتھ لے جاتی ہے۔"
دیمیطر لیس نے چلا کر کہا۔ "واہ یہ تو پاگلوں والی باتیں ہیں' کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری خاطر سیند لگاؤں۔"
"تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟ میرا یہ خیال تھا بلکہ ہے' اور کیا تم نے قسم نہیں کھائی تھی؟ میرا خیال تھا کہ کھائی تھی' خیر اگر میں غلطی پر ہوں تو جانے دو۔"

اسے معلوم ہو گیا کہ زرینہ اسے برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی' لیکن اس نے کسی کشمکش کے بغیر قریباً قریباً اپنی مرضی سے سر تسلیم خم کر دیا۔ "جو کہتی ہو کروں گا۔"
"یہ تو میں جانتی ہوں لیکن تم کچھ جھجھک سے گئے تھے۔ اس کی وجہ بھی میں جانتی ہوں' یہ کوئی معمولی تحفہ نہیں ہے' کسی فلسفی سے میں یہ فرمائش نہ کرتی لیکن تم سے کرتی ہوں اور جانتی ہوں کہ تم اسے پورا کرو گے۔"
ایک لمحے کے لئے وہ اپنی گول پنکھیا کے طاؤسی پروں سے کھیلتی رہی' پھر ناگاہ کہنے لگی۔ "اور مجھے کوئی معمولی ہاتھی دانت کی کنگھی نہیں چاہیے' جو عام طور پر بازار میں

مل جاتی ہے،تم نے کہا تھا کہ میں اپنے تحفے خود پسند کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔تو سنو مجھے وہ کنگھی درکار ہے جو زہرہ کے سب سے بڑے پجاری کی بیوی اپنے بالوں میں پھیرتی ہے' یہ چیز روڈوفس کے شیشے سے بھی زیادہ قیمتی ہے' یہ دراصل ایک مصری ملکہ کی کنگھی ہے جو بڑی مدت ہوئی حکومت کرتی تھی۔ اس کا نام ایسا اوٹ پٹانگ سا ہے کہ میری زبان پر نہیں چڑھتا'اس کا ہاتھی دانت بہت پرانا ہو چکا ہے اور اس کا رنگ سونے کی طرح پیلا ہے۔

اس پر ایک بالی لڑکی کی تصویر کھدی ہوئی ہے جو ایک تالاب میں کنول کے ان پھولوں پر کھڑی ہے جو اس سے بھی بڑے ہیں'اور وہ خود پنجوں کے بل چل رہی ہے کہ پاؤں نہ بھیگ جائیں۔

یہ کنگھی بہت ہی خوبصورت ہے' یہ سوچ کر کہ مجھے مل جائے گی' میں اپنے آپ میں نہیں رہتی'اور کئی باتوں کی وجہ سے پجاری کی بیوی مجھے اچھی بھی معلوم نہیں ہوتی۔ ذرا دیکھو تو پچھلے مہینے میں نے دیوی کے لئے ایک نیلا دوپٹہ بھینٹ چڑھایا تھا اور دوسرے دن ہی یہ دوپٹہ پجاری کی بیوی کے سر پر دیکھا' اتنی جلدی ! بس یہ۔۔۔ مجھے یہ بات بڑی بری معلوم ہوئی۔ اس کنگھی کے ذریعے میں اس سے بدلہ لوں گی۔"

دیمیطر لیس نے پوچھا۔ "یہ کنگھی ہاتھ کس طرح لگے گی؟"

"یہ ٹیڑھی کھیر ہے' تم جانتے ہو وہ مصری ہے اور اس قوم کی عورتوں کی طرح وہ بھی پورے سال کے بعد گندھوانے کے لئے اپنی دو سو مینڈھیاں کھولتی ہے' لیکن کنگھی مجھے کل چاہیے۔ تو بس اب یہی ہو سکتا ہے کہ اسے مار ڈالو ! تم نے قسم کھائی تھی !"

اس نے دیمیطر لیس کی طرف دیکھ کر منہ چڑایا' وہ اپنے پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زرینہ نے جلدی سے کہا "اور میں نے اپنا ہار بھی پسند کر لیا ہے' مجھے وہ ست لڑا ہار چاہیے'جو دیوی زہرہ کے گلے میں پڑا ہے۔"

دیمیطر لیس مضطرب ہو کر چونک پڑا۔ "یہ ناممکن ہے۔ واہ ! کیا تم سمجھتی ہو کہ ساری عمر مجھے بہلاتی ہی رہو گی۔ میں تمہیں کچھ بھی لا کر نہیں دوں گا' نہ شیشہ نہ کنگھی نہ ہار' کچھ بھی نہیں۔"

زرینہ نے اپنی انگلیاں اس کے لبوں پر رکھ دیں اور اپنی رس بھری آواز میں

کہا۔ ”یوں نہ کہو ! تم خوب جانتے ہو کہ تم مجھے ہار بھی لا کر دو گے ‘ مجھے یقین ہے کہ تحفے مجھے ملیں گے ‘ کل رات تم میرے پاس آؤ گے ‘ اور پھر دوسری رات بھی اور اگر تمہارا جی چاہے تو ہر رات جس وقت تم چاہو میں گھر ہی رہوں گی۔ جو لباس تمہیں بھائے گا وہی پہنوں گی ‘ جیسا سنگھار کہو گے ویسا کروں گی ‘ جیسے بال کہو گے ‘ ویسے بناؤں گی ‘ جو کہو گے مانوں گی ‘ جو آرزو تمہارے دل میں پیدا ہو گی پوری کروں گی ‘ جب تم پیار کی تلاش میں میرے ہاں آؤ گے تو بچے کی طرح تمہیں سینے سے لپٹا رکھوں گی ‘ اگر تم ان سنی لذتوں کے پیاسے ہو گے تو تمہاری پیاس بجھادوں گی ‘ مجھے کتنا ہی دکھ کیوں نہ ہو ‘ اگر تم خاموشی کے لئے آؤ گے تو میں گونگی ہو جاؤں گی ‘ اور جب تم مجھے گانے کے لئے کہو گے ‘ تو بس سنو گے ہی تو پتہ لگے گا ‘ میرے پیارے ! مجھے ہر سرزمین کے گیت ازبر ہیں ‘ میں وہ گیت گا سکتی ہوں جو چھوٹی چھوٹی ندیوں میں بہتے ہوئے پانی کی طرح میٹھے اور ہلکے پھلکے ہوں اور وہ بھی جو قریب آتے ہوئے کڑکتے ہوئے بادلوں کی طرح خوفناک ہوں ‘ مجھے کچھ ایسے معصوم اور تازہ گیت بھی یاد ہیں کہ کنواری لڑکیاں اپنی ماؤں کے سامنے گا سکتی ہیں اور پھر ایسے گیت بھی جو لمپاسکس (۳) میں نہ گائے جا سکیں ‘ ایسے ترانے کہ ایلی فانتس (۴) کو سن کی شرم آئے ‘ میں بھی یہ گیت صرف تمہارے کان میں سنا سکتی ہوں ‘ جب تم مجھے ناچنے کے لئے کہو گے تو شام سے صبح تک ناچتی رہوں گی ‘ اپنے دامن دار لباس میں ملبوس ‘ یا ایک باریک دوپٹہ اوڑھ کر کہ اس میں سے آر پار دکھائی دیتا ہو ‘ کیا میں نے وعدہ کیا ہے کہ تمہارے سامنے ننگی ناچوں گی ؟ اگر تم کہو تو میں ایسا بھی کرنے کے لئے تیار ہوں ‘ ننگی اور پھولوں کے زیور پہنے ‘ جوڑے میں پھول گوندھے یا ننگی ‘ کسی دیوی کے مقدس بت کی طرح بنی ٹھنی ‘ ادھر اُدھر بال پیرتے ہوئے۔ تم دیکھو گے میں پنجوں کے بل ناچ سکتی ہوں ‘ غالیچے پر پڑے پڑے بھی ناچ سکتی ہوں ‘ میں زہرہ کے تمام ناچ جو استرتی اور یورینیا (۵) کے سامنے ناچے جاتے ہیں ‘ جانتی ہوں۔ میں وہ ناچ ناچوں گی کہ آج تک کسی کو جرأت نہ ہو سکی تھی۔ تمہارے لئے محبت اور لذت کے تمام ناچ ناچوں گی اور جب میرا ناچ ختم ہو جائے گا تو پھر ۔۔۔ پھر سب کچھ شروع ہو گا ‘ تم دیکھو گے ‘ ملکہ مجھ سے زیادہ دولت والی ہے لیکن اس کے محل میں میرے حجلے کی طرح محبت کو بھڑکانے والا ‘ عشق کو مہکانے والا ایک کمرہ بھی نہیں ہے ‘ وہاں ایسی خوبصورت چیزیں ہیں کہ ان کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں ہیں ‘ اور

ایسی ایسی عجیب کہ ان کا نام رکھا ہی نہیں جا سکتا' اور وہاں سب سے زیادہ عجیب ایک چیز ہو گی 'زرینہ۔۔۔ جس سے تم محبت کرتے ہو' لیکن جسے تم جانتے نہیں۔ تم نے ابھی تو صرف میرا چہرا دیکھا ہے' تمہیں کیا معلوم میں کتنی خوبصورت ہوں۔ تمہاری گھات میں کیسے کیسے حیران کر دینے والے واقعات بیٹھے ہیں' تم میری گود میں کس کس طرح کانپو گے اور کس کس طرح میرے کانپتے ہوئے جسم پر گر کر غش کر جاؤ گے' میرے بوسے' میرا چہرہ' کیسی لذت !"

دیمیطر لیس یوں دیکھ رہا تھا گویا بالکل کھو گیا ہو۔

زرینہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "اور تم مجھے چاندی کا معمولی سا پرانا شیشہ بھی نہیں دیتے' اور میں تمہیں کیا دے رہی ہوں' اپنے بال' جو سونے کے جنگل کی طرح ہیں' یہ بال تمہارے دونوں ہاتھوں کے درمیان ہوں گے۔"

دیمیطر لیس نے ہاتھ بڑھا کر بالوں کو چھونا چاہا۔

"کل !"

اس نے آہستہ سے کہا۔ "دوں گا۔"

"اور تم مجھے ایک معمولی ہاتھی دانت کی کنگھی نہیں دیتے' حالانکہ انعام اس کا یہ ہو گا کہ میری بانہیں' جو ہاتھی دانت کی طرح ہیں تمہاری گردن میں ہوں گی۔"

اس نے زرینہ کی بانہوں کو چھونا چاہا۔

"کل"

"لاؤں گا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

زرینہ نے کہا۔ "میں جانتی ہوں' اور تم میرے لئے وہ موتیوں کا ست لڑا ہار بھی لاؤ گے جو دیوی کی گردن میں پڑا ہے' اور اس کے بدلے میں تمہیں اپنا بدن بیچ دوں گی۔ جو اس سیپی کی طرح ہے جس کا منہ ابھی سارا نہیں کھلا' اور بوسے تو اتنے دوں گی کہ سمندر میں اتنے موتی بھی نہ ہوں گے۔"

التجا کے انداز میں' بھک منگوں کی طرح' دیمیطر لیس نے اپنا منہ اونچا کیا' زرینہ نے اس کی طرف اپنی تابناک آنکھوں سے دیکھا اور اپنا آرزو انگیز منہ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ بہت دور نکل گئی تھی' ایک زرد سا سایہ

اس کے لرزاں دوپٹے کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ شہر کی طرف روانہ ہوا' اس کا سر نا قابلِ بیان ندامت کے بوجھ سے جھکا ہوا تھا۔

حوالہ جات

(۱) ارتیمس ؛ فطرت اور اس کی قوتِ نمو کی دیوی، جس نے ایک صحت مند، قوی اور جذبات پرور اچھوتی کاروپ دھارا تھا۔

(۲) اطلس ؛ شہ زور جوان، جس کے کاندھوں پر دنیا قائم ہے۔ جب ایک کاندھے سے دنیا کو دوسرے کاندھے پر بدلتا ہے تو زلزلے آتے ہیں۔ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است!!

(۳) لمپاسکس ؛ ایشیائے کوچک کا ایک قدیم شہر، مے نوشی، سیاہ کاری، حسن پرستی، ہوس رانی اور عشرت آفرینی کا مرکز۔

(۴) ایلی فائنس، ایک یونانی شاعرہ، دریائے نیل میں ایک جزیرہ واقع تھا، اس کا بھی یہی نام بعض اربابِ لغت نے دیا ہے۔ یہاں شاعرہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۵) یورنیا ؛ سات مشہور ہستیوں میں سے ایک۔(Muses) علم نجوم والسماوات کے متعلق استرتی زہرہ کا لقب۔ زوس کی لڑکی، عذرائے نجمی بھی اسی کا لقب ہے۔

چھٹا باب

اچھوتیاں

نگوڑی چاہت کو کیوں سمیٹا غضب کے جھکجھورے جھیلنے کو
دوگانہ پڑ جائے پٹکی الیٹی تمہاری اٹھکیل کھیلنے کو
نصیب جاگیں گے بیگماجیؒ تو میں بھی ایک رتجگا کروں گی
ابھی تو انشاء کے ساتھ سے یاں پڑے ہیں پاپڑ سے بیلنے کو

سطحِ بحر پر ایک دھندلی سی صبح ہوئی' اور دنیا پر یاسِ کبود کے رنگ کے چھینٹے دے دیئے گئے' چاند کے نور کے ساتھ ہی مینارِ نور کے بھڑکتے ہوئے شعلے بھی بجھ گئے' بنفشی لہروں میں زرد رنگ کے پراسرار خطوطِ نور جادوگرنیوں کے چہروں کی طرح چمک رہے تھے' اور ارغوانی خسِ دریائی گویا ان کے بال تھے' ناگاہاں دن چڑھا!

ساحلِ بحر سنسان تھا' نمودِ صبحِ اول سے پہلے کچھ ساعتیں تاریکی کی آتی ہیں' جن سے دنیا کی نیند منور ہوتی ہے' اور جن میں انسانوں کو صبح کے کیف آور خواب آتے ہیں' شہر ان ساعتوں کے چنگل میں گرفتار' نیند میں بے ہوش تھا' خاموشی کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔

لمبی لمبی کشتیاں ساحل کے ساتھ بندھی ہوئیں' متوازی چپوؤں کی قطاروں کی وجہ سے سوئے ہوئے پرندوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں' بازاروں کے خطوطِ تعمیری دور تک پھیلے ہوئے تھے اور پس منظر میں کوئی گاڑی گھوڑا' غلام نہ تھا' جس سے

خطوط کی یہ ہم آہنگی ضائع ہو جاتی۔ سکندریہ پر عظیم و جلیل خاموشی مسلط تھی' گویا کسی پرانے شہر کا عکس ہو' جو صدیوں سے ویران چلا آتا ہے۔ ناگاہ زمین پر سبک رفتار قدم پڑنے کی آواز پیدا ہوئی اور دو لڑکیاں نظر آئیں' ایک کے لباس کا رنگ زرد تھا' دوسری کا نیلا۔ دونوں نے "اچھوتیوں کی پیٹی" کو لہوں تک کس کی باندھی تھی' اور ان پیٹیوں کا بند کمر سے بہت نیچے تھا۔ ایک تو وہی تھی جسے ہم ساحلی مہتابی پر گاتے سن چکے ہیں' دوسری بنسی بجانے والیوں میں سے ایک تھی۔ بنسی بجانے والی اپنی سہیلی سے کم عمر بھی تھی اور قبول صورت بھی۔ اس کی غلافی انکھیں جن کی نیل گونیاں عبا کے کبودی رنگ سے ذرا ہلکی تھیں' گویا مسکرا سی رہی تھیں۔ اس کے کندھے پر پھولوں کی کمان تھی جس کے سہارے اس کی نازک بنسیاں لٹک رہی تھیں' اس نے اپنی گول گول پنڈلیوں کے گرد پیل گوش کے دوہرے دوہرے ہار لپیٹے ہوئے تھے جو اس کی تنگ قبا کے باریک کپڑے میں سے جھلک رہے تھے' اور ٹخنوں کے پاس' چاندی کی گھنڈیوں سے بندھے ہوئے تھے۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "مرطس! کیوں کڑھتی ہے؟"

"چل وہ دو لوحیں گم ہو گئیں ------ تجھے یہ بات تو کبھی نہیں بھول سکتی نا کہ مجھے تجھ سے محبت ہے۔ کیا تجھے یقین آتا ہے کہ میں تجھے تنہا چھوڑ کر چلی جاؤں گی کہ تو لوح پر میں نے جو لکھا تھا' وہ پڑھ پڑھ کر کڑھا کرے۔ نٹ کھٹ لڑکی' ایسا نہیں ہو سکتا' کیا تو نے مجھے بھی ویسی ہی دوگانہ (۱) سمجھا ہے جو اپنی دوگانہ کا نام ناخن پر لکھ رکھتی ہے۔ جہاں ناخن بڑھا' اور نام غائب ہوا' وہ بھی کسی اور کی بغل گرم کرنے گئی۔ تو میری نشانی لے کر کیا کرے گی' میں جیتی جاگتی جو تیرے پاس ہوں' اور تیری ہوں۔ ابھی میرے بیاہ کے دن بھی تو نہیں ہیں۔ اور پھر بھی آج سے کئی سال پہلے تجھے دیکھا تھا' یاد ہے تجھے! پہلے پہل کہاں ملی تھیں ہم؟ --- حمام میں --- اماں مجھے بغلوں میں ہاتھ دے کر ہلا رہی تھیں اور تیری اماں بھی اسی طرح کر رہی تھیں۔ پھر کپڑے پہنے تھے۔ اس وقت سے ہم ایک جگہ رہی ہیں اور اس واقعہ کے پانچ سال بعد ہمیں ایک دوسرے سے محبت بھی ہو گئی تھی۔"

مرطس نے کہا۔ "رہوڈس! پہلا دن ایک اور بھی تھا' جب تو نے اس لوح پر ہم دونوں کا نام لکھا تھا' بس وہی پہلا دن تھا' ہائے پھر وہ دن نہ آئے گا۔ خیر' کیا ہوا'

میرے لئے ہر دن نیا ہے اور جب تو شام کو اٹھتی ہے اور میں تجھے دیکھتی ہوں تو ایسا ہی سوچتی ہوں کہ اس سے پہلے شاید تجھے کبھی نہیں دیکھا' میں تو سمجھتی ہوں کہ عورت ہے ہی نہیں تو۔۔۔ تو جل پری ہے' جب اپالو کا چشمہ خشک ہو گیا تو تُو آر کیڈیا کے بنوں سے بھاگ آئی' تیرا جسم زیتون کی ٹہنی کی طرح لچک دار ہے اور تیری جلد بہار کے بہتے پانی کی طرح نرم' تیری پنڈلیوں میں پیل گوش کے ہار رہتے ہیں اور کنول تجھے ایسا ہی سجتا ہے جس طرح استرتی کو انجیر۔ تیرے پیدا ہونے سے پہلے بھلا تیری ماں کسی ایسے بَن میں جا کر تو نہیں سو گئی تھی جہاں دیوتا رہتے ہوں' کہیں آوارہ دیوتا پین (۲) یا کسی اور دریائی دیوتا نے لپک کر تیری ماں کو اپنے گلے سے تو نہیں لگا لیا تھا۔

آ افریقہ کے اس تپتے ہوئے سورج کی گرمی سے بچ نکلیں' چل مجھے اپنے چشمے کے پاس لے چل۔

سوفس اور فینیس کے اس پار' گھنے سایہ دار جنگلوں میں جہاں نرم زمین پر دیووں اور پریوں کے پاؤں کے نشان صاف صاف دکھائی دیں۔ وہاں تو ایک صاف چمکتا ہوا پتھر ڈھونڈ کر اس پر وہی چھ لفظ کھود ڈال جو تو نے لوح کی لاکھ پر لکھے تھے' اور جن کو یاد کر کے مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے ! کیا کہوں ؟۔۔۔۔۔۔ روڈس' سن مجھے قسم ہے' زہرہ کی پیٹی کی' جس پر تمام آرزوؤں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں' مجھ پر تمام آرزوئیں حرام ہیں' کیونکہ میرے من کی رانی تو ہی ہے اور کچھ اس سے بھی زیادہ مجھے قسم ہے امالتھیا کے سینگوں کی' جس میں سے دنیا کے سکھ پیدا ہوتے ہیں کہ مجھے دنیا کی پرواہی نہیں رہی کیونکہ میرے لئے دنیا کے تمام سکھ تجھی میں ہیں' تجھے دیکھتی ہوں اور پھر اپنے آپ پر نظر ڈالتی ہوں تو دنگ رہ جاتی ہوں کہ تو اور مجھ سے پیار کرے ؟ تیرے بال گیہوں کی پکی ہوئی بالیوں کی طرح ہیں اور میرے کالی بھیڑ کی اون کی طرح ! تیری جلد چرواہوں کے پنیر کی طرح سفید ہے' میری ساحل کی ریت کی طرح سنولائی ہوئی' تیری چھاتیاں ایسی نرم اور رسیلی ہیں جس طرح خزاں میں سنگترے کا درخت' میری ایسی بے گوشت اور بے رس ہیں جس طرح پہاڑوں پر صنوبر کا درخت۔ اگر میرے منہ پر رونق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے تجھ سے پیار ہے۔ آہ روڈس' تو جانتی ہے کہ میری جگ سے نرالی اچھوتی جوانی' ایسی ہے جیسے دیوتا پین اپنے لبوں میں موردانہ کے پتے لئے چبا رہا ہو اور تیری جوانی چھوٹے بچے کے منہ کی طرح گلابی اور نازک ہے' مجھے

پتہ نہیں کہ تو مجھ سے کیوں محبت کرتی ہے' لیکن یہ میں جانتی ہوں کہ اگر تو نے کسی دن مجھ سے پیار کرنا چھوڑ دیا اور اپنی بہن تھیانو کی طرح جو تیرے ساتھ بنسی بجاتی ہے' کبھی کسی ایسے گھر میں رات رہنے کے لئے ٹھہر گئی جہاں ہمیں گانے بجانے کے لئے بلایا گیا ہو' تو بس اس رات مجھے اکیلی گھر واپس جانے کا خیال تک بھی نہ آئے گا۔ جب تو واپس آئے گی تو میں نے اپنی پیٹی کا پھندا بنا کر اپنے آپ کو پھانسی دے لی ہو گی۔"

روڈس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ان دکھ بھری پاگل پنے کی تصویروں کا خیال کر کے وہ مسکرانے لگی۔

اس نے اپنا پاؤں ایک پتھر پر رکھ کر کہا "پھولوں کی وجہ سے چلا نہیں جاتا' پیاری مرطس اتار دو انہیں۔"

"بس آج رات اور ناچوں گی۔"

گانے والی نے چونک کر کہا۔ "ہاں مجھے تو ان مردوں اور لڑکیوں کا خیال ہی نہ رہا تھا۔ انہوں نے تم دونوں بہنوں کو کیسے کیسے ناچ نچائے ہیں' تجھے تو وہ کوسیائی پشواز پہنائی تھی جو پانی کی طرح شفاف تھی اور تیری بہن تو بالکل ننگی تھی' اگر میں تیری مدد نہ کرتی تو جس طرح کل رات اپنے کمرے میں بد معاشوں نے تیری بہن کے ساتھ کسبیوں والا سلوک کیا تھا' تیرا بھی وہی حشر ہوتا' کیسی بری بات تھی' کیسی خوفناک' تجھے یاد ہے وہ کس طرح روتی تھی اور چلاتی تھی' مرد کی محبت بھی کیسی نرالی ہے۔"

اس نے جھک کر پہلے ہار اتارا پھر اوپر کے تین پھول علیحدہ کئے اور جہاں جہاں پھول کی جگہ تھی وہاں بوسہ لے لیا۔ جب وہ کھڑی ہوئی تو بنسی بجانے والی کمسن نازنین نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال لیا اور اس کے بوسوں کی لذت سے گویا غش کھا گئی۔

پھر بولی۔ "مرطس! کیا تجھے ان بد معاشوں پر بھی رشک آتا ہے' کیا ہوا کہ انہوں نے مجھے دیکھ لیا' تھیانو ان کے لئے کافی تھی' اسی لئے میں اسے چھوڑ آئی تھی' ان کے پاس۔ مرطس' پیاری فکر نہ کر وہ مجھ پر کبھی قابو نہ پا سکیں گے۔"

"رشک؟ میں ان تمام چیزوں سے جلتی ہوں جو تیرے پاس ہوتی ہیں۔ تو کپڑوں کا جوڑا اتارتی ہے تو میں پہن لیتی ہوں کہ اکیلا وہ جوڑا ہی اس بات کا فخر نہ کرے کہ تیرے بدن کو چھو چکا ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں چاہتی کہ پھول ایسی محبت سے تیرے بدن کے ساتھ لگے رہیں' اس لئے اتار کر ذلیل کسبیوں کو دے دیتی ہوں کہ رنگ

رلیوں میں برت لیں' میں نے تجھے کوئی تحفہ بھی اس لئے نہیں دیا کہ تجھے پیارا نہ ہو جائے' جس چیز کی طرف تو دیکھتی ہے اس سے جلتی ہوں' میرا دل تو یہی چاہتا ہے کہ تو اور میں بند ی خانے میں ہوں' بس تو اور میں' اور میں تجھے اس طرح اپنا بنالوں' اپنی بانہوں میں اس طرح چھپا چھپا کر رکھوں کہ کسی کو پتہ نہ ملے تو کہاں گئی۔ میں چاہتی ہوں کہ میں وہ پھل بن جاؤں جو تو کھاتی ہے' وہ عطر بن جاؤں جو تو لگاتی ہے میں وہ نیند بن جاؤں جو چپ چاپ تیری آنکھوں میں آتی ہے' وہ محبت بن جاؤں جو تجھے بے تاب بناتی ہے' مجھے اس لذت پر بھی رشک آتا ہے جو تو مجھ سے حاصل کرتی ہے اور پھر یہ بھی جی چاہتا ہے کہ جو لذت میں تجھ سے حاصل کرتی ہوں وہ بھی تجھی کو دے دوں' ان باتوں سے جلتی ہوں' ان عورتوں پر مجھے رشک نہیں آتا جو رات بھر کے لئے تیری دوگانہ بنتی ہیں' کیونکہ ان کی مدد سے تو میں تیری کھولتی ہوئی کم عمری کی آرزوؤں کو پورا کرتی ہوں' باقی رہے مرد عاشق' تو مجھے پتہ ہے کہ تو ان کی پروا نہیں کرتی' ان سے کبھی پیار نہ کر سکے گی تو۔ تو خوب جانتی ہے کہ وہ کیسے وحشی اور بے وفا ہوتے ہیں۔"

روڈس نے تہ دل سے کہا۔ "کبھی نہیں' مردوں سے محبت کرنے کی بجائے تو میں ناسیتھو کی طرح تھاسوس کے دیوتا پریاپس پر اپنی اچھوتی جوانی قربان کر دوں گی۔ لیکن پیاری آج نہیں' ناچ ناچ کر تھک گئی ہوں' گھر جانا چاہتی ہوں' ادھر لاؤ اپنا بازو۔"

پھر اس نے مسکرا کر کہا۔ "ہم تھیانو کو بتادیں گے کہ اب سے وہ ہمارے بستر پر ہمارے ساتھ نہیں لیٹ سکتی' دروازے کے دائیں طرف اس کے لئے علیحدہ بستر بچھادیں گے' آج رات جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد مجھ سے تو یہ نہ ہو گا کہ اس کا منہ چوم سکوں' مرطس بڑی خوفناک بات تھی' کیا مرد اسی طرح محبت کرتے ہیں؟ کیا اسی کا نام محبت ہے؟"

"ہاں۔"

"لیکن یہ غلط ہے' مرطس' وہ نہیں جانتے محبت کسے کہتے ہیں۔"

مرطس نے روڈس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں' دونوں چپ ہو گئیں۔ ہوا سے دونوں کے بال اڑ اڑ کر مل گئے۔

حوالہ جات

(۱) دوگانہ ؛ انگریزی میں جو لفظ تھا اس کا لغوی ترجمہ، خواہرِ بستر ہو سکتا ہے، لیکن دوگانہ کا لفظ ہماری زبان میں اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے موجود تھا، اس لئے اختیار کیا گیا۔

(۲) پین ؛ فطرت اور اس کی قوتِ نامیہ کا مظہر، عشق باز۔

ساتواں باب

زرینہ کے بال

نہ کر ان سے ملنے کی اے دل ہوس
کہاں خس، کہاں شعلۂ بر قتاب!
وہ بہکی ہوئی چال بے باک و مست
وہ مہکے ہوئے گیسوئے مشکناب!

"دیکھنا!" روڈس نے کہا، "کوئی آرہا ہے اس طرف۔"
گانے والی نے دیکھا تو کوئی ساحلی مہتابی پر تیز تیز چل رہا تھا۔
روڈس نے کہا: "میں اسے پہچانتی ہوں' یہ زرینہ ہے' وہی اپنی زرد عبا پہنے ہے۔"
"کیا اتنی جلدی کپڑے پہن کر تیار بھی ہو گئی؟"
"پتہ نہیں آج اس جلدی کی کیا وجہ ہے؟ عام طور پر تو شام کو سیر کے لئے نکلتی ہے' ابھی تو سورج بھی نہیں نکلا' کچھ بات ہو گئی' اور بات بھی کوئی اچھی ہو گی' بڑی نصیبے والی ہے زرینہ۔"
دونوں اس کے پاس گئیں اور کہا۔ "تم پر سلام ہو زرینہ۔"
"اور تم پر بھی۔ کہو کب سے یہاں ہو؟"
"ٹھیک پتہ نہیں' جب آئی تھیں تو دن چڑھ چکا تھا۔"

''تو کیا مہتابی پر اور کوئی نہیں تھا؟''

''کوئی نہیں۔''

''بالکل کوئی نہیں؟''

''کوئی نہیں۔''

''کوئی مرد نہیں تھا۔ کیا ٹھیک یقین ہے تم کو؟''

''بالکل۔ کیوں پوچھتی ہو تم؟''

زرینہ نے جواب نہ دیا اور روڈس نے سلسلۂ کلام جاری رکھ کر کہا۔ ''کیا کسی کی راہ دیکھ رہی تھیں تم؟''

''ہاں شاید' خیر اچھا ہوا' اس سے ملاقات نہ ہو سکی' غلطی میری ہی تھی کہ واپس آ گئی' لیکن رک بھی سکتی تھی' بہتیرا دل کو سنبھالا۔''

''کیا بات ہوئی ہے زرینہ؟ ہمیں نہ بتاؤ گی؟''

''نہیں تم سے کہنے والی بات نہیں ہے۔''

''ہم سے بھی نہیں' ہم تو تمہاری گوئیاں ہیں۔''

''آخر تمہیں پتہ لگ جائے گا اور ساتھ ہی سارے شہر کو بھی۔''

''واہ! یہ خوب خاطر ہوئی ہماری۔''

''اچھا' تو شہر میں یہ بات پھیلنے سے ذرا پہلے تمہیں بتا دوں گی' لیکن آج نہیں۔ عجیب عجیب باتیں ہو رہی ہیں' میری بچیو' میں تو مری جاتی ہوں کہ تمہیں بتاؤں' لیکن مناسب نہیں' کیا گھر جا رہی تھیں' آؤ میرے ساتھ چلو' میں اکیلی ہوں' میرے ساتھ سونا۔''

''نہیں زرینہ' بہت تھک گئیں ہیں ہم۔ ہم گھر تو جا رہی تھیں' لیکن سو جانے کے لئے۔''

''پھر سو لینا' آج تو زہرہ کے میلے کی رات ہے' آرام کرنے کا دن تھوڑا ہی ہے' اگر چاہتی ہو کہ دیوی تمہاری حفاظت کرے اور سال بھر خوش رکھے تو مندر میں اس طرح جانا کہ آنکھوں کے پپوٹے بنفشی ہوں' اور گال سوسن کی طرح زرد' میرے ساتھ آؤ' ایسا ہی ہو جائے گا۔''

''زرینہ نے ان کی کمر میں اپنی بانہیں ڈال کی ہاتھوں میں ان کی قریباً عریاں'

ہلکی پھلکی چھاتیاں لے لیں اور انہیں لئے ہوئے تیزی سے چلی گئی۔

اس دوران میں روڈس اپنے سوالات پر مصر تھی۔

''اچھا یہ کہو' جب بستر پر لیٹیں گی تب بتاؤ گی کیا بات ہوئی ہے' اور تمہیں کس چیز کا انتظار ہے۔''

''ہوں' باتیں تو کئی بتاؤں گی' جتنی چاہو سن لو' لیکن جو تم پوچھ رہی ہو اس کا جواب ابھی نہیں ملے گا اور کل تمہیں معلوم ہو ہی جائے گا۔ بس کل تک ٹھہرو۔''

''کل کیا تمہیں بڑی خوشی ہو گی' یا شان بڑھ جائے گی؟''

''شان بڑھ جائے گی۔''

روڈس کی آنکھیں حیرت میں کھلی کی کھلی رہ گئیں' اور اس نے بلند آواز میں کہا ۔''تو پھر تم ملکہ کے ساتھ اس کی دوگانہ بن کر سوؤ گی؟''

زرینہ نے ہنس کر کہا۔''نہیں لیکن میری شان میری طاقت ویسی ہی ہو جائے گی۔''

''بولو کیا چاہتی ہو؟ ہے میری ضرورت تمہیں؟''

''ہاں' ہاں۔''

بنسی بجانے والی نازنین کچھ فکر مند سی ہو گئی۔

زرینہ نے پوچھا۔''اچھا کہو' کیا چاہتی ہو؟''

''ناممکن سی بات' اور تم سے یہ بات کیوں کہوں؟''

مرطس نے اپنی گوئیاں کا مطلب بیان کیا۔''ہمارے وطن آفیسیس میں دستور ہے کہ بالغ ہونے کے بعد اگر دو کنواری لڑکیوں میں محبت ہو جائے' (جس طرح ہم دونوں کو ہو گئی ہے) تو قانون انہیں شادی کر لینے کی اجازت دیتا ہے' وہ دونوں ایتھنا کے مندر میں اپنی دوہری پیٹی بھینٹ چڑھاتی ہیں' پھر افینیو کی خانقاہ میں جا کر اپنے بالوں کی ایک ایک لٹ یک جا گوندھ کر قربان کرتی ہیں اور آخر ڈیناسوس کے پاس پہنچتی ہیں ۔وہاں دونوں میں سے جو زیادہ مضبوط ہوتی ہے' اسے ایک تیز سونے کا چاقو دیا جاتا ہے اور خون پونچھنے کے لئے سفید کپڑے کا ایک ٹکڑا۔ اس رات جو گوئیاں بیوی بنتی ہے' اسے پھولوں کی رتھ میں' اپنے خاوند اور مندر کے مہتمم کے درمیان بٹھا کر گھر لے جاتے ہیں' آگے آگے لوگ مشعلیں لئے چلتے ہیں' بنسی بجانے والیاں گیت گاتی جاتی

ہیں، اور اس کے بعد ان کو بیاہتا جوڑوں کے تمام حق مل جاتے ہیں، ان کا جی چاہے تو چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو منہ بولی بیٹیاں بنا سکتی ہیں، لوگ ان کی بڑی عزت کرتے ہیں، ان کا خاندان بن جاتا ہے، اس چیز کا خواب دیکھ رہی ہے روڈس ! لیکن یہاں تو یہ قانون نہیں ہے۔"

زرینہ نے بآوازِ بلند کہا۔ "تو قانون بدل دیا جائے گا۔ اور تمہاری شادی ضرور ہو گی، میں ذمہ لیتی ہوں۔"

کمسن نازنین کا رنگ مسرت سے سرخ ہو گیا، اس نے پوچھا۔ "سچ مچ یہ کام کر دو گی ؟"

"ہاں، اور یہ پوچھنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ تم میں سے شوہر کون ہے اور بیوی کون ؟ میں جانتی ہوں کہ مرطس میں وہ سب باتیں موجود ہیں جن کے بغیر یہ کھیل نہیں کھیلا جا سکتا، روڈس بھئی بڑی خوش نصیب ہو تم، ایسی گوئیاں ذرا کم ملتی ہے۔"

اب وہ دروازے کے پاس جا پہنچی تھیں، دہلیز پر جلوہ بیٹھی کتان بن رہی تھی، اس نے اٹھ کر ان کو راستہ دیا اور ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔

فوراً ہی بنسی بجانے والیوں نے اپنے سادہ کپڑے اتار دیئے، دونوں نے سنگِ سبز کے طشت میں بیٹھ کر، ایک دوسری کی مدد سے خوب مل مل کر نہایا، پانی بہہ بہہ کر حمام میں داخل ہو جاتا تھا، پھر وہ بستر میں جا لیٹیں۔

زرینہ ان کی طرف دیکھ رہی تھی، لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے ایوانِ تصور میں دیمیطر لیس کا بیان، اس کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف، نغموں کی صدائے بازگشت کی طرح گونج رہا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ لگا کہ جلوہ نے چپ چاپ اس کا لباز عفرانی نقاب گھنڈیاں کھول کر اتار دیا ہے، اس کا کمر بند کھول دیا ہے، ہار اتار لئے ہیں، انگوٹھیاں، نگینے، چاندی کے سانپ اتار لئے ہیں، طلائی پنیں نکال لی ہیں لیکن جب اس کے لمبے بال لہراتے ہوئے کھلے تو گویا اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے کہا۔ "آئینہ لاؤ۔"

کیا اس کے دل میں ناگاہ یہ خوف پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت نہیں کہ اپنے نئے چاہنے والے کو دامِ محبت میں گرفتار رکھ سکے۔ اور چاہنے والا بھی کیسا ؟ جس نے جنونیوں کی طرح اس کی ہر بات مان لینے کا اقرار کیا تھا، اور جسے گرفتار رکھنا لازمی ہو

گیا تھا۔ یا شاید یہ بات تھی کہ وہ اپنے حسن کے ایک ایک عنصر' اپنے جمال کی ایک ایک ادا کے مشاہدہ کے بعد اپنے شکوک کی تسکین چاہتی تھی اور اپنی تسلی کے لئے نئے نئے محرکاتِ اعتماد تلاش کر رہی تھی۔

اس نے آئینہ اپنے جسم کے ہر حصے کے قریب رکھ کے دیکھا اور کئی بار اس کے بدن سے چھو چھو گیا' اس نے اپنی ناقدانہ نظروں سے اپنی سفید جلد کا جائزہ لیا' اپنے آپ کو پیار کر کے جلد کی نرمی کا اندازہ لگایا' اپنے آپ کو آغوش میں لے کر جلد کی گرمی کا ثبوت مہیا کیا' اس نے اپنے بالوں کی لمبائی ناپی اور ان کی آب و تاب کا معائنہ کیا' اس نے اپنی نگاہوں کی بے پناہی اپنے اندازِ جمال' اپنے سانس کی گرمی کا امتحان لیا اور پھر شانے سے لے کر کہنی کے خم تک اپنے عریاں بازو کا ایک طویل ست بوسہ لیا' جب اس کے ہونٹ اس کے بازو سے مَس ہوئے تو حیرت' غرور یقین اور بے صبری کی وجہ سے اس کے دل پر عجیب و غریب جذبات کی یورش ہو رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا' گویا کسی کی راہ تک رہی ہے اور جب وہ افریزی ناز نینیں اسے نظر آئیں' جنہیں وہ گویا بھول ہی گئی تھی تو وہ کود کر ان کے بستر میں چلی گئی ان کو علیحدہ کیا' جنونِ آرزو کے جوش میں ان سے لپٹ گئی' اور اس کے لمبے سنہری بالوں نے تینوں کے خوبصورت سروں کو چھپا لیا۔

حصہ دوم

پہلا باب

دیوی کے باغ

شیشہ ے سرو سبز جو ئبارِ نغمہ ہے

ہیکل زہرہ، یعنی دیوی استرتی کا مندر، فصیل شہر سے باہر ایک سایہ دار مرغزار میں واقع تھا، جو طرح طرح کے پھولوں سے پٹا پڑا تھا۔ سات پشتوں کے ذریعے دریائے نیل کا پانی یہاں پہنچایا جاتا تھا جس کی وجہ سے سال بھر سبزہ لہلہاتا اور ہرے بھرے درخت جھومتے رہتے تھے۔

ساحلِ بحر پر یہ جھومتے ہوئے درخت، یہ گہری ندیاں اور جھیلیں، یہ سایہ دار سبزہ، اس وقت سے، جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، دو سو سال پہلے بطلیموسی فراعنہ مصر کے سب سے پہلے حکمران کے حکم سے وجود میں آئے تھے۔ اس کے کہنے پر جو سرو سہی لگائے گئے تھے، وہ اب دیوزاد معلوم ہوتے تھے۔ آب رسانی کی زرخیزیوں سے زمین ہری ہری اور ملائم دوب میں نیچے چھپ گئی تھی، چشمے تالاب بن گئے تھے۔ فطرت نے ایک معمولی مرغزار کو ایک شاداب و سیراب گاؤں میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہ باغ کوئی معمولی وادی، ملک یا وطن ہی نہ تھا، یہاں ایک علیحدہ دنیا آباد تھی جس کی حدود عظیم الشان پارہ ہائے سنگ سے قائم کی گئی تھیں اور جس پر ایک ایسی دیوی حکمران تھی، جو اس کائنات کا مرکز اور اس کی روح تھی، ان باغوں کے اردگرد ایک مہتابی تھی جو دس گز بلند اور سولہ گز طویل تھی، یہ ایک دیوارِ سنگ نہ تھی بلکہ ایک رفیع المنزلت شہر تھا جو

چودہ سو مکانوں پر مشتمل تھا۔ اس مقدس شہر میں چار سو کسبیاں آباد تھیں اور اس ایک مقام میں ستر مختلف اقوام کے باشندے جمع ہو گئے تھے۔

ان مقدس مکانوں کی ساخت بالکل یکساں تھی۔ ہر مکان کا دروازہ تانبے کا تھا۔ (تانبہ وہی دھات تھی جو دیوی سے منسوب ہو کر اب مقدس خیال کی جاتی تھی) ہر دروازے پر مردانہ عضوِ خفی کی شکل کا ایک تانبے کا ٹکڑا آویزاں تھا، جس سے دروازہ کھٹکھٹایا جاتا تھا۔ اس کے نیچے ایک تانبے کی پلیٹ تھی جس پر نسوانی عضوِ خفی کی شکل کھدی ہوئی تھی، اس پلیٹ پر کسبی کا نام کندہ تھا اور ساتھ ہی وہ رسمی الفاظ لکھے تھے جو ضروری سمجھے جاتے تھے۔ یعنی:

Q.E.E

KOXA I E

II.II.II

دروازے کے دو حجرے تھے۔ جن کی ساخت تھیٹر کی اعلیٰ نشست گاہوں کی طرح تھی یعنی باغ کی طرح۔ یہ حجرے بغیر دیوار کے تھے۔ دائیں طرف کا حجرہ "حجلۂ نمائش حسن" کہلاتا تھا۔ جب تماشبین وارد ہوتے تھے تو کسبی اس حجرے میں ایک بلند چبوترے پر بیٹھ جاتی تھی، بائیں طرف کا حجرہ ان عاشقوں کے لئے مخصوص تھا جو گھر سے باہر آزاد فضا میں رات بسر کرنا چاہتے تھے لیکن گھاس پر سونا ناپسند کرتے تھے۔ دروازہ ایک گلیارے میں کھلتا تھا۔ یہاں سے گزر کر ایک وسیع صحن نظر آتا تھا، جس کا فرش سنگ مرمر کا تھا اور جس کے کنارے پر سایہ دار ستونوں کا سلسلہ تھا کہ آنے والے سائے ہی سائے میں 'ٹھنڈے ٹھنڈے' مکان کے سات کمروں میں داخل ہو سکیں۔ دوسرے کونے پر دور گلابی سنگِ خارا کی عبادت گاہ تھی۔

ہر کسبی اپنے وطن مالوف سے دیوی زہرہ کا ایک بت اپنے ساتھ لائی تھی۔ یہی بت وہ عبادت گاہ پر رکھ دیتی تھی اور اپنی زبان میں اس کی عبادت کے مراسم بجالاتی تھی۔ مختلف ممالک سے آئی ہوئی کسبیاں ایک دوسرے کی زبان سمجھنے سے قاصر تھیں۔ ان کسبیوں نے اس دیوی کے مختلف نام رکھ چھوڑے تھے جو ان کی شہوانیت کے مظہرِ ارفع تھے، مثلاً لکھمی، استور، زہرہ، اشتر، فریہ، ملیطہ، سائپرس۔ بعض کسبیاں دیوی کے جسمانی مظاہر کو پوجتی تھیں۔ مثلاً سنگِ سرک، مخروطی پارۂ سنگ،

نوک دار سیپی۔ اکثر کسبیاں اپنے ساتھ دیوی کی ایک چھوٹی سے مورت بھی لائی تھیں' بھدی اور بدوضع' تراش معمولی' دبلے پتلے بازو' بڑے بڑے پستان' بھاری بھر کم کولہے' یہ مورت چوب سبز کے ایک چوکے پر رکھی رہتی۔ یہ مورت اپنی انگلیوں سے اپنے پیٹ کے شکنوں کی طرف اشارہ کر رہی تھی' جن کی شکل اس طرح تھی جیسی دریا سمندر میں گرنے سے پہلے اختیار کر لیتا ہے۔ اس مورت کے قدموں میں اکثر موردانہ کے پتے رکھ دیا کرتیں' جب کبھی ان کی کوئی آرزو پوری ہوتی تو گلاب کی پتیاں بکھرتیں اور عود واگر کی بتیاں جلاتیں۔

دیوی ان کے غم کی محرم' ان کے اعمال کی شاہد اور ان کی لذتوں کا مسلمہ سرمایہ تھی۔ جب کوئی کسبی مرتی تو یہ مورت اس کے نازک کفن میں رکھ دی جاتی تاکہ اس کی چھوٹی سی قبر کی حفاظت کرے۔

ایشیائی کسبیاں سب سے قبول صورت تھیں' سال کے سال جہاز لدے ہوئے آتے تھے' سال کے سال باجگزار حکمران' اور وہ بادشاہ بھی جن سے سکندریہ والوں کے دوستانہ تعلقات تھے' کپڑوں کی گٹھڑیاں' بوتلیں اور ایک سو کنواری لڑکیاں بھیجتے تھے' جن کو پجاری خاص طور پر باغِ زہرہ کی خدمت کے لئے منتخب کرتے تھے۔ میزیوی نازنینیں' یہودنیں' فرزیوی ماہ پیکر' قریطوی اقباتنا کی اچھوتیاں' بابلی' بحرین کی دوشیزہ لڑکیاں اور گنگا کے پوتر کنارے بسنے والی' سبھی قسم کی مہ جبینیں آتی تھیں۔ بعض گوری چٹی تھیں' چہرے کا رنگ سفید چمڑے کی طرح' چھاتیاں ابھری ہوئیں' بعض ایسی سانولی سلونی تھیں جس طرح مٹی بارش کے بعد نظر آتی ہے۔ ان کی ناک میں ایک سبک سی کیل ہوتی اور بال سیاہ' صرف ان کے کاندھوں تک لہراتے ہوئے۔

بعض ایسی تھیں کہ بہت دور سے آئی تھیں۔ سست' پست قد' جن کی زبان کوئی سمجھتا ہی نہ تھا' ان کی شکل زرد بندروں سے ملتی جلتی تھی۔ ان کی لمبی آنکھیں کنپٹیوں کی طرف کھنچی ہوئی تھیں اور ان کے کھردرے سے کالے کالے بالوں کی آرائش کا طریقہ بھی عجیب و غریب تھا۔ یہ عورتیں تمام عمر لوگوں سے اس طرح گریز کرتیں گویا جانور ہیں کہ راہ بھول کر ایک اجنبی سے مقام میں گھر گئی ہیں۔ انہیں محبت و آرزو کی تمام حرکات سے واقفیت تھی' لیکن کسی کو بوسۂ لب لینے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ عارضی محبت کے کھیل کے وقفوں میں ایک گاہک کے جانے کے وقت سے

لے کر دوسرے گاہک کے آنے تک یہ عورتیں ایڑیوں کے بل بیٹھ کر بچیوں کی طرح کھیلیں کھیلا کرتیں۔

ایک علیحدہ سبزہ زار میں شمال کی سنہری نازنینیں ایک جگہ مل کر رہتی تھیں اور رات کو گھاس ہی پر پڑ رہتی تھیں۔ ان میں سے کچھ سرمطبی تھیں، جن کی تہری تہری چوٹیاں تھیں، ان کی پنڈلیاں مضبوط تھیں، شانے بھرے بھرے، پتیوں کے ہار بنا بنا کر ایک دوسری کے گلے میں ڈالا کرتیں، اور کاٹنے کے لئے ایک دوسرے سے کشتی کرتی تھیں۔

کچھ ایسی بھی تھیں جن کی ناک چپٹی تھیں اور چھاتیاں بڑی بڑی۔ یہ تورانی عورتیں تھیں۔ ان کے بدن پر لمبے لمبے بال تھے۔ یہ کسبیاں صرف جانوروں کی طرح مجامعت کرتی تھیں۔ پھر کچھ جرمنی کی دیوزاد عورتیں تھیں، ان کے بال بوڑھوں کے بالوں کی طرح سفیدی مائل زرد تھے اور گوشت بچوں کی طرح نرم۔ مصری انہیں دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے تھے۔

پھر قوم گال کی عورتیں تھیں، ان کی جلد کی رنگت گائے کی جلد کی طرح گندمی تھی، جس میں ریت کا رنگ بھی جھلک مارتا تھا، کبھی ایسی باتوں پر ہنستی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیوں ہنستی جا رہی ہیں۔ پھر مغربی یورپ کی عورتیں تھیں جن کی آنکھوں کی رنگت سمندر کے رنگ کی طرح سبز تھی اور جو ہمیشہ لباس پہن کر باہر نکلتی تھیں، کہیں کہیں سانولی چھاتیوں والی اندلسی (ا) عورتیں جمع ہو جاتی تھیں۔ ان کے گھنے بال بڑی محنت سے گوندھے جاتے تھے۔ یہ اپنے پھڑکتے ہوئے شکم کے بال نہیں اتارتی تھیں، سکندریہ والے ان کے گٹھے ہوئے بدن اور ان کی مضبوط گردن پر جان دیتے تھے اور محبت کے علاوہ ناچنے کے لئے اکثر اوقات انہی کو طلب کرتے تھے۔

پھر افریقہ کی دخترانِ سیاہ فام بھی تھیں، سفید دوپٹوں والی نومیدیاوی عورتیں، کالے گاچ کے لباس والی فرطاجنہ کی نازنینیں، رنگ برنگ کے کپڑوں والی حبشنیں، سبھی پام کے درختوں کے سایہ میں مل کر رہا کرتیں، اور ان کی تعداد چودہ صد تھی۔

ایک بار جو عورت دیوی کے باغ میں داخل ہو گئی، وہ بڑھاپے کے پہلے دن تک یہیں کی ہو رہتی تھی، آمدنی کا نصف تو مندر کی نذر ہوتا تھا، نصف میں سے بے

چاری کھینچ تان کر عطریات اور خوراک کا خرچ پورا کرتی۔ یہ عورتیں لونڈیاں نہ تھیں، اپنے اپنے مکان کی مالک تھیں، لیکن ہر ایک کی قدر دانی یکساں نہ ہوتی تھی اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ جو نسبتاً زیادہ خوش نصیب ہوتیں، وہ ان بد نصیب کسبیوں کے مکان خرید لیتیں، جو بھوک کی ماری، اپنا مکان بیچ ڈالنے پر مجبور ہوتی تھیں، بد نصیب کسبیاں مکان بیچنے کے بعد اپنی فحش مورت لے کر کھلے باغ میں چلی جاتیں اور وہیں کسی ہموار پتھر سے چبوترے کا کام لے کر مورت اس پر رکھ دیتیں، جو کسبیاں گھاس کے فرش پر اپنی مورتوں کے پاس سویا کرتی تھیں، ان کے پاس صرف وہی گاہک آتے تھے جو قلاش ہوتے تھے، مثلاً دیوالئے سوداگر۔ کئی بار ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ یہ غریب گاہک بھی نظر نہ آتے، ان حالات میں یہ بد نصیب کسبیاں جوڑا جوڑا ہو کر، ایک رشتہ غم میں منسلک ہو کر، ایک دوسری کی گوئیاں بن جاتیں اور ان کی شہوانی دوستی آخر بیاہتا محبت کی شکل اختیار کر لیتی۔ ان جوڑوں میں اتفاق کا یہ عالم ہوتا کہ اون کے آخری تار تک ہر چیز میں برابر کا حصہ تقسیم کیا جاتا۔ طویل "زمانہ دوشیزگی" میں جو شدید جذبات پیدا ہوتے تھے، ان کی تسکین کے لئے فریقین کو باری باری اپنا فرض ادا کرنا پڑتا۔

جس کسبی کو گوئیاں بھی نصیب نہ ہوتی وہ کسی دوسری امیر کبیر کسبی کی لونڈی ہو جاتی، ایک گھر میں بارہ لونڈیاں رہ سکتی تھیں۔ بائیس کسبیاں ایسی امیر کبیر تھیں کہ ان کی بارہ بارہ لونڈیاں تھیں۔ ان حالات میں کنیزوں اور پیش خدمتوں کی ایک عجیب و غریب محفل قائم ہو گئی تھی، جس کے افراد مختلف اقوام و ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔

اگر اتفاقاً کسی کسبی کے گھر لڑکا پیدا ہو جاتا تو اس کی پرورش مندر کی چار دیواری میں ہوتی تھی۔ اس کا فرض تھا کہ دیوی کی خدمت کرے اور اس کے بدن کی بناوٹ پر غور کرتا رہے جو سڈول پن کا کامل ترین نمونہ تھا، اگر کسی کے گھر لڑکی ہوتی تو وہ دیوی سے منسوب ہوتی، پیدائش کے دن ہی وہ معنوی طور پر پسر دیانی سولس سے بیاہی جاتی اور مندر کا کاہنِ اعلیٰ خود ایک چھوٹا سا طلائی چھرا لے کر اس کا پردۂ بکارت چاک کر دیتا کیونکہ "دوشیزگی" دیوی زہرہ کو مطلقاً پسند نہیں، اس کے بعد وہ "مدرسۂ علومِ عشقیہ" میں داخل کی جاتی، اس جگہ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو سات درجوں میں علومِ محبت کے نظریوں اور عملی فن کاری کی تعلیم دی جاتی تھی، نظر بازی، ہم آغوشی، حرکاتِ جسمی کی شیریں کاری، پیار کرنے کے پیچیدہ طریقے، دانت، زبان، اور لب، کے

رموزِ خفی' یہ سب باتیں سکھائی جاتی تھیں۔

طالبات کو اجازت تھی کہ اپنے تجربے کا دن خود ہی مقرر کر لیں' کیونکہ تحریکِ آرزو' دیوی کی طرف سے ایک حکم ہے' اور اس کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ اسی دن اسے ایک مکان بھی مل جاتا تھا' کئی کئی چھوٹی چھوٹی بچیاں جو ابھی بالغ بھی نہ ہوتی تھیں' ایسی ماہر ہو گئی تھیں کہ سب سے زیادہ انہی کی مانگ تھی اور سچ یہ ہے کہ وہ بھی کاروبار محبت میں ان تھک تھیں' اس مدرسے کے اندرونی حصے کی دیواروں پر' ساتوں جماعتوں میں چھوٹے سے ہال میں اور برآمدے کے ستونوں پر بانوے تصویریں کھدی تھیں جو گویا تعلیمات عاشقی کا لب لباب تھیں۔ یہ تمام کام قلوشرز متوطن سکندریہ کی زندگی کی کمائی تصور ہوتا تھا جو "اپلز" کا حرامی لڑکا اور شاگرد تھا۔ مرتے مرتے وہ اس کام کی تکمیل کرتا تھا۔ اس وقت سے کچھ عرصہ پہلے بیرنیس ملکہ مصر نے اس مشہور مدرسہ کی قدردانی کے طور پر اپنی چھوٹی بہنوں کو تعلیم کے لئے یہیں بھیج دیا تھا اور دیمیطر لیس کو حکم دیا تھا کہ آرائش کی تکمیل کے لئے سنگِ مرمر کے بت تراشے' لیکن ابھی تک بچوں کی جماعت میں صرف ایک مرمری بت نصب کیا گیا تھا۔

ہر سال کے اختتام پر مندر کی تمام کسبیوں کی موجودگی میں ایک عظیم الشان مقابلہ ہوتا تھا جس میں حصہ لینے والیاں جان توڑ کر کوشش کرتی تھیں۔ کیونکہ جو بارہ انعام کامیاب کسبی کے لئے مقرر کئے گئے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اسے قطیطو کے مندر میں داخل ہو جانے کا حق حاصل ہو جائے گا' اور یہ وہ عزت تھی کہ کسبی کی نظر میں اور کوئی رتبہ اس سے عالی تر نہ تھا۔ قطیطو کے مندر پر رموز و اسرار کے ایسے گہرے پردے پڑے تھے کہ آج کل اس مندر کے متعلق کوئی تفصیلی بیان دینا ممکن نہیں ہے۔

بس ہمیں اتنا معلوم ہو سکا کہ اس کی عمارت کی شکل ایک مثلث کی سی تھی جس کے مرکزی خط پر قطیطو کا مندر واقع تھا۔ دیوی قطیطو کے نام سے ایسی ایسی پراسرار اور خوفناک ہوس رانیاں منسوب تھیں کہ ان کی تفصیل ناممکن نظر آتی ہے۔ اس عمارت کے دوسرے خطوط پر اٹھارہ مکان بنے تھے۔ ان میں وہ کسبیاں رہتی تھیں جو اپنے زردار عاشقوں کی قدردانی اور اپنی مانگ کے باعث بیس درہم سے کم پر بات کرنا خلافِ شان تصور کرتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک سکندریہ کی کاہنہ تھی۔

ہر مہینے چاند کی چودھویں' مقوی و محرک دواؤں کی وجہ سے مخبوط الحواس ہو کر اور رسومات مذہبی کے مقدس کمر بند باندھ کر (جن کے ساتھ دیوی کے مظاہر جسمی آویزاں ہوتے تھے) یہ کسبیاں مندر کے صحن میں جمع ہو جاتیں۔ جو عمر میں سب سے بڑی تھی' اس کا فرض تھا کہ کسی مہلک عرق کا استعمال کر چکی ہو۔ یقینی موت کے قریب تر ہونے کا خیال' اس کسبی کے دل پر چھا جاتا تھا اور اس سے ہوس رانی کے ایسے ایسے خوفناک و خطرناک اعمال سرزد ہوتے تھے جنہیں دیکھ کی زندہ رہنے والیاں خوف سے بھونچکی ہو جاتیں۔ اس کا جسم جھاگ میں غرق' ہوس رانی کا شعلہ جوالہ بن جاتا تھا یعنی بیک وقت مرکز بھی اور معیار بھی۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی تھی اور رقص کرتی تھی۔ دوسری کسبیاں جو بالکل عریاں ہوتی تھیں دیوانہ وار بھنچ بھنچ کر اس کو اپنے گلے سے لگاتی تھیں' اپنے بالوں کو اس کے پسینے سے تر کرتی تھیں' اس کے جلتے ہوئے بدن کے ساتھ اپنے بدن ملتی تھیں اور اس کی خوفناک موت کے اضطراب مسلسل سے ہوس کاری کے لئے تازہ قوت حاصل کرتی تھیں۔ یہ کسبیاں تین سال اس طرح گزارتی تھیں' اور چھتیس مہینوں کے بعد ان کی موت ایسی کیف آفرین ہوتی تھی۔

دیوی زہرہ کے مختلف ناموں کی مناسبت سے بہت سے چھوٹے چھوٹے مندر بھی بنے ہوئے تھے کیونکہ یہ 'وہ دیوی تھی جو طرح طرح کے روپ دھارتی تھی اور ہر آن ایک نئی شان میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ لیکن ان مندروں کو وہ عزت و حرمت نہ حاصل تھی جو اصل ہیکل کو تھی۔ ایک عبادت گاہ یوریپنیا سے منسوب تھی جس کی درگاہ میں جذباتی مزاج کی کسبیاں اپنے پاکیزہ عہد و پیمان کرتی تھیں۔ ایک عبادت گاہ استروفوبیا سے مخصوص تھی جو اس محبت کی تلخ یاد کو محو کر سکتی ہے' جس میں دونوں طرف برابر آگ نہیں لگتی۔ پھر ایک عبادت گاہ جینی تلس سے متعلق تھی جو وضع حمل کے وقت کسبیوں کی حفاظت کرتی ہے۔ ایک کرایسیا سے خاص تھی جو دولت مند عاشقوں کی توجہ کو کسبیوں کی طرف پھیرتی ہے' ایک کولیادے سے منسوب تھی' جو ہوس رانی و سیاہ کاری کے ادنیٰ ترین پہلوؤں کی دیوی تھی۔ ہر چیز جو محبت و آرزو سے تعلق رکھتی ہے دیوی کی نظروں میں تقویٰ کے برابر ہے۔

لیکن ان چھوٹی چھوٹی' معمولی عبادت گاہوں کا تعلق بھی چھوٹی موٹی آرزوؤں سے تھا اور انہی کے متعلق یہاں دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ ان کی خدمت بھی

سرسری طور پر کی جاتی تھی' ان کی نوازشیں معمولی تھیں اور ان کی پجارنیں بے پروا۔ کوئی دعا قبول ہو جاتی تو پجارن ایک آدھ پھول چڑھا دیتی۔ اگر غرض مند کسی کی بات پوری نہ ہوتی تو بے باکانہ عبادت گاہ کو ناپاک کر دیتی۔ یہ عبادت گاہیں مقدس نہیں سمجھی جاتی تھیں' یہی وجہ ہے کہ ان کے لئے خاص پجاری مقرر نہ تھے اور ان کے ناپاک کرنے والے کو سزا بھی نہیں دی جاتی تھی لیکن اصل مندر "ہیکلِ زہرہ" کا انتظام مختلف تھا۔

یہ مندر' عظیم الشان دیوی کا عظیم الشان مندر' زمین مصر کا مقدس ترین حصہ تھا۔ استرتی کے مندر کی وسیع عمارت ۳۳۶ فٹ طویل تھی' جس کی کرسی باغ کی سطح سے بلند تر تھی۔ ہر طرف ۱۷ اسیڑھیاں تھیں۔

اس کے سنہری دروازوں کی حفاظت کے لئے ۱۲ مخنث مقرر تھے جو دیوداس کہلاتے تھے۔ یہ مخنث اپنی ذات میں محبت کے دوہرے دوہرے مقاصد اور شام کی بارہ ساعتوں کے مظہر تھے' رفیع و وسیع دروازے کا منہ مشرق کی طرف نہ تھا' بلکہ پیفس کی طرف واقع تھا' یعنی شمال مغرب کی طرف۔ یہی وجہ تھی کہ سورج کی شعاعیں براہ راست شب زاد دیوی کے مندر میں داخل نہ ہو سکتی تھیں۔

شہ تیر چھیاسی ستونوں پر قائم تھا۔ نیچے نصف حصے تک ان ستونوں کا رنگ ارغوانی تھا اور اوپر کا نصف حصہ اس مذہبی رنگ کے مقابلے میں کھڑی ہوئی عورتوں کے اوپر کے دھڑ کی طرح سفید تھا' بلور کی طرح سفید (اور اس تضاد و تقابل کی وجہ سے ایسا نظر فریب تھا کہ تعریف سے بالاتر ہے) گچ بری اور مقرنس کے درمیان جو حصہ تھا اس پر فحش تصویریں کھدی تھیں' روایاتِ قدیم کی آئینہ دار' عشق انگیز و ہوس خیز۔ اس حصے کے کناروں پر بت تراش نے اپنا بت بنایا تھا کہ دیوی زہرہ کے سامنے کھڑا ہے اور اسی کے بدن کے ایک حصے سے نرم لاکھ سے کام لے کر ایک نازک و نظر فریب پھول کی شکل تراش رہا ہے' جس کی نزاکت و جمال میں 'گویا ازل سے' حسن' مسرت اور نیکی کے تمام معیاری عناصر نے پناہ لی ہے۔

حوالہ جات

(۱) اندلسی؛ Iberians

دوسرا باب

ملیطہ

جب واقفِ راہ دردشِ ناز ہوئے تم
دنیا کے لئے خانہ برانداز ہوئے تم
نسبت تمہیں کیا تازہ نہالانِ چمن سے
اب نامِ خدا سَروِ سَرافراز ہوئے تم

"اے اجنبی، پاک ہو جا!"
دیمیطر لیس نے کہا "پاک ہو کر داخل ہوں گا۔"
نوجوان محافظ نے اپنے بال پانی میں بھگوئے، پھر پہلے دیمیطر لیس کے پپوٹے تر کئے پھر اس کے لب اور اس کی انگلیاں، تاکہ اس کی نظر، اس کے بوسے اور اس کے ہاتھوں کا لمس محبت پاک ہو جائے۔
دیمیطر لیس آگے بڑھ کر دیوی کے باغ میں داخل ہوا، یہ اسی دن کی شام تھی جس نے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا تھا، یعنی زرینہ سے ملاقات کا دن، درختوں کی سیاہ گھنی شاخوں میں سے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی روشنی چھن چھن کر آسمان کی فضائے ساکن کو منور کر رہی تھی۔
مرد یقین نہیں کرتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورت فطرتاً سادہ مزاج ہے۔ جہاں صرف ایک خطِ مستقیم ہے، وہاں وہ ایک مکڑی کے جالے کی تلاش کرتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے گویا خلا میں گرفتارِ حیرت ہو گئے ہیں۔

زرینہ کی دلی آرزوئیں، بچوں کی خواہشوں کی طرح صاف اور صریح تھیں لیکن دیمیطر لیس کو زرینہ کی شخصیت مابعد الطبیعات کے کسی مسئلے سے زیادہ پر اسرار معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ اس کمسن نازنین سے رخصت ہوا ہے تو وہ گویا خواب کی سی بے ہوشی میں گھر پہنچا اور اس وقت وہ اپنے آپ کو ان تمام سوالات کا جواب دینے کے ناقابل پاتا تھا جو اس کے دل میں ہجوم کر رہے تھے۔

آخر وہ ان تینوں تحفوں کو لے کر کیا کرے گی؟ وہ چوری کے شیشے کو نہ استعمال کر سکتی ہے نہ بیچ سکتی ہے، ایک مقتول عورت کی کنگھی بھی اسی حیثیت سے بے کار ہے اور دیوی کا ست لڑاہار تو اس اعتبار سے کسی کام ہی کا نہیں۔ اگر وہ ان چیزوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے تو کیا وہ راز فاش ہو جانے کا خطرہ مول لینے کو تیار ہے؟ تو پھر اس نے یہ تحفے طلب ہی کیوں کئے۔ کیا صرف اس لئے کہ انہیں ضائع کر دے؟ وہ خوب سمجھتا تھا کہ پوشیدہ مسرتیں عورتوں کے لئے تسکین کا سامان پیدا نہیں کر سکتیں۔

وہ خوش تبھی ہوتی ہیں جو اُن کی خوش نصیبی و فرخندہ اختری دنیا میں رسوا ہو جائے اور اس نے یہ اندازہ کس طرح قائم کر لیا تھا (گویا اسے کشف ہو رہا ہے کہ) میں اس کے تین تحفوں کے لئے ایسے حیرت انگیز کام کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا۔ یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ وہ چاہتا تو اسے بہ جبر اغوا کر لیتا اور اسے مجبور کرتا کہ اس کے قدموں پر آگرے، پھر جو جی میں آتا کرتا، داشتہ بنا کر رکھتا یا بیوی بنا کر، یہاں تک کہ اسے لونڈی بنا کر بھی رکھ سکتا تھا۔ جی چاہتا تو اسے ہلاک کروا دیتا، مسلسل انقلاب و بغاوت کی وجہ سے شہری مرگِ ناگہاں کو ایک معمولی حادثہ سمجھنے لگے تھے اور ایک معمولی کسبی کی گمشدگی شہر کے لوگوں کو معلوم بھی نہ ہوتی۔

زرینہ کو یہ تمام باتیں معلوم ہوں گی اور اس کے باوجود اس نے کیسی حیرت انگیز جرأت سے کام لیا تھا۔

دیمیطر لیس، زرینہ کے متعلق جتنی فکر کرتا اتنا ہی دل میں خوش ہوتا کہ اور کچھ نہیں تو اس نے نسوانی فرمائشوں کے پرانے گیت میں نئی، مختلف اور اچھوتی سریں تو لگائی ہیں۔ اسے تجربہ ہو چکا تھا کہ عورتیں جو زرینہ کی طرح شایانِ پرستش تھیں، اپنے آپ کو دعوتِ عشق کے بعد نہائت بھونڈے طریقے پر پیش کرتی تھیں اور ذرا

اس عورت کی طرف دیکھئے کیا طلب کرتی تھی ! محبت نہیں' خدا نہیں' جواہرات نہیں بلکہ اپنے عاشق سے اس بات کی متمنی تھی کہ اس کی خاطر تین خوفناک جرائم کا ارتکاب کرے۔ اس نے زرینہ کے سامنے مصر کے تمام خزانے پیش کئے تھے اور وہ خوب جانتا تھا کہ اگر وہ اس نذر کو قبول کر لیتی تو اسے ایک تانبے کا پیسہ بھی نہ ملتا کیونکہ اس سے پہلے کہ وہ زرینہ سے پوری طرح لذت یاب ہو سکے وہ اس سے اکتا جاتا۔ اس نے اپنے حسن کی قیمت عجیب اور نادر مقرر کی تھی' یعنی تین خوفناک گناہوں کا ارتکاب' اور وہ اس قیمت کی سزاوار بھی تھی کیونکہ اس کی نسوانیت میں یہ طاقت و عظمت تھی کہ حسن کی اتنی قیمت مقرر کر سکے۔

اسی دن وہ فوراً بیقس کے ہاں گیا تھا اور مکان کو خالی پا کر شیشہ چرا کر باغ کی طرف بھاگ گیا تھا' ڈرتا تھا کہ دیر ہو گئی تو کہیں اس کی نیت بدل نہ جائے۔ وہ اب سوچ رہا تھا کہ زرینہ کے دوسرے شکار سے ملاقات کے لئے جاؤں یا نہیں۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ ابھی نہیں۔

مندر کے کاہن اعلیٰ کی بیوی طونیہ' ایسی نازک اور دل رباناز نین تھی کہ اسے یہ خوف تھا کہ اگر احتیاط نہ کی گئی تو اس کے قتل کا ارادہ ترک کر دینا پڑے گا' وہ لوٹا اور مہتابی پر خراماں خراماں روانہ ہوا۔

کسبیاں اپنے حجلہ ہائے نمائش میں اس طرح محوِ حسن فروشی تھیں گویا شوکیس میں پھول رکھے ہوں وہ اپنی عمر میں شکل و صورت میں' قومیت میں' لباس میں' انداز نشست و برخاست میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ حسین تھیں انہوں نے فزانی کی روایاتِ قدیم کے مطابق صرف اپنا بیضوی چہرہ کھلا رکھا تھا' نہیں تو نوک پا تک نفیس اونی کپڑوں میں ملبوس تھیں۔

بعض کسبیوں کا لباس باریک و نفیس تھا اور ان کا حسن لباس کی تہوں میں سے ایسے پر اسرار طریقے پر جھلکتا تھا جس طرح صاف و شفاف نتھرے ہوئے پانی سے سبزی اور سایہ دار مقام نظر آتے ہیں' بعض ایسی تھیں کہ ان کا حسن ان کی جوانی سے عبارت تھا۔ یہ کسبیاں کمر تک ننگی تھیں اور خوب تن کی بیٹھی تھیں تاکہ چھاتیوں کی سختی اور ابھار کو نمایاں کر کے دکھا سکیں۔

جو پختہ کار تھیں وہ بالکل ننگی تھیں کیونکہ ان کو خوب معلوم تھا کہ پہلے چہرہ پر

عمرِ رفتہ کے آثار نمودار ہوتے ہیں' جسم نسبتاً دیر کے بعد متأثر ہوتا ہے۔ دیمیطر لیس دل ہی دل میں ان کی تعریف کرتا' آہستہ آہستہ چلا جارہا تھا۔ جسم نسوانی کو عریاں دیکھ کر ہمیشہ اس کے دل میں شدید جذبات پیدا ہوتے تھے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ لوگ عورت کی لاش کو مکروہ کیوں خیال کرتے ہیں اور کم عمر لڑکی کی لاش کے متعلق بے پرواکیوں ہوتے ہیں۔ آج تو اس کی حالت ایسی تھی کہ ہر عورت اسے رجھاسکتی تھی! بس وہ تو یہ چاہتا تھا کہ آج کی محبوبہ بہت باتیں نہ بنائے اور بسترِ عشرت پر صرف اتنے جوش محبت کا اظہار کرے جو تہذیب و متانت کے قوانین میں جائز ہو۔ اسے اس بات کی بھی تمنا نہ تھی کہ اس کی محبوبہ حسین ہو بلکہ بد صورت کسی کو تو وہ ترجیح دیتا تھا کیونکہ متناسب جسم کو دیکھتے رہنے سے اس کی شہوانیت کم ہو جاتی تھی۔ وہ اضطراب جو اس کے دل میں زندہ متحرک حسن دیکھ کر پیدا ہوتا تھا در اصل شہوانیت دماغی سے خصوصی تعلق رکھتا تھا اور شہوانیت جسمی کو جلا کر بھسم کر دیتا تھا۔

اسے (ایک تاثرِ ناگوار کے ساتھ) یاد آیا کہ ایک رات جب اس کی آغوش میں وہ کسبی تھی جس کا حسن بے مثال اور جسم بے عیب تھا' تو وہ ساری رات بوڑھے پھونس نامردوں کی طرح لیٹا رہا اور اس کی شہوانیت میں ذرا سی تحریک بھی نہ ہوئی تھی۔ اس رات سے وہ اسی کو اپنی محبوبہ بناتا تھا جس کے حسن میں بے عیبی کا نقص نہ ہوتا تھا۔

کسی نے کہا "دوست! کیا تم مجھے بھول گئے؟ نہیں پہچانتے؟"

دیمیطر لیس نے مڑ کر دیکھا' سر ہلایا اور چلتا گیا۔ اس کا اصول تھا کہ جس عورت سے ایک بار لذت یاب ہو چکا ہو اسے دوبارہ زحمتِ بے نقابی نہیں دیتا تھا۔ باغ میں اس کی آمد ورفت اسی اصول پر مبنی تھی۔ جس عورت سے آدمی لذت یاب نہ ہو چکا ہو وہ ایک طرح سے اس کے لئے اچھوتی ہوتی ہے' لیکن دوسری بار کی مجامعت میں کیا لذت مل سکتی ہے' کیا نیا لطف آسکتا ہے؟ دیمیطر لیس کو تکرار سے اس لئے انکار تھا کہ اس طرح پہلی بار کا طلسم فریب بھی ٹوٹ جائے گا۔ یہ تو گویا شادی ہو گئی۔ کبھی کبھار اس کے دل میں بیاہتا زندگی کی سی تحریکات جو پیدا ہوتی تھیں تو ان کی تسکین کے لئے ملکہ ہی کافی تھی۔ دوسرے مواقع کے لئے اس لذت یابی کے لئے جو اس کے لئے لازمی تھی وہ ہمیشہ ایک نئی محبوبہ کو منتخب کرتا تھا۔

"کلونارین"
"ناتھین"
"پلینگو"
"نائیس"
"کرابیلی"
"ایوسی"

دیمیطر لیس چلتا جارہا تھا اور ہر کسبی اپنا نام بتاتی جاتی تھی، بعض تو ساتھ ہی اپنی سفارش کے طور پر یہ بھی کہتی تھیں کہ ہماری گرمجوشی اور آرزوؤں کی شدت آزما کے تو دیکھو، بعض یوں دعوت دیتی تھیں کہ جس بات کی اجازت کوئی کسبی نہ دے گی وہ یہاں نصیب ہو گی۔ لیکن دیمیطر لیس رکا نہیں، وہ ارادہ کر رہا تھا کہ آنکھیں میچ کر انتخاب کرلے، جیسا اس کا دستور تھا کہ ایک کم عمر لڑکی نے جو نیلے رنگ کے لباس میں ملبوس تھی، اپنا سر اس کے شانوں پر رکھ دیا اور نرم آواز میں کہا "تو کیا یہ بات کبھی نہ ہو گی۔"

یہ بات ایسی عجیب اور غیر متوقع تھی کہ وہ مسکرانے لگا اور رک گیا۔

اس نے کہا "کھلواؤ دروازہ، چلو آج تمہی سہی۔"

لڑکی خوشی خوشی کھڑی ہوئی اور دوبار دروازہ کھٹکھٹایا، ایک بوڑھی کنیز نے دروازہ کھولا۔ کسبی نے کہا "گورگو، کوئی آگیا ہے، جلدی کرو، کریت کی شراب لاؤ، کیک لاؤ اور بستر تیار کرو۔"

پھر اس نے مڑ کر دیمیطر لیس سے پوچھا "کیا کوئی مقوی دوا کھاؤ گے۔"

دیمیطر لیس ہنسنے لگا "نہیں کیا تمہارے پاس ہے؟"

کسبی نے کہا "اور نہیں تو کیا، رکھنی پڑتی ہے، بہت لوگ آکر مانگتے ہیں، تمہیں کیا پتہ، اچھا اس طرف آؤ اور سیڑھیوں کا خیال رکھنا، ایک سیڑھی ٹوٹ گئی ہے، میرے کمرے میں چلو، میں آئی۔"

اس کا کمرہ ایک نا تجربہ کار کسبی کا سادہ کمرہ تھا۔ ایک چوڑا پلنگ، ایک کوچ آرام کرنے کے لئے، کچھ کرسیاں لیکن ایک کھلی کھڑکی میں سے باغ، سمندر اور سکندریہ کی دوہری بندرگاہ نظر آرہی تھی۔ دیمیطر لیس چپ چاپ کھڑا ہو کر دور کے شہر کی

طرف دیکھنے لگا۔

بندرگاہوں کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے سورج کی شعاعیں، سمندری شہروں کی بے مثال شان، نتھرے ہوئے آسمان کی سکون ریز فضا، پانی کی ارغوان کاریاں، یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان دلوں کو بھی اپنے جادو میں اسیر کر لیتی ہیں جن کو دکھ نے تڑپا دیا ہو یا سکھ نے جگمگا دیا ہو۔

ان شہروں میں کیسے کیسے قدم چلتے چلتے رک گئے ہوں گے؟ کیسے کیسے محبت کے افسانے فضا میں لرزاں ہوں گے؟ کیسی کیسی صدائیں خاموش ہو گئی ہوں گی؟ دیمیطر لیس شہر کی طرف دیکھ رہا تھا، سمندر میں نیم غرق سورج میں سے شعلوں کا ایک سیلاب نکل کر باغات زہرہ کے خمدار گوشوں کی طرف رواں تھا۔ بحیرہ روم پر ایک افق سے دوسرے افق تک ایک شاندار طیف ارغوانی قائم تھا جس میں سرخیٔ طلاء آمیز سے لے کر تیز بنفشیٔ رنگ تک مختلف قسم کے گہرے رنگوں کے پارے موجود تھے، اس حسنِ لرزاں اور جھیل مریوطس کے آئینہ سبز کے درمیان (جس کا رنگ زغالی سنگ فارس کا تھا) شہر کی سفید عمارات منعکس ہونے والے رنگوں کا ایک عجیب و غریب لحاف اوڑھے محوِ خواب تھیں۔

بیس ہزار ہموار مکانوں کے متنوع نقوش، گویا فضا میں بیس ہزار داغ ہائے رنگ کی طرح تھے، جو مغرب کے سیلابِ نور کی گھٹتی ہوئی روشنی کے مطابق اپنی اپنی جگہ بدل رہے تھے۔ یہ ہجومِ نور تیز و آتش افروز تھا، ناگاہ ایک لمحے میں آفتاب غروب ہو گیا، اور جذرِ شب کی وجہ سے دنیا میں ایک لرزش سی پیدا ہو گئی اور ہوا چلنے لگی، کیا ہوا تھی، یکساں و لرزاں، نامعلوم، نازک۔

"یہ رہے کیک اور انجیر اور شہد کا چھتہ اور شراب اور ایک نازنین! انجیر کھانے کا مزا تب ہی ہے کہ ابھی دن ہو اور نازنینوں سے لطف اٹھانے کا مزا ہی تب ہے کہ رات ہو۔"

کسبی واپس آ گئی تھی اور یہ کہہ کر ہنس رہی تھی، اس نے دیمیطر لیس کو بٹھا دیا۔ خود اس کی گود میں بیٹھ گئی اور ٹٹول کر اطمینان کر لیا کہ اس کے خُرمارنگ بالوں میں سے کوئی پھول گرا نہیں، دیمیطر لیس چونک پڑا، کسبی بالکل ننگی تھی۔

ابھرے ابھرے کپڑوں کی وجہ سے اس کے بدن پر گوشت معلوم ہوتا تھا،

لیکن اب جو دیمیطر لیس نے اس کو بے لباس دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ نہایت کم عمر ہے، صحیح معنی میں بالغ بھی نہیں، اس کا جسم نہایت نازک و سبک تھا۔

اس کے دل میں شفقت کروٹیں لینے لگی۔ جس طرح کوئی شجاع، کم عمر گھوڑی پر سواری کرنے سے انکار کرے اسی طرح اس کا دل اس کم عمر نازنین سے لطفِ صحبت اٹھانے سے انکار کرتا تھا۔

اس نے کہا "تم تو ابھی عورت بھی نہیں بنیں۔"

"واہ! تو پھر کیا ہوں میں، دیوی کی قسم، ذرا مجھے بتانا، کیا میں کوئی مزدورنی ہوں، یا کوئی بوڑھا فلسفی، یا تھرلیس کی کوئی عورت۔"

"تمہاری عمر کیا ہے۔"

"ساڑھے دس سال، گیارہ سال ہی سمجھو، ہاں بس گیارہ ہی سمجھو، میں یہیں دیوی کے باغوں میں پیدا ہوئی تھی، میری ماں ایک یلزلوی عورت ہے۔۔۔ تھوس۔۔۔ وہی نا جسے سب بحری کہہ کر پکارتے ہیں۔ اگر تمہارے خیال میں میری عمر بہت کم ہے تو ماں کو بلواؤں؟ اس کی جلد کی نرمی؟۔۔۔ کیا کہنا! بڑی قبول صورت ہے۔ وہ!!"

"کیا مدرسے میں تعلیم لے چکی ہو؟"

"اب چھٹی جماعت میں ہوں، اگلے سال میری تعلیم ختم ہو جائے گی، خدا خدا کر کے یہ سال کاٹے ہیں۔"

"کیا پسند نہیں تمہیں یہ تعلیم؟"

ہوں! تمہیں کیا پتہ، استانیاں کتنی سخت ہیں، وہی بات، وہی سبق، بیس بیس بار دہرانے کے لئے کہتی ہیں اور بے کار خواہی، ایسی باتوں کی مشق کراتی ہیں جن کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، مرد کبھی ان کا ذکر بھی نہیں کرتے، تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ یہ بات مجھے پسند نہیں، یہ لو انجیر۔۔۔ یہ نہیں۔۔۔ یہ لو، وہ کچی ہے، تمہیں انجیر کھانے کا نیا طریقہ بتاتی ہوں، دیکھو!

"میں جانتا ہوں یہ طریقہ، اس میں وقت ضائع ہوتا ہے اور مزا بھی زیادہ نہیں آتا، تم بڑی اچھی شاگرد ہو۔"

"جو کچھ مجھے آتا ہے وہ میں نے خود ہی سیکھا ہے، استانیاں یہ بتانا چاہتی ہیں کہ

انہیں ہم کسبیوں سے زیادہ واقفیت ہے۔ شاید مشق انہیں زیادہ ہو' نئی بات تو انہوں نے کوئی بتائی نہیں۔"

"کتنے عاشقوں کو رجھا چکی ہو اب تک؟"

"بہت' لیکن سب بوڑھے تھے' کیا کیا جائے' جوان تو بڑے بیوقوف ہوتے ہیں' چالیس سال کی عورت' ادھیڑ عمر کی بڑھیا پر جان دیتے ہیں' کئی بار دیکھا ہے کیسے کیسے بانکے جوان تھے' کام دیو کی طرح' اور ذرا دیکھا ہوتا کہ چُنا کسے؟ بھینسوں کو' بھینسوں کو! یہ موٹی کسبیاں' دھونسے کے دھونسے۔ خدا نہ کرے ان کی عمر تک زندہ رہوں میں' مجھے تو کپڑے اتارتے بھی شرم آئے جو میں انہی کی طرح ہو جاؤں۔۔۔۔۔ شکر ہے میں ابھی تک جوان ہوں' لاؤ ایک بوسہ تو دلاؤ۔ بڑے پیارے لگتے ہو تم مجھے!"

اس مرحلے پر گفتگو ذرا غیر متین ہو گئی اور دیمیطر یس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ماہر کسبی کے متعلق اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' کسبی کو بھی گویا اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اس کا نازک و سبک جسم' ایک نوجوان کی شہوانی بھوک کے لئے خوانِ نعمت بننے کی پوری پوری صلاحیت نہیں رکھتا (اس لئے اس نے اور تدبیروں سے کام لے کر دیمیطر یس کو رجھانا چاہا)۔

اپنی انگلیوں سے وہ پیار کے ایسے ایسے کھیل کھیل رہی تھی کہ باید و شاید' اس کی انگلیوں کی شیریں حرکاتی کی یہ کیفیت تھی کہ دیمیطر یس کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ کیا ہونے والا ہے اور وہ تابڑ توڑ' مسلسل انگلیوں کی ایسی حرکتوں سے کام لے رہی تھی کہ دیمیطر یس کو نہ تو ان حرکتوں کا علم ہو سکتا تھا' نہ اجازت دینے کی مہلت ملتی تھی' نہ رہبری کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور سب سے زیادہ قاتل بات یہ تھی کہ ان تمام حرکات کے بعد وہ ہم آغوشی کی گرم جوشی سے پرہیز کرتی تھی۔ اس کا مضبوط لیکن نازک اور پھرتیلا جسم ایسی تیزی سے حرکت کرتا تھا کہ وہ اسے اپنے چاروں طرف بیک وقت قائم و موجود نظر آتی تھی۔ وہ آگے بڑھتی تھی' دعوت عشق دے کر پھر تیزی سے پیچھے ہٹ جاتی تھی' پھسل کر ش ادھر سے ادھر ہو جاتی تھی' مڑتی' لچکتی' بل کھاتی وہ بجلی طرح تڑپ رہی تھی۔ آخر کار وہ بڑی کوشش کے بعد اس کے جسم نو بہار کو اپنی آغوش میں لے کر بے حرکت بنا سکا۔ آدھ گھنٹہ اسی طرح ہنستے کھیلتے گزر گیا تھا۔

پہلے کسی کود کر بستر سے اٹھی' اس نے اپنی انگلیاں شہد میں ڈبو کر اپنے لبوں پر پھیریں اور پھر کوشش سے اپنی ہنسی ضبط کر کے' جھک کر' دیمیطر لیس کے لبوں سے اپنے لب لگا دیئے' اس کے گھنگریالے بال' دونوں رخساروں کے پاس رقص کر رہے تھے۔

دیمیطر لیس مسکرایا اور ایک کہنی کے سہارے لیٹے لیٹے بولا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"ملیطہ' دروازے پر کیا نہیں دیکھا تھا؟"

"نہیں"

"تو پھر اب میرے کمرے میں لکھا دیکھ لو' ہر طرف دیواروں پر لکھا ہے' یہی حالت رہی تو پھر ان پر رنگ کرانا پڑے گا۔"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہر دیوار پر کچھ نہ کچھ لکھا تھا۔ اس نے کہا "بڑا تعجب ہے' پڑھ سکتا ہوں میں کیا لکھا ہے؟"

"شوق سے میری کوئی بات راز نہیں ہے۔"

دیواروں پر عاشقوں کے نام کے ساتھ ملیطہ کا نام لکھا تھا' کئی جگہ بھدی سی تصویریں بھی بنی تھیں' کہیں پیار کے کلمے' کہیں مذاق کی باتیں' کہیں فحش گالیاں' کہیں عاشقوں نے اپنی قوتِ مردانگی کی آپ ہی تعریف لکھی تھی' کہیں ملیطہ کی فن کاری اور نزاکت مہارت کی طرف اشارے تھے' کہیں گاہکوں نے مردانگی کی ڈینگیں مارنے والوں کا مذاق اڑایا تھا' دیمیطر لیس کے لئے ان میں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا' سوائے اس کے کہ ان تحریروں سے عام لوگوں کے گرے ہوئے مذاق کا اندازہ قائم کر سکتا تھا' البتہ داہنی طرف' نیچے کی تحریر دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

"یہ کیا لکھا ہے؟ یہ کیا لکھا ہے؟ ذرا مجھے بتانا۔"

"کیا؟ کہاں لکھا ہے؟ کیا ہو گیا تمہیں؟" کسی نے کہا

"یہ رہا؛ یہ نام کس نے لکھا تھا۔" وہ انگلی سے مندرجہ ذیل تحریر کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

زرینہ' ملیطہ

ملیطہ' زرینہ

"یہ ؟ یہ تو میں نے لکھا تھا۔"

"لیکن یہ زرینہ کون ہے ؟"

"میری سب سے پیاری گوئیاں۔"

"ہو گی لیکن میں کچھ اور پوچھتا ہوں' کون سی زرینہ' کئی کسبیوں کا نام زرینہ ہے۔"

"میری گوئیاں سب سے خوبصورت ہے' جلیل کی زرینہ۔"

"تو تم اسے اچھی طرح جانتی ہو' مجھ سے اس کی باتیں کرو' کہاں سے آئی ہے وہ ؟ کہاں رہتی ہے ؟ اس کا عاشق کون ہے ؟ سب کچھ بتاؤ۔"

وہ کوچ پر بیٹھ گیا اور کسبی کو اپنی گود میں بٹھالیا۔

کسبی نے کہا "تمہیں اس سے محبت ہے' یہ معلوم ہوتا ہے۔"

"خیر تم میرے سوالوں کا جواب تو دو' جو کچھ جانتی ہو بتاؤ نا !"

"مجھے کچھ بھی تو پتہ نہیں ہے' دو بار تو یہی خوشی بہت تھی کہ میرے پاس آئی' فضول باتیں پوچھ کر وقت کیوں گنواتی۔"

"تو وہ کسبی ہے' میرا مطلب' اس کا جسم کیسا ہے ؟"

'جس طرح کا ایک خوبصورت لڑکی کا ہوتا ہے' کیا چاہتے ہو' میں کیا کہوں ؟ اس کے جسم کا ایک ایک حصہ گنواؤں اور پھر کہوں کہ اس کے بدن کا ہر حصہ خوبصورت ہے (بس یہ سمجھ لو) کہ وہ عورت ہے' پوری عورت' جسے عورت کہنا چاہئے' جب مجھے اس کا خیال آتا ہے تو کسی سے لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔"

اس نے دیمیطر لیس کے گلے میں بانہیں ڈال لیں۔

دیمیطر لیس نے پوچھا۔ "اور تمہیں کچھ نہیں پتہ ؟ کچھ بھی نہیں ؟"

ہاں بس اتنا جانتی ہوں کہ جلیل سے آئی ہے اور بیس سال عمر ہے' یہودیوں کے محلے میں رہتی ہے' شہر کے پورب میں رہتی ہے' باغوں کے پاس ہی' بس اسی قدر جانتی ہوں۔"

"کس طرح رہتی سہتی ہے ؟ کس چیز کو پسند کرتی ہے ؟ یہ نہیں جانتیں ۔ تمہارے پاس جو آئی تھی تو اس کا مطلب ہے عورتوں سے بھی محبت کرتی ہے۔ انہیں اپنی دوگانہ بناتی ہے' اچھا تو بتاؤ کہ صرف عورتوں ہی سے پیار کرتی ہے کہ مردوں کا بھی

کچھ خیال ہے ؟"

کسبی نے جواب دیا" نہیں یہ تو بات نہیں، پہلی رات جو آئی تھی تو ساتھ ایک عاشق بھی تھا اور اس کی حرکتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ جھوٹ موٹ بن نہیں رہی ۔ مجھے پتہ لگ جاتا ہے کہ عورت کو مرد کا خیال ہے کہ نہیں، آنکھوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کے باوجود ایک دن اکیلی بھی آئی تھی اور وعدہ بھی کر گئی تھی کہ پھر آؤں گی۔"

دیمیطر لیس نے پوچھا" اس کی کوئی اور سہیلی بھی ہے باغ میں ؟"

"ہاں، ایک اور جلیلوی عورت ہے، شمیرس بڑی غریب ہے بیچاری۔"

"کہاں رہتی ہے ؟ میں اسے ملنا چاہتا ہوں۔"

"سال بھر سے بیچاری باغ ہی میں سوتی ہے، گھر بیچ دینا پڑا غریب کو، لیکن مجھے پتہ ہے وہ کہاں رہتی ہے اور اگر کہو تو تمہیں لے چلتی ہوں، میری چپلی اٹھا لاؤ تو ذرا بھاگ کر۔"

دیمیطر لیس نے چپلی کے چرمی تسمے ملیطہ کے نازک ٹخنوں کے گرد لپیٹ دیئے اور اس کی چھوٹی سی عبا بھی اٹھا کر دی۔ کسبی نے عبا اپنے بازو پر ڈال لی اور تیز تیز دونوں باہر نکل گئے۔

دیر تک چلتے گئے، باغ بہت بڑا تھا، کبھی کبھار کوئی کسبی کھڑی ہو کر عبا کے بند کھول دیتی اور اپنا نام بتا کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پھر لیٹ جاتی۔ کئی کسبیوں نے ملیطہ کا منہ چوما۔ انہیں وہ جانتی تھی۔ ایک معمولی سی عبادت گاہ کے سامنے وہ کھڑی ہو گئی اور تین بڑے بڑے پھول چن کر بھینٹ چڑھائے۔

ابھی تک رات کی تاریکی کائنات پر محیط نہ ہوئی تھی۔ غروب آفتاب کے بعد جو سست رو سانور باقی رہتا ہے اس کی بہاریں، روشنی میں کچھ لطیف و شدید سی چیز پوشیدہ ہوتی ہے، نم آلود دھندلے سے ستارے، آسمان سے ذرا زیادہ تابناک، ایک لرزش خفی کے ساتھ ٹمٹما رہے تھے اور درختوں کی شاخوں کے سائے زرد ہو گئے تھے۔

ملیطہ نے نا گہاں کہا۔ "لو وہ میری اماں ہیں۔"

ایک عورت ململ کے تہرے لباس میں ملبوس، جس پر نیلے رنگ کا حاشیہ تھا، بڑے سکون و اطمینان سے اس طرف چلی آ رہی تھی، ملیطہ کو دیکھ کر وہ دوڑ کر آگے آئی،

اسے زمین سے اٹھالیا اور دونوں گالوں کا بوسہ لے کر بولی۔

''میری بچی' میری پیاری' کہاں جارہی ہو؟''

''شمیرس سے میرے ایک دوست ملنا چاہتے ہیں' انہیں لے جارہی ہوں' آپ کہاں جارہی ہیں؟''

''زرینہ کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے وہاں گئی تھی' اس کے پاس ہی بیٹھ کر کھانا بھی کھایا۔''

''کیا ہوا ہے؟ لڑکا؟''

''جڑواں لڑکیاں' پیاری' ایسی خوبصورت اور گلابی گلابی ہیں جیسے موم کی گڑیاں ہوتی ہیں' جاؤ ابھی دیکھ آؤ' دکھادے گی تمہیں۔''

''خوب خوب' دو ننھی ننھی کسبیاں نام کیا رکھا ہے ان کا؟''

''زہرہ' دونوں کا نام زہرہ رکھا گیا ہے' کیونکہ زہرہ کے میلے کی شام کو پیدا ہوئی ہیں' دیوی کی خاص مہربانی ہے' بڑی قبول صورت ہوں گی دونوں۔''

ملیطہ کو اس نے پھر زمین پر اتار دیا اور دیمیطر لیس سے مخاطب ہو کر بولی'' کیسی اچھی ہے' میری پیاری ملیطہ؟ مجھے ناز ہو کہ نہیں اس پر؟''

اس نے سکون سے جواب دیا۔'' تم دونوں کو ایک دوسرے پر ناز ہونا چاہئے۔''

کسبی چلی گئی' لیکن جب وہ دونوں (دیمیطر لیس اور ملیطہ) درختوں کے پاس سے گزر رہے تھے تو اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا' تھوڑی دیر کے بعد ملیطہ نے کہا ''لو ہم آپہنچے!''

شمیرس' دو درختوں اور ایک جھاڑی کے درمیان' گھاس پر اپنی بائیں ایڑی کے بل بیٹھی تھی' اس کے نیچے سرخ کپڑے کا ایک چیتھڑا تھا' دن کو یہی کپڑا اوڑھ کر پھرا کرتی' رات کو ننگی اسی پر سو رہتی' پاس سے مرد گزرتے رہتے' وہ اسی طرح پڑی رہتی' دیمیطر لیس اس کی طرف بڑھتی ہوئی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ خاص قسم کی دبلی پتلی' سانولے رنگ کی' عورتوں کا گندم گوں جسم' ہر وقت گویا شہوانیت کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جلتا رہتا ہے اور ان کے چہروں سے تب دار اضطراب ٹپکتا ہے' اسی طرح کا اضطراب شمیرس کے چہرے سے عیاں تھا' اس کے گرم اور لپک دار ہونٹ' بے باک

نگاہیں، بنفشی پپوٹے، ایک طرف حدتِ آرزو کا اظہار کرتے تھے اور دوسری طرف خستگی اور درماندگی کا۔

اس نے اپنی ہر چیز بیچ کھائی تھی، کنگھیاں، پنیں، موچیں، اپنے بکھرے بکھرے بالوں کی وجہ سے (سر جھاڑ منہ پہاڑ) وہ اور بھی بے حیا اور غلیظ معلوم ہوتی تھی۔ پاس ہی ایک بکرا تن کر کھڑا تھا جو ایک درخت سے سونے کی اُس زنجیر سے بندھا تھا، جس کی چار لڑیاں کبھی اس کی مالکہ کسی کے گلے کی زینت رہ چکی تھیں۔

ملیطہ نے کہا "شمیرس اٹھو، کوئی تم سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔"

یہودن نے سر اٹھایا، لیکن اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ دیمیطر لیس آگے بڑھ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "زرینہ کو جانتی ہو؟"

"ہاں"

"تم سے اکثر ملاقات ہوتی ہے؟"

"اکثر، ہاں"

"مجھے کچھ اس کے متعلق بتاؤ گی؟"

"نہیں"

"کیوں، کیوں نہیں بتاتیں؟"

"نہیں"

ملیطہ حیران ہو گئی، اس نے کہا "باتیں کرو نا ان سے شمیرس! شک نہ کرو، میرے دوست کو زرینہ سے محبت ہے، وہ اس کا برا نہیں چاہتا، اس کا بھلا ہی چاہتا ہے!"

شمیرس نے جواب دیا۔ "خوب جانتی ہوں کہ اسے زرینہ سے محبت ہے۔ اس لئے یہ بھی خوب جانتی ہوں کہ وہ اس کا برا ہی چاہتا ہے، اسے زرینہ سے محبت ہے، یہی تو میرے چپ رہنے کی وجہ ہے۔"

دیمیطر لیس کے بدن میں غصے سے خون کھولنے لگا لیکن وہ چپ رہا۔

یہودن نے کہا۔ "ادھر لاؤ اپنا ہاتھ، دیکھوں تو مجھے غلطی تو نہیں ہوئی۔"

اس نے دیمیطر لیس کا بایاں ہاتھ لے کر چاند کی روشنی میں ہتھیلی کی طرف دیکھنا شروع کیا۔

ملیطہ بھی جھک کر دیکھنے لگی، وہ ہاتھ کے پر اسرار خطوط کو سمجھنے کی طاقت نہ رکھتی تھی، لیکن کسی کی قسمت کا لکھا معلوم کرنے میں ہر انسان کو دلچسپی ہوتی ہے۔

دیمیطر لیس نے پوچھا "کیا نظر آتا ہے ؟"

"کیا نظر آتا ہے ؟ بتاؤں کیا نظر آتا ہے' میرا شکریہ ادا کرو گے ؟ میری بات مانو گے بھی یا نہیں ؟ بڑی خوش نصیبی نظر آتی ہے اس ہاتھ میں ! لیکن گزر گئی' وقت پورا ہو گیا' محبت نظر آتی ہے' ہاں محبت' لیکن خون میں غرق۔"

"میرا خون ؟"

"ایک عورت کا خون نظر آتا ہے' پھر کسی دوسری عورت کا خون' پھر تمہارا' لیکن وہ دن ابھی دور ہے' بہت دور بھی نہیں۔"

دیمیطر لیس نے بے پروائی سے اپنے شانوں کو حرکت دی' مڑ کر دیکھا تو ملیطہ دیوانہ وار دوڑی جا رہی تھی۔

شمیرس نے کہا۔ "ڈر گئی ہے' بچی ہے نا' اس کا تو کوئی ذکر نہ تھا' اس سے کوئی تعلق نہیں' چلنے دو' ہونے دو جو ہوتا ہے' شدنی کو کون ٹال سکتا ہے' تمہارے لیکھ تو تمہارے پیدا ہونے سے پہلے لکھے گئے تھے' جاؤ اب۔ اب کچھ نہ کہوں گی' مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

اس نے دیمیطر لیس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

تیسرلباب

شکوک

ترسانہ مجھ کو کھینچ کے تلوار مارڈال
گر مارنا ہے مجھ کو تو اک بار مارڈال

ایک عورت کا خون ! پھر کسی دوسری عورت کا خون' پھر تمہارا' لیکن وہ دن ابھی دور ہے' بہت دور بھی نہیں' راہ چلتا دیمیطر لیس یہ لفظ دہرا رہا تھا' وہ کوشش تو کر رہا تھا کہ ان پر یقین نہ کرے لیکن یہ باتیں گویا اس کے دل میں کھب سی گئی تھیں۔ آج تک اس نے کاہنوں اور نجومیوں کی پیشین گوئیوں پر اور ان نتیجوں پر کبھی اعتبار نہ کیا تھا جو یہ لوگ مذبوح جانوروں کی آنتوں اور ستاروں کی گردش سے نکالا کرتے تھے' انسانی تقدیر سے ان چیزوں کا میل ترکیبی اسے بہت مشکوک معلوم ہوتا تھا' تاہم اس کے ہاتھوں پر جو پیچیدہ خطوط تھے انہیں دیکھ کر وہ محسوس کرتا تھا کہ ان کی انفرادیت میں کوئی شبہ نہیں ہے اور اس کی قسمت کا زائچہ ہونے کی حیثیت سے ان خطوط کے متعلق اس کا دل مضطرب ہو گیا تھا' کاہنہ کی پیش گوئی اس کے دل پر نقش ہو گئی تھی۔

اس نے بائیں ہتھیلی کو غور سے دیکھا جس کے پر اسرار ابدی خطوط میں اس کی زندگی کا لبِ لباب درج تھا۔ اس نے دیکھا کہ ہتھیلی کی لکیروں نے نئے چاند کی شکل اختیار کی ہے' جس کی نوکیں انگلیوں کے مرکزی خط کی طرف مڑی ہوئی ہیں' اس سے ذرا نیچے ایک چار شاخہ خط تھا۔ گلائی اور گرہ دار' جس کے دو نقطے نہایت سرخ تھے۔ اس

خط کے متوازی ایک اور باریک خط تھا جو کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد کلائی کی طرف مڑ گیا تھا۔ ایک مختصر اور صاف خط انگوٹھے کے گرداگرد نظر آتا تھا۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن ان خطوط کے پوشیدہ معانی سے بے خبر ہونے کے باعث وہ پریشانی میں بار بار اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا۔ آخر کار اس نے اپنی فکر کا یہ موضوع ہی بدل دیا۔

زرینہ 'زرینہ' زرینہ' جس طرح مخار میں انسان پھنکتا ہے اسی طرح یہ نام لے لے کر دیمیطر لیس (آتشِ عشق) میں جل رہا تھا۔

کسی طرح زرینہ کو خوش کر دوں' چھکا دوں رجھالوں' بغل میں دباؤں' اس کے ساتھ کہیں بھاگ جاؤں' شام یونان' روما' کہیں سہی' بس شرط یہ ہے کہ وہاں نہ میری کوئی اور معشوقہ ہو' نہ اس کا کوئی چاہنے والا' اور یہ کام بہت جلدی ہونا چاہئے۔

تین تحفوں میں سے ایک تو اب اس کے پاس تھا' دوسرے دو تحفے کنگھی اور ہار باقی تھے۔

"پہلے کنگھی" یہ سوچ کر وہ تیز تیز چلنے لگا۔

مندر کے کاہن اعلیٰ کی بیوی غروب آفتاب کے بعد ہمیشہ باغ کی حد کے قریب سنگ مرمر کی نشست پر بیٹھی سمندر کے نظارے میں محو رہا کرتی تھی۔ دیمیطر لیس یہ بات جانتا تھا کیونکہ یہ عورت بھی اس کے عشق میں مبتلا رہ چکی تھی اور کئی بار اس سے کہہ چکی تھی کہ جب مجھ سے ملنا چاہو' یہیں آملو' اس لئے وہ سمندر کی طرف چل پڑا۔

وہ تھی تو سہی لیکن اس نے دیمیطر لیس کو آتے دیکھا نہیں اس کی آنکھیں بند تھیں' اس کا بدن نشست پر پیچھے جھکا ہوا تھا اور اس کے بازو بے جان سے معلوم ہوتے تھے۔

وہ مصری تھی اور اس کا نام طونیہ تھا۔ اس وقت اس کا لباس عبادت والا تھا۔ ایک شوخ ارغوانی رنگ کی ہلکی پھلکی قبا اور بس نہ پیٹی نہ کوئی بند' نہ گھنڈی اور یہ قبا بالکل بے نقش تھی۔ ہاں نوکِ پستان کے پاس کالے فیتے کے دو ستارے بنے ہوئے تھے۔ اس باریک کپڑے کی قبا کا دامن جس پر استری کرنے والی کی فن کاری نے خوب صورت چنٹیں ڈال دی تھیں' طونیہ کے نازک زانوؤں کے پاس جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ اس کے سبک اور گول پاؤں میں نیلے چمڑے کے سلیپر تھے۔

اس کی جلد کی رنگت سنولائی ہوئی، ہونٹ موٹے، شانے نازک، اس کا لچکدار اور نازک جسم بھری بھری چھاتیوں کا بوجھ اٹھا اٹھا کر گویا تھک سا گیا تھا۔

وہ منہ کھولے سو رہی تھی اور امن و مسرت کے خواب دیکھ رہی تھی۔

دیمیطر لیس چپ چاپ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

آہستہ آہستہ وہ اس کے قریب ہوتا گیا۔ طونیہ پر جھک کر دیمیطر لیس نے ان سنولائے ہوئے نرم نرم شانوں سے اپنی آنکھیں جی بھر کر سینکیں جو خم گردن کے پاس نازک سے تھے اور بغلوں کے پاس پُر گوشت اور جو بغلوں کے باریک و نفیس بالوں کے سایوں کے ذریعے چھاتیوں سے اس طرح گھل مل گئے گویا دونوں چیزیں شیر و شکر ہو گئی ہیں۔

اس سے ذرا نیچے طونیہ کی کھلی کھلی قبا میں کولہوں تک ایک شگاف تھا، دیمیطر لیس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس شگاف میں داخل کیا اور بائیں پستان کے خم کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔

طونیہ ابھی سوچ رہی تھی، اس کو بدل بدل کر خواب آ رہے تھے، لیکن آ ضرور رہے تھے۔ اس کے ہونٹ کھلے تھے، اس کا سانس تیز چل رہا تھا۔ زیر لب، دبی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس کا تب زدہ سرست سے انداز میں پیچھے گر پڑا۔

دیمیطر لیس نے اسی طرح چپ چاپ نرمی سے اپنا گرم ہاتھ کھینچ لیا کہ ہلکی ہلکی ہوا سے پھر تر و تازہ ہو جائے۔

ایک طرف باغ کے بنفشئی درختوں کا دھندلا دھندلا خاکہ نظر آ رہا تھا تو دوسری طرف دامنِ شب میں دور ستاروں کے موتی ٹکے ہوئے جگمگ جگمگ کر رہے تھے اور دونوں منظروں کے درمیان اتھاہ اور امٹ سمندر ہلکورے لے رہا تھا، گویا پرانے زمانوں کے خواب جھولا تھے جن میں سمندر جھول رہا ہے۔ اب بھی ہماری نظروں کے سامنے ان بھولے بسرے خوابوں، ان مٹی ہوئی زندگانیوں کی یاد میں سمندر جھولا جھولتا ہے۔

لہریں کسی قبول صورت اور عشق انگیز پجارن کی چھاتیوں کی طرح اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہی تھیں۔ جب ہر چیز مٹ جائے گی اور قیامت سر پر ہو گی اس

وقت بھی دنیا کے آخری بسنے والے مرنے سے پہلے جھولتے ہوئے سمندر کے بھید پانے کی کوشش کریں گے۔

چاند' پانی پر اپنے خون کا پیالہ انڈیل رہا تھا۔ آدھی رات کے وقت کوئی عاشق اپنے محبوب کی گول چھاتیوں سے کھیلنے کے بعد ہاتھ کھینچ لے تو بھی تو بہت دیر تک چھوئے جانے کی وجہ سے چھاتیاں لرزتی رہتی ہیں' عین اسی طرح دور اس صاف و شفاف فضا میں (کہ ایسی آج تک زمین و آسمان کے درمیان دیکھی نہیں گئی) پانی کی سطح پر ایک سرخ شاہراہ بن گئی تھی جس میں کالے کالے تار بھی الجھے ہوئے تھے اور یہ شاہراہ رات کے روشن چراغ کے نیچے' سطح آب کے اوپر لرز رہی تھی۔

طونیہ ابھی سو رہی تھی' اس کا سر پیچھے جھکا ہوا تھا' اس کا تقریباً عریاں بدن رنگ دار ململ کے جھولوں میں لپٹا ہوا تھا۔ چاند ابھی افق کے قریب تھا لیکن اس کی روشنی کا ایک سیل ارغوانی سطح بحر کو طے کرتا ہوا اس نازنین کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا جو میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھی۔ چاند کی تیز اور انقلاب انگیز شعاعیں گویا آگ کے بے حرکت شعلوں کی طرح تھیں جن میں طونیہ نہا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ سطح نور بلند ہوتی جارہی تھی اور نوجوان مصری نازنین کو اپنی آغوش میں لے رہی تھی۔ ایک ایک کر کے اس کی مینڈھیاں ظاہر ہوگئیں اور آخر کار اس کی کنگھی پردۂ ظلمت کو چاک کر کے نمایاں ہوئی' شاہانہ کنگھی' وہی کنگھی جس پر زرینہ جان دیتی تھی اور اب ہاتھی دانت کا یہ نازک تاج جگمگاتی ہوئی کرنوں کی روشنی میں نہا کر پوری طرح چمک اٹھا' عین اس لمحے میں' ہت تراش نے' طونیہ کا نازک چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی طرف پھیرا۔

طونیہ کی آنکھیں حیرت میں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"دیمیطر لیس! دیمیطر لیس! تم ہو' آخر تم آہی گئے میری جان۔"

اس نے دیمیطر لیس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کی آواز میں بے انتہا مسرت لرز رہی تھی۔

"کیا تمہی ہو دیمیطر لیس' تمہارے ہاتھوں ہی نے کیا مجھے جگایا' تمہی ہو میری دیوی کے سپوت' میرے جسم کے دیوتا' میرے جیون کے امرت۔"

دیمیطر لیس پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن بہت جلد طونیہ اس کے قریب آگئی۔

اس نے کہا "کس بات سے ڈرتے ہو؟ تمہارے لئے میری جان! میں وہ عورت نہیں جس کے آگے لوگ باگ ڈر سے کانپتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجھ میں مندر کے بڑے پجاری کی ساری طاقت چھپی ہوئی ہے' میرا نام بھول جاؤ' دیمیطر لیس' عاشقوں کی گود میں عورتیں بے نام ہو جاتی ہیں۔ میں مندر کے بڑے پجاری کی بیوی نہیں۔ میں صرف ایک عورت ہوں جسے تم سے پریم ہے' تمہارے پریم کا رس چھاتیوں کی نوک تک میرے انگ تک میں رچ گیا ہے۔"

دیمیطر لیس چپ رہا۔

وہ کہتی گئی۔ "میری بات سنو! میں جانتی ہوں تم کسی اور کے پھندے میں پھنس گئے ہو' میں یہ نہیں چاہتی کہ تمہاری چیتی بن جاؤں یا رانی کی جگہ لے لوں' نہیں' دیمیطر لیس یہ بات نہیں۔ مجھے تو تم اپنی لونڈی سمجھو' جسے مالک گھڑی بھر کے لئے چاہتا ہے اور پھر چھوڑ دیتا ہے اور پھر جھٹ پٹ ہی اس چاہت کی یاد بھی مٹ جاتی ہے۔ مجھے تو دکھوں کی ماری بے چاری کسبی سمجھو جو سڑک کے کنارے دبکی بیٹھی رہتی ہے اور راہ تکتی ہے کہ مردوں میں سے کوئی آئے اور جانوروں کی طرح اس کے انگ کو مل دل کر پریم کا بھونڈا کھیل کھیلے' میں کون ہوں کہ ان بیچاریوں سے اپنے آپ کو بڑھ کر سمجھوں۔ دیوتاؤں نے مجھے کیا دیا ہے جو میری کمینی لونڈیوں کو نہیں دیا' اور تم۔۔۔ تم تو سر سے لے کر پاؤں تک روپ ہی روپ ہو اور تم میں وہ سب کچھ ہے جو دیوتا روپ والوں کو دیتے ہیں۔"

دیمیطر لیس طونیہ کی طرف پہلے سے زیادہ سنجیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بدنصیب عورت' تجھے پتہ بھی ہے' دیوتا کیا دیتے ہیں۔"

"پریم"

"یا موت"

طونیہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔ "کیا کہہ رہے ہو؟ موت؟ ہاں! موت! لیکن میرے لئے اتنی جلدی نہیں' آج سے ساٹھ برس بعد موت کا دھیان آئے تو آئے۔ دیمیطر لیس آج کی رات موت کی باتیں کرنے کا کیا سبھاؤ ہے۔"

اس نے سکون سے کہا۔ "موت اور آج ہی۔"

"آج ہی؟ نہیں' نہیں' کون کہتا ہے؟ کیوں مروں میں؟ بولو' بولو' جواب دو'

آج کیا نئی چھیڑ خانی نکالی ہے تم نے۔"

"فیصلہ ہو چکا ہے کہ آج تمہیں موت آئے گی۔"

"کس کے ہاتھ سے؟"

"تقدیر کے ہاتھ سے۔"

"تمہیں کیسے پتہ لگا؟"

"کیونکہ میری تقدیر اور تمہاری تقدیر کی بُنت ایک ہی ہے۔"

"تو کیا میرے لیکھ یہ ہیں کہ ابھی مروں گی؟"

"تمہاری تقدیر میں یہ لکھا ہے کہ اسی جگہ میرے ہاتھ سے ماری جاؤ۔"

اس نے طونیہ کی کلائی پکڑ لی۔

طونیہ نے خوف سے ہکلاتے ہوئے کہا "دیمیطریس' میں چیخوں گی نہیں' کسی کو مدد کے لئے نہیں بلاؤں گی' مجھے دو باتیں کر لینے دو۔"

اس نے پیشانی سے اپنا پسینہ پونچھا۔ "اگر یہاں 'اب' مجھے موت آجائے اور وہ بھی تمہارے ہاتھ سے تو میرے لئے موت کا کڑوا پن بھی میٹھا ہو جائے گا' مجھے کوئی لمنا نہیں ہے' یہی چاہتی ہوں۔ لیکن سنو!۔۔۔"

وہ دیمیطریس کا ہاتھ پکڑ کر (اس حالت میں کہ اس کے اعضاء سُست ہوتے چلے جا رہے تھے) پتھر پھلانگ کر اسے درختوں کے تاریک سائے میں لے گئی۔

پھر اس نے کہا "جو کچھ دیوتا دیتے ہیں وہ سب تمہارے ہی پاس ہے' جیون کا سب سے میٹھا انند اور موت کا تڑپا دینے والا دکھ تمہارے ہی بس میں ہیں' لیکن سنو' دیمیطریس' اپنی دونوں مٹھیاں میرے لئے کھول دو۔ جو کچھ ان میں ہے مجھے دے ڈالو' ایک مٹھی سے موت کا دکھ دو' تو دوسری سے پریم کا انند۔ یہ کرو تو بس خوشی خوشی مروں گی' ہنستی ہوئی پران تیاگ دوں گی۔"

دیمیطریس کی نگاہ جذبات سے بالکل خالی تھی' اس میں دعوتِ شوق کا کوئی جواب پنہاں نہ تھا' لیکن طونیہ کو یہ خیال ہوا کہ چپ اس کی رضامندی کی دلیل ہے۔ اب دوسری بار طونیہ کے بدن میں ایک انقلاب کے آثار ظاہر ہوئے۔ اس نے دیمیطریس کی طرف اپنا چہرہ اٹھا کر دیکھا' تازہ آرزو کے جوش نے مایوسانہ طاقت سے کام لے کر تمام خوف و خطر کے آثار کو مٹا دیا تھا۔ وہ چپ تھی لیکن ابھی سے ان ہونٹوں

میں سے (جن کے نصیب میں اب بند ہونا نہ لکھا تھا) ہر سانس کے ساتھ ایک نغمۂ عشق پیدا ہوتا تھا' گویا اس مواصلت سے پہلے ہی (جس کی آرزو میں وہ مٹی جاتی تھی) وہ محبت کی شیریں ترین لذتوں سے لطف اٹھا رہی تھی۔

موت کے پنجے میں پھنس کر ہی اس نے یہ ارفع و اعلیٰ فتح حاصل کی' ایک بار ہی اس نے اپنی ہلکی پھلکی قبا اتار کر اور گول مول سی بنا کر پھینک دی۔ اس کے تبسم میں غم کا ایک ہلکا سا اثر ہو تو ہو' اس کے تنے ہوئے نازک اور نوبہار جسم کے ایک ایک عضو میں ایک ایسی ناقابلِ بیان لذت کروٹیں لے رہی تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا گویا لذت کا یہ احساس فانی ہو ہی نہیں سکتا۔

اور جب اس کے عاشق نے (جس کا خیال کسی اور طرف تھا' یا شاید وہ صرف فکر مند اور متأمل تھا) کاروبارِ محبت کی تکمیل کی تو اس نے علوِ لذت کے احساس میں محو ہو کر پکارا۔۔۔'

"اب مارڈالو' مارڈالو مجھے دیمیطر لیس' میں پوچھتی ہوں کیا دیکھ رہے ہو؟"

اس نے اپنے ہاتھوں کے سہارے اٹھ کر ایک بار پھر طونیہ کی طرف دیکھا' جس کی بڑی بڑی آنکھیں' وجد' لذت سے لبریز' اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے طونیہ کے بالوں میں سے ایک لمبی سنہری پن نکال لی اور خوب دیکھ بھال کر بائیں پستان کے نیچے بھونک دی۔

چوتھلباب

چاندنی

یار کی بزمِ ناز میں گزری ہوئی جوانیاں

ہاں !اگر وہ چاہتا تو محبت کی ماری عورت' خود ہی وہ کنگھی' اور کنگھی کیا اپنے بال اسے دے دیتی' لیکن اس کی دیانتِ عشق نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ دستِ سوال دراز کرے۔ زرینہ کو اس بات کی ضد تھی کہ دیمیطر لیس اس کی خاطر قانون شکنی کرے۔ یہ بات نہ تھی کہ اسے ایک خاص' پرانے زمانے کی کنگھی درکار تھی جو طونیہ کے بالوں میں درخشاں تھی' اس لئے دیمیطر لیس نے محسوس کیا کہ خوں بہانا اس کا فرض ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے آپ کو یوں سمجھا سکتا تھا کہ اگر کوئی عاشق جذباتِ محبت کے ماتحت (ایک لمحہ جنون میں) قسم کھا کر کسی کا بیڑہ اٹھالے اور پھر اپنی قسم توڑ ڈالے تو اخلاقیات کے علمبردار اسے قصوروار نہیں گردان سکتے۔ خاص طور پر جب قسم توڑنے سے ایک بے گناہ عورت کی جان بچائی جاسکتی ہو لیکن اب دیمیطر لیس کے پاس اس قسم کی سوچ وبچار کے لئے وقت نہ تھا۔ اسے اپنی محبت کا ماجرا بے مثال معلوم ہوتا تھا۔ وہ اب اس ماجرائے عشق کی خونریزیوں اور ہلاکت آفرینیوں سے بچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ جب یہ کہانی ختم ہو تو کہیں اسے اس بات کا افسوس نہ رہ جائے کہ اس ترکیب محبت میں فلاں چیز کی آمیزش نہ ہو سکی اور اس ایک جزو کی کمی نے کُل کی خوبصورتی کو بدصورتی میں تبدیل کر دیا' یعنی اس ڈرامائی سین میں کہیں کوئی ایسا منظر نہ رہ جائے جو

ضروری ہو۔

اس وقت نیکی کی طرف میلان گویا کمزوری کا اعتراف ہوگا اور اس مخزنیہ (۱) کو معمولی زندگی کی طرح کاروباری اور عامیانہ بنا دے گا۔

کاسندرا (۲) کی موت (وہ اپنے آپ سے کہتا تھا) ایگامنان کے سلسلے میں کوئی ناگزیر چیز نہ تھی لیکن اگر یہ حادثہ واقع نہ ہوتا تو اور سیتا کی صناعانہ خوبصورتی ضائع ہو جاتی۔

یہی وجہ تھی کہ طونیہ کے بال کاٹ کر اور تاریخی کنگھی اپنی قبا میں چھپا کر وہ اب فوراً زرینہ کے تیسرے حکم کی تعمیل کے لئے روانہ ہوا' یعنی زہرہ کے ست لڑے ہار کی چوری۔

اس بات کا تو اسے خواب میں بھی خیال نہ آسکتا تھا کہ بڑے دروازے سے مندر میں داخل ہو۔ وہ بارہ مخنث جو دروازے کے پاسبان تھے یقیناً اسے داخل ہونے کی اجازت دے دیتے (اگرچہ حکم یہ تھا کہ کوئی شخص پجاریوں کی غیر موجودگی میں داخل نہ ہو سکتا تھا) لیکن اس نے سوچا کہ اس سادگی سے اپنے قصور کا ثبوت مہیا کرنے کی ضرورت نہیں ہے' خاص طور پر جب اسے مندر میں داخل ہونے کا ایک پوشیدہ راستہ معلوم تھا۔

دیمیطریس جنگل کے ایک سنسان حصے کی طرف روانہ ہوا جہاں دیوی کے با رتبہ پجاری دفنائے جاتے تھے۔ اس نے قبروں کا شمار کیا' ساتویں قبر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر پھر بند کر دیا۔ بڑی مشکل سے اس نے قبر کے بھاری پتھر کو ہٹایا' اس کے نیچے سنگِ مرمر کی سیڑھیاں تھیں' دیمیطریس نیچے اتر گیا۔

اسے معلوم تھا کہ ساٹھ قدم تک بخط مستقیم جانا چاہئے۔ اس کے بعد دیوار کے ساتھ ٹٹول ٹٹول کر چلنا چاہئے تاکہ زیرزمین سیڑھیوں سے ٹکر نہ لگے' جو مندر تک جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ زیرزمین راستوں کی ٹھنڈی ہوا کھا کر اس کی بے چینی کم ہو گئی۔ کچھ منٹ سفر کرنے کے بعد راستہ طے ہوا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اس نے دروازہ کھولا۔ مندر کے باہر رات روشن و تابناک تھی لیکن مندر کا حجلہ پراسرار تاریک تھا۔ اس نے نہایت احتیاط سے گونجتا ہوا دروازہ بند کیا اور ارد گرد کے پتھروں کی خنکی محسوس کر کے کانپنے لگا۔ خاموشی خوفناک تھی اور خاموشی میں رموز و اسرار لرز رہے

تھے۔اس آدمی کی طرح جو اس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں آنکھ کھلنے پر اپنے آپ کو زندہ نہ پائے‘اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا‘ آخر کار اس نے ڈرڈر کر نظریں اٹھائیں۔

پھیلی ہوئی چاندنی میں دیوی کا بت نظر آیا جو سنگ سرخ کے ایک چبوترے پر قائم تھا۔اس چبوترے پر قربانی کے خزانے بکھرے پڑے تھے۔دیوی عریاں تھی اور بت تراش نے نسوانیت کے آثارِ جنسی بھی تراش دیئے تھے۔ جسم نسوانی کے گلابی گلابی رنگ کی طرح دیوی کے بت پر بھی ہلکاہلکا رنگ سا نظر آتا تھا۔ایک ہاتھ میں پریاپس کے دستے والا آئینہ تھا‘دوسرے ہاتھ سے موتیوں کے ست لڑے ہار کو درست رہی تھی کہ اپنی جگہ پر بیٹھ جائے۔ہار کے درمیان میں ایک بڑا موتی تھا‘بیضوی‘سفید و تابناک۔

یہ موتی اس کی چھاتیوں کے درمیان لٹکتا ہوا اس طرح معلوم ہوتا تھا جس طرح بادلوں کے دو گول ٹکڑوں کے درمیان چاند۔

یہ موتی واقعی مقدس موتی تھے اور پانی کے ان قطروں سے بنے تھے جو استرتی زائید مکفِ دریا کے صدف میں غلطاں تھے۔دیمیطر لیس جذبہ پرستاری کی بے پناہیوں میں گم ہوگیا۔اس کا اعتقاد تھا کہ زہرہ خود بہ نفس نفیس موجود ہے۔اس دیمیطر لیس میں جو کبھی تھا اور جو آج دیوی کے سامنے کھڑا تھا اتنا فرق تھا کہ آج صناع خود اپنی صنعت کے شاہکار کو پہچان نہ سکتا تھا۔اس نے اپنی بانہیں پھیلا کر فریزیوی زبان میں وہ پراسرار منتر پڑھے جن سے دیوی مخاطب کی جاتی ہے۔

سنگ سرخ کے چبوترے پر دیوی کا جلوہ تابناک مافوق الفطرت غیر مادی‘ پاکیزہ و عریاں ہولے ہولے گویا لرز رہا تھا۔

اس نے دیوی پر آنکھیں گاڑ دیں۔وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اس کی ایک جنبشِ نگاہ اس نازک سے فریب نظر کے طلسم کو توڑ نہ دے۔آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر اس نے دیوی کا ننگا پاؤں چھوا‘گویا اپنے آپ کو اطمینان دلانا چاہتا تھا کہ دیوی واقعی موجود ہے۔ دیوی کے بت میں ایسی مقناطیسی تاثیر تھی کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا چبوترے پر چڑھ کر دیوی کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور اس کی آنکھوں میں گویا آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا کانپنے لگا‘غشی کی سی حالت محسوس کی‘جوشِ مسرت میں ہنسنے لگا‘ننگی بانہوں پر ہاتھ پھیرتا‘سرد اور سخت کلائی کو زور سے دباتا تھا‘سرِ عضو سے نوکِ عضو تک ہاتھ پھیرتا تھا‘دائرہ شکم پر تھپکیاں دیتا تھا۔اس نے دیوی کے آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا‘

ست لڑا ہار اٹھایا' گلے سے اتارا' چاندنی میں اس کی آب و تاب کا معائنہ کیا اور ڈر کے مارے پھر پہنا دیا۔ اس نے دیوی کی بند مٹھی' گول گلے' ابھری ابھری چھاتی اور نیم وا منہ کا بوسہ لیا' پھر چبوترے پر ذرا پیچھے ہٹ کر دیوی کی بانہیں تھام کر اس نے قابل پرستش سر کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔

دیوی کے بال مشرقی انداز آرائش کے مطابق تھے' یعنی ذرا ماتھے پر پڑے تھے' نیم وا آنکھیں گویا مسکرا رہی تھیں' ہونٹ کھلے تھے' گویا بوسوں کی لذت سے دیوی غش کر گئی ہے۔ دتیمطر لیس نے چپ چاپ تناسب کا خیال رکھ کے ہار کی ساتوں لڑیوں کو دیوی کے چمکتے ہوئے سینے پر ایک خاص ترتیب دی اور نیچے اتر کر دیکھنے لگا کہ دور سے بت کیسا دلکش معلوم ہوتا ہے۔

عین اس وقت گویا اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے یاد آیا کہ وہ کیا کرنے آیا تھا' وہ کیا چاہتا تھا اور کیا کرنے والا تھا' کیسا خوفناک اور مہیب کام' شرم سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

زرینہ کی تصویر اب اس کے ذہن میں اس طرح اتری گویا فحاشی کا ایک پیکرِ مجسم ہے' اب اسے یاد آیا کہ کسی کے حسن میں کیسے کیسے مشکوک عناصر تھے۔ وہ موٹے موٹے ہونٹ' وہ ضرورت سے زیادہ گھنے بال' وہ سست رفتاری' اسے یاد تو نہیں تھا کہ زرینہ کے ہاتھ کیسے تھے لیکن تصور میں تو وہ بڑے بڑے بدصورت ہاتھ دیکھ رہا تھا تاکہ اس تصویر خیالی میں ایک اور گھناؤنی تفصیل کا اضافہ ہو جائے۔ اس کی ذہنی حالت بالکل اس مرد کی سی تھی جو کسی بازاری عورت کے ساتھ ہم خواب ہو اور (عین گرمیٔ اختلاط میں) اس کی محبوب بیوی آ پہنچے اور پھر وہ اپنے آپ کو بھی نہ سمجھا سکے کہ پچھلی رات کس طرح گناہ کے گڑھے میں گر پڑا تھا۔

دتیمطر لیس اپنے طرز عمل کے لئے نہ کوئی معقول وجہ دیکھتا تھا نہ عذر ظاہر تھا کہ ایک دن کے لئے وہ ایک جنون عارضی' ایک اختلال جسمی' ایک مرضِ مہلک کا شکار ہو گیا تھا۔ اب اسے محسوس ہوتا تھا کہ اسے صحت ہو چکی ہے لیکن چکر آنے کی وجہ سے کمزوری کا احساس بھی کرتا تھا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے وہ مندر کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور اسی طرح دیر تک بت کی طرف دیکھتا رہا۔ چھت کے مربع شگاف میں سے' چاندنی کا سیلِ نور اسی طرح جاری رہا۔ زہرہ بڑی آن بان سے تاباں تھی'

اس کی آنکھیں تاریکی میں تھیں اور دیمیطر لیس کوشش کر رہا تھا کہ اس سے نظریں لڑ جائیں۔

رات اسی طرح گزر گئی۔ جب دن چڑھا تو پہلے دیوی کے بت پر صبح کی تیز سرخ روشنی منعکس ہوئی اور پھر دھوپ نے اپنا سنہری ورق چڑھا دیا۔ دیمیطر لیس نے فکر کرنا ترک کر دیا تھا۔ ہاتھی دانت کی کنگھی اور چاندی کا شیشہ جو اس نے قبا میں چھپائے تھے' اسے یاد بھی نہ تھے۔ وہ سر سے پاؤں تک سکون آفرین پر ستش میں محو تھا۔

باہر پرندے اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے' ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ باغ میں گانے اور چہچہانے کی آوازیں بلند ہوئیں' دیواروں کے پاس سے گزرتی ہوئی عورتوں کی باتوں اور ہنسی کی آوازیں آئیں۔ دنیائے بیدار کے ذرے ذرے سے حرکتِ صبح نمودار تھی اور دیمیطر لیس پر گویا نزولِ رحمت ہو رہا تھا۔

سورج بلند ہو چکا تھا اور چھت کا سایہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا کہ اس نے باہر کی سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنی۔ معلوم ہوتا تھا کہ عورتیں بھینٹ چڑھانے کے لئے آ رہی تھیں۔ یا تو کوئی منت مانی جائے گی یا کوئی بات پوری ہو چکی اور اب قربانی پیش ہو گی۔ زہرہ کے میلے کا پہلا دن تھا۔

دیمیطر لیس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ مقدس چبوترے کے پیچھے ایک شگاف تھا جس کی موجودگی کا علم یا پجاریوں کو تھا یا دیمیطر لیس کو' یہیں میلے کے تیسرے دن مندر کا کاہنِ اعلیٰ کھڑے کھڑے وہ الہامی کلام سناتا تھا جو دیوی نے اس کے دل میں القا کیا تھا اور ایک خوش آواز اچھوتی اس کلام کو قلمبند کرتی تھی۔ وہیں سے ایک راستہ باغ کی طرف جاتا تھا۔ دیمیطر لیس اسی راستے پتھر کے ایک دروازے کے پاس پہنچا جس کے ارد گرد کانسی کا حاشیہ تھا۔

سنہری دروازے آہستہ آہستہ کھلے' عورتوں کا جلوس اندر داخل ہوا۔

حوالہ جات

(۱) حزنیہ ؛(Tragedy)ڈرامیائی معنی میں استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ سباق عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈرامے کی اصطلاحیں اسی مقصد کے لئے استعمال ہوئی تھیں۔

(۲) کاسندرا ؛اپالو کی محبوب، جسے پیش گوئی کی طاقت بخشی گئی تھی۔ آخر ایگا ممنان کے ہتھے چڑھی، انہی کا ذکر اور سیتا میں کیا گیا ہے۔

پانچواں باب

دعوت

صلائے عام ہے یارانِ نقطہ داں کے لئے

نصف شب کا وقت ہو گا کہ کسی نے تین بار دروازہ کھٹکھٹایا اور زرینہ کی آنکھ کھل گئی۔ دن بھر وہ ان دو افیزوی نازنینوں کے درمیان لیٹی محو خواب رہی تھی اور اگر بستر کی شکنوں سے کچھ اور ظاہر نہ ہوتا تو وہ تینوں بہنیں معلوم ہوتیں۔ روڈس زرینہ کے ساتھ لگ کر سو گئی تھی۔ زرینہ کی مروارید کی پنڈلی روڈس کے بدن پر تھی۔ مرطس اس کے سینے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں زرینہ کی باہوں پر تھیں اور اس کی کمر و پشت عریاں تھی۔

زرینہ نے احتیاط سے اپنے آپ کو علیحدہ کیا' تین قدم اٹھائے' پلنگ سے اتری' دروازہ کھول کر سنا' باہر سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے پوچھا "کیا ہے جلوہ؟ کون آیا ہے؟"

"ناقریطس آپ سے ملنا چاہتے ہیں' میں کہہ تو چکی ہوں کہ آپ تنہا نہیں

"واہ آنے بھی دو' مجھے کیا کرنا ہے اب؟ کچھ بھی نہیں! آؤ ناقریطس میں اپنے حجلے میں ہوں۔"

زرینہ پھر پلنگ پر جا بیٹھی۔

ناقریطس ایک لمحہ کے لئے دہلیز پر کھڑا رہا' گویا سوچ رہا تھا کہ اندر جانا نامناسب تو نہیں' افیزوی لڑکیوں نے اپنی مدھ ماتی آنکھیں کھولیں' ابھی تک وہ سپنوں کی دنیا ہی میں تھیں۔

زرینہ نے کہا۔ "بیٹھو ناقریطس ! تمہارے سامنے نخرے تلّے کرنے کی ضرورت نہیں مجھے ! میں جانتی ہوں کہ میری خاطر نہیں آئے تم ! کہو کیا بات ہے ؟"

ناقریطس ایک مشہور فلسفی تھا جو گزشتہ بیس سال سے بیقس کی محبت کا دم بھر رہا تھا۔ اس سے وفا تو خیر' ہاں' اپنی سستی کی وجہ سے اب تک نبھا رہا تھا۔ ڈیمو سٹھینز نے جو فیشن رائج کیا تھا اس کے مطابق اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ داڑھی نوکدار تھی اور ہونٹوں کے پاس مونچھیں کٹی ہوئی تھیں۔ اس کا لباس سفید اون کا تھا جس پر چوڑی چوڑی اونی دھاریاں تھیں۔

اس نے کہا۔ "بیقس نے کچھ آدمیوں کا کھانا پکایا ہے۔ کل رات کے لئے تمہیں بلاوا دینے آیا ہوں' کھانے کے بعد رنگ رلیاں بھی ہوں گی۔ تمہارے سمیت سات آدمی ہوں گے' دیکھنا بھول نہ جانا۔"

"رنگ رلیاں' وہ کس سلسلے میں ؟"

"بیقس اپنی سب سے خوبصورت کنیز ناہید (افرودیزیا) کو آزاد کرنا چاہتی ہے۔ بنسی والیاں اور ناچ والیاں بھی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری ان دونوں سہیلیوں کو بھی بلا لیا گیا ہے اور انہیں اب جانا بھی چاہئے۔ جن کو تماشے میں حصہ لینا ہے وہ تو بیقس کے ہاں پہنچ کر مشق بھی کر رہی ہیں۔"

روڈس نے چونک کر کہا۔ "سچ تو ہے ہمیں تو بھول ہی گیا تھا۔ اٹھ مرطس ! بڑی دیر ہو گئی۔"

لیکن زرینہ نے بات کاٹ کر کہا "واہ' ابھی سے اتنی کیا جلدی ہے' ناقریطس تم بہت برے آدمی ہو' میری سہیلیوں کو چھین کر لے جاتے ہو' مجھے یہ پتہ ہوتا تو تمہیں گھر میں نہ گھسنے دیتی' ذرا دیکھنا ان دونوں نے کپڑے بھی پہن لئے۔"

روڈس نے کہا "ہمارا لباس بہت سیدھا سادا ہے اور کوئی ہم قبول صورت بھی نہیں کہ بناؤ چناؤ میں وقت گنوائیں۔"

"تو پھر کیا مندر میں ملاقات ہو گی ؟"

"ہاں کل ہم فاختہ کا جوڑا قربان کرنا چاہتی ہیں اور تم سے ایک درہم ادھار لیں گی ورنہ خریدیں گی کیسے ؟ تو بس کل ملاقات ہو گی۔"

یہ کہتی ہوئیں وہ دونوں نکل گئیں۔ ایک لمحے کے لئے ناقریطس دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سینے پر ہاتھ باندھ کر زرینہ کی طرف مڑ کر نہایت متانت سے کہا "خوب ! یہ طریقے ہیں تمہارے ؟"

"کیا ؟"

ایک نہیں دو دو' ایک سے تمہارا جی نہیں بھرتا' دو گوئیاں چاہئیں' اور گوئیاں بھی کیسی' بنسی بجانے والیاں نالیوں کا گند۔۔۔ اچھا نمونہ پیش کر رہی ہو تم اور یہ تو بتاؤ ہم مرد کیا کریں ؟ ہمارے لئے رہ کیا گیا ؟ جس کسبی کو دیکھو' ایک نہ ایک دوگانہ' یا گوئیاں پر مرتی ہے' مردوں کے پاس جاتی ہو گی تو کیا رہ جاتا ہو گا۔ گوئیاں نے کوئی چنگاری چھوڑی ہو تو شاید کوئی بات بنے' نہیں تو راکھ ہی راکھ۔ اس طرح کب تک گزارا ہو گا بس اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم مردبائی تھالوس (۱) کے پاس چلے جائیں گے۔"

زرینہ نے کہا "نہیں نہیں۔ ایسا نہ کہو' تمہیں ایسے کہنے کا حق نہیں ہے' میں جانتی ہوں کہ لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں لیکن ان دونوں چیزوں میں بڑا فرق ہے' کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ لوگ یوں ہی بیہودہ بکتے ہیں' میں تو حیران ہوں کہ تم نے ایسی بات کس طرح کی' سوچ بچار کرنا تو تمہارا پیشہ ہے' کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ؟"

"کیا فرق ہے دونوں میں ؟"

"فرق کیا بتاؤں' دونوں میں کوئی چیز ایک جیسی بھی ہو ؟"

"میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم غلط کہہ رہی ہو' لیکن تمہاری دلیلیں ضرور سننا چاہتا ہوں۔"

"یہ کیا مشکل ہے' لو سنو ! جہاں تک محبت کا تعلق ہے' عورت کا جسم ایک ساز ہے' جیسی سُر چاہو نکال لو' سَر سے لے کر پاؤں تک وہ محبت ہی کے لئے بنائی گئی ہے' یہ ایک معجزہ ہے' اس کی نظیر نہ کوئی ہے نہ ہو گی' بس عورت ہی جانتی ہے کہ پیار کس طرح کیا جاتا ہے اور کس طرح کروایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں کا جوڑا محبت کے سلسلے میں بے نظیر ہے' مکمل ہے۔ جوڑے میں ایک عورت ہو اور ایک مرد تو لطف

آدھا رہ جاتا ہے اور اگر عورت ہو ہی نہیں (یعنی مردوں کا جوڑا ہو) تو کوئی سر پھرا ہی اس بات کو پسند کرے گا۔ یہی کہنا تھا مجھے۔"

ناقریطس نے کہا "لڑکی! یہ تو افلاطون (۲) پر بڑی سخت تنقید ہوئی۔"

یہ بات تھوڑا ہی ہوتی ہے کہ بڑے آدمی ہر طرح بڑے ہی ہوں' دیوتا بھی تو ہر طرح سے مکمل نہیں ہوتے (بڑے آدمیوں کی سنو) پلاس کو لین دین کی خبر ہی نہ تھی' سوفاکلیز مصوری سے کورا تھا' افلاطون کو محبت کرنے کا فن نہ آتا تھا اور وہ فلسفی' شاعر اور خطیب بھی جو افلاطون کی پیروی کرتے ہیں یہ فن نہیں جانتے' افلاطوں کی طرح کورے ہیں' وہ فنکار ہوں گے باکمال' لیکن عاشقی کے معاملے میں تو نرے بدھو ہیں' مان لو ناقریطس کیونکہ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔"

فلسفی نے اپنے ہاتھ ہلا کر کہا "لڑکی تو ذرا گستاخ تو ضرور ہے پر۔۔۔ یوں نظر آتا ہے کہ بات تیری سچ ہے۔ میں تو یونہی جھوٹ موٹ خفا ہو رہا تھا' ہاں' دو عورتوں کی باہمی محبت بڑی دلکش چیز ہے' لیکن شرط یہ ہے کہ دونوں نسوانیت نہ کھو بیٹھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کا تعلق حیرت انگیز ہے کیونکہ ان کا پیار بالکل سطحی ہوتا ہے' اسی لئے ان کی مسرتیں زیادہ لطیف ہوتی ہیں' ان کی ہم آغوشی میں وحشیانہ گرمی نہیں ہوتی۔ وہ تو گویا ایک دوسرے کے ساتھ چھو کر ہی لذت کے انتہائی نقطہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان کی شب عروسی کا دامن خون سے داغدار نہیں ہوتا' وہ اچھوتیاں ہی رہتی ہیں۔ عورتیں اس معاملے میں بائی تھالوس سے کہیں زیادہ رتبہ رکھتی ہیں کیونکہ ان کے تعلق میں بدمزیت نہیں ہوتی۔ یوں بائی تھالوس کہتا تو ہے کہ وہ تمہارا حریف ہے' لیکن شاید اسے یاد نہیں رہا کہ جو کھیل وہ کھیلتا ہے اس میں بھی تم اس کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ جانوروں کی مجامعت اور انسان کی مواصلت میں صرف یہی فرق ہے کہ انسان بوسہ لے سکتا ہے' اختلاط کر سکتا ہے اور جن عورتوں کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ صرف بوسہ اور اختلاط ہی سے آشنا ہیں' گویا کہ انہوں نے تو بوسہ بازی اور اختلاط کاری کی تکمیل کی ہے۔"

زرینہ نے کہا "آپ نے انصاف کی بات کہی ہے۔ اچھا اب یہ تو فرمائیے کہ آپ کو ہم سے شکایت کیا ہے؟"

ناقریطس نے جواب دیا "یہ کہ ایسی عورتوں کی تعداد اس وقت ایک لاکھ ہے' بہت سی تو ایسی ہیں کہ اپنی جنس کے سوا پوری طرح لذت یاب ہی نہیں ہو سکتیں ایسا

وقت آن لگا ہے کہ شاید تم ہم سے بالکل ملنا ہی پسند نہ کرو' گو یاں نہ ملے تب بھی تم ہم سے نہ ملو۔ یہ ڈر' یہ شک ہے جس کی وجہ سے تمہاری شکایت کرتا ہوں۔"

اس مرحلے پر ناقریطس نے محسوس کیا کہ باتیں بہت ہو چکی ہیں' وہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا" تو کیا ہیقس سے کہہ دوں کہ تم آؤ گی ؟"

زرینہ نے جواب دیا" آؤں گی۔"

فلفی نے زرینہ کے زانوؤں پر بوسہ دیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

ناقریطس کے جانے کے بعد زرینہ نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر (حالانکہ وہ تنہا تھی) بلند آواز میں کہنا شروع کیا :

"ہیقس ۔۔۔۔۔۔ ہیقس ۔۔۔۔۔۔ وہ اسی گھر سے آ رہا تھا لیکن اسے کچھ خبر نہ تھی ۔۔۔۔۔۔ کیا شیشہ ابھی تک وہیں ہے ؟ کیا دیمطر لیس مجھے بھول گیا ؟ اگر اس نے فوراً چوری نہیں کی تو پھر کبھی نہ کرے گا۔ میں تو برباد ہو گئی ؛ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے شیشہ نکال لیا ہو ؛ ہیقس کے پاس اور شیشے بھی تو ہیں اور اکثر وہ انہیں استعمال کرتی ہے ؛ ہائے کیسے پتہ لگاؤں' کوئی طریقہ تو ہے ہی نہیں ۔۔۔۔۔۔ شاید ۔۔۔۔۔۔ جلوہ ! جلوہ ! !"

کنیز حاضر ہوئی۔

"ذرا میرا پانسہ تو لانا' اپنی تقدیر دیکھتی ہوں۔"

جلوہ نے پانسہ دیا تو زرینہ نے پھینک کر کہا :

"دیکھنا جلوہ ! دیکھنا"۔

زہرہ کی شکل اس وقت پیدا ہوتی سمجھی جاتی تھی جب پانسہ پھینکنے کے بعد ہر مہرے کی صورت دوسرے سے مختلف ہو' پینتیس بار پانسہ پھینکنے میں شاید ایک بار یہ شکل بنتی ہو' اس کھیل میں گویا یہ شکل پوبارہ کی تھی۔

جلوہ نے سرد مہری سے دیکھ کر کہا" یہ بات تو مجھے بھول ہی گئی کہ دل میں کوئی آرزو رکھ لوں' کچھ سوچ تو رہی تھی لیکن زبان سے کہنا بھول گئی تو پھر اب یہ داؤ بیکار ہو گیا ؟"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے' اچھا پھر تو بھلا پھینک کر دیکھئے"

زرینہ نے پھر پانسہ پھینکا' اس بار میڈا اس کی شکل قائم ہوئی۔

زرینہ نے کہا "بولو اب کیا چاہتی ہو؟ میڈاس کی شکل بنی ہے۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتی، اچھی بھی ہے بری بھی، ایک بار پھر پھینکئے، تب پتہ لگے گا، اب کے صرف ایک مہرہ پھینکئے۔"

زرینہ نے پھر پانسہ پھینکا، لیکن ساتھ ہی گھبرا کر بولی: "اف کیا اس کا یکہ۔"

جلوہ بھی گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی، وہ خاموش رہی، زرینہ بستر پر لیٹی بالوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد غضبناک ہو کر اس نے پہلو بدلا اور کہا: "تم نے مجھے بار بار پانسہ پھینکنے کے لئے کیوں کہا تھا، مجھے یقین ہے کہ پہلی بار جو میں نے پانسہ پھینکا تھا وہ شمار ہو سکتا تھا۔"

جلوہ نے کہا "اگر آپ کے دل میں کوئی آرزو تھی تو ہاں؛ لیکن اگر کوئی خاص بات دل میں نہیں تھی تو نہیں، آپ ہی کو خبر ہو گی۔"

زرینہ نے کہا: "خیر پانسے سے ہوتا بھی کیا ہے، ایک یونانی کھیل ہے، مجھے اعتبار ہی نہیں، میں تو کچھ اور کرتی ہوں۔"

اس نے اپنے آنسو خشک کئے اور چلتی ہوئی ان سفید مہروں کے پاس جا پہنچی جو ایک طاق پر پڑے تھے۔ اس نے تیئیس مہرے گن کر اٹھائے۔ بڑی متانت سے موتیوں کے ایک جڑاؤ بند کی نوک سے اس نے مہروں پر عبرانی زبان کے حروف تہجی کھودے، جلیل میں جو اس نے بنی اسرائیل کا فنِ دقیق سیکھا تھا، یہ حروف اس فن کے اسرار و رموز کے حامل تھے۔

مجھے تو انہی پر اعتقاد ہے، دھوکا تو نہیں دیتے نا! ذرا دامن اونچا رکھو، میں اس سے تھیلے کا کام لینا چاہتی ہوں۔"

اس نے جلوہ کے دامن میں ۲۳ مہرے پھینک دیئے، ساتھ ساتھ دہراتی جاتی تھی "کیا میں زہرہ کا ہار پہنوں گی؟ کیا میں زہرہ کا ہار پہنوں گی؟"

اور اس کے نصیب! دسواں مہرہ نکلا، جس کا صاف مطلب تھا: "ہاں"۔

حوالہ جات

(۱) بائی تھالوس ؛نو عمر ، خوش رُو نوجوان ! ناقریطس یہ دھمکی دیتا ہے کہ عورتیں عورتوں سے محبت کرتی رہیں تو مردمردوں سے پینگیں بڑھائیں گے۔

(۲) افلاطون ؛اس بزرگ فلسفی کے نام سے 'افلاطونی محبت' کی پُر مغز ترکیب انگریزی میں داخل ہوئی ہے۔ قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ مفہوم کیا ہے۔

چھٹا باب

زرینہ کا گلاب

بلا سے ہو خفا وہ خوگرِ ناز بہت رنگیں ادا ہیں بر سرِ ناز
ہوئی یہ جنس ارزاں ایدل ایدل

دیمیطریس نے جو عورتوں کا جلوس دیکھا تھا وہ گویا مختلف رنگوں کا ایک جلوس تھا' سفید و نیلگوں۔۔۔۔۔۔زرد و سرخ و سبز۔

تیس کسبیاں آگے بڑھیں' ان کی ٹوکریوں میں سرخ پنجوں والی برف کی طرح سفید فاختائیں تھیں' لاجوردی رنگ کے نہایت باریک نقاب تھے' نایاب زیور تھے۔ آگے آگے ایک سفید ریش معمر پجاری تھا۔ سر سے پاؤں تک سخت' ناشستہ' کفنی میں ملبوس' جو خم شدہ عبادت گزاروں کو پتھر کے چبوترے تک پہنچاتا تھا۔

کسبیاں گا رہی تھیں' ان کے گیت میں کھنچاؤ تھا' جس طرح سمندر کی لہروں کی صداؤں میں ہوتا ہے۔ ان کے گیت میں کراہنے کی آوازیں تھیں' گویا دوپہر کی ہوا آہیں بھر رہی ہے' ان کے گیت میں لرزش تھی' جس طرح کسی کا عشق انگیز دہن لرزاں ہوتا ہے۔

آگے جو دو کسبیاں تھیں ان کے پاس چنگ تھے' بائیں ہاتھ کی کہنی کے خم میں سنبھلے ہوئے' نازک شاخوں کے داس نما خطوط کی طرح آگے کی طرف جھکے ہوئے۔

ایک کسبی نے آگے بڑھ کر کہا؛

"پیاری قائپرس! (۱) لے' یہ نقاب تیری نذر ہے' جو طرفہ نے خود بُنا ہے کہ تو اس پر مہربان رہے۔"

کسی اور نے کہا۔ "اے سنہری تاج والی دیوی! لے مسارین تیری درگاہ میں گل خیرو کے ہار اور لہراتے ہوئے بروق بھینٹ چڑھاتی ہے' میں نے ان پھولوں کو عیش کے جلسوں میں پہنا ہے' اور ان کی مہک سے مست ہو کر تیرے نام کو سراہا ہے۔ اے فتح مند دیوی' محبت کی یہ لوٹ قبول کر۔"

کسی اور نے کہا۔ "اے سنہری سائتھیریا' لے ٹیمو' یہ پیچدار چوڑیاں تیری نذر کرتی ہے' اس سے میرا بدلہ لے' جسے تو خوب جانتی ہے' تیرے انتقام کے ہاتھ اس طرح گلو گیر ہوں جس طرح کبھی یہ چاندی کا سانپ ان ننگی بانہوں سے لپٹا ہوا تھا۔"

مرطس اور روڈس' ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھیں اور کہا؛

"لے' سمرنا کی دو فاختائیں' ان کے پر پیار کی طرح سفید' ان کے پنجے بوسوں کی طرح لال' اے ایماتھانٹس کی دو جنسی دیوی' اگر یہ سچ ہے کہ شریف ایڈونس تجھ سے پورا نہیں اترتا اور کبھی کبھار کسی اور کی گود میں تو محبت کی مٹھاس سے مست ہو کر نیند لینا بھول جاتی ہے' تو ہم دونوں سے یہ نذر لے!"

ایک اور کم عمر کسبی نے کہا؛

"اے افروڈائٹ! اس خون آلود لباس کے ساتھ ہی میرا کنوارپن بھی نذر لے' میں فیرس کی پیٹی فس ہوں' کل رات میں تیری ہو گئی۔"

کسی اور نے کہا؛ "اے مہربان اپسٹروفیا! میں ڈور تھی تیری منت کرتی ہوں کہ یا تو میرے دل سے وہ تمنا کا پودا اکھاڑ کر پھینک دے جس کے بیج کام دیو نے بوئے تھے' یا اس کی آنکھوں میں بھی محبت کی آگ بھڑکا دے جو مجھ سے کھنچا کھنچا رہتا ہے' لے یہ موردانہ کی شاخ تیری نذر ہے کہ یہ شاخ تجھ سے منسوب ہے۔"

کسی اور نے کہا۔ "اے پیفیا! لے' کیلستین تیری درگاہ پر چاندی کے ساٹھ درہم بھینٹ چڑھاتی ہے' کلومنیز نے جو اسے چار سو درہم دیئے تھے اس میں سے یہی باقی ہے' اگر یہ قربانی تجھے پسند آئے تو مجھے کلومنیز سے زیادہ دریادل عاشق بخش۔"

اب چبوترے کے سامنے ایک کم عمر لڑکی رہ گئی تھی جس کا چہرہ شرم سے

تمتمارہا تھا' وہ متأمل معلوم ہوتی تھی اس کے ہاتھ میں زعفران کے پھولوں کا چھوٹا سے ہار تھا۔ اور پجاری اس بے حقیقت بھینٹ کو دیکھ کر اس کم عمر لڑکی کی طرف سے بے پروا نظر آتا تھا۔"

اس نے کہا؛

"اے چمکنے والی دیوی! میرے پاس چاندی کے ٹکڑے نہیں کہ بھینٹ چڑھا سکوں' میرے پاس دولت نہیں اور میں تجھے کیا دوں گی؟ تیرے پاس کیا نہیں ہے؟ لے یہ پھول ہیں' سبز' زرد' میں نے ان کا ہار گوندھا ہے کہ تیرے قدموں پر رکھ دوں اور اب۔۔۔۔۔"

اس نے اپنی عبا کے بند کھولے' عبا زمین پر گر پڑی اور اب وہ دیوی کے سامنے ننگی کھڑی تھی؛

"دیوی' پیاری! میں تیری ہوں' صرف تیری! میں دعا مانگتی ہوں کہ تیرے باغ میں داخل ہو کر تیری کسبی ہو جاؤں اور کسبی ہی مروں' میں قسم کھاتی ہوں کہ محبت کے سوا کسی چیز سے محبت نہ کروں گی' میں نے دنیا تیاگ دی اور تجھی کو اپنی پناہ بنالیا۔"

اب پجاری نے اس پر عطر چھڑک کر' اس کی عریانی کو طرفہ کے نقاب سے چھپا دیا۔ وہ دونوں اس دروازے سے باہر چلے گئے جو باغ میں کھلتا تھا۔

جلوس ختم ہو چکا تھا اور کسبیاں جانے کو تھیں کہ ایک عورت جو دیر سے آئی تھی' دروازے کے پاس کھڑی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا' یوں سمجھئے گویا وہ صرف اپنا حسن بھینٹ چڑھانے آئی تھی۔ اس کے بال۔۔۔ بہت گھنے بال' سونے کے ڈھیر معلوم ہوتے تھے۔ ان گھنے سایہ دار بالوں کے لہراتے ہوئے لچھے اس کی پیشانی پر پڑے تھے' جن میں اس کے کان بالکل چھپ گئے تھے اور گردن پر سات بار بل دے کر ان کا جوڑا باندھ دیا گیا تھا۔ اس کی ناک نفیس و نازک تھی' پر گوشت سرخی آلود لبوں پر (جن کے گوشے خمدار اور شیریں حرکات تھے) گاہ گاہ پھڑکنے والے نتھنے' جذباتِ دلی کا اظہار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چلنے میں اسکے جسم کے ملائم خطوط لچکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی چھاتیوں کی حیات آفریدہ لرزشوں' اس کی لچک دار کمر اور اس کے مٹکتے ہوئے کولہوں کی وجہ سے اس کی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کی

آنکھیں حیرت انگیز تھیں' نیلگوں لیکن گہری' تابناک وروشن' اور حجرالقمر کی طرح ان آنکھوں کی روشنی ہر آن بدلتی ہوئی نظر آتی تھی۔ جھکے ہوئے پپوٹوں کے نیچے اس کی آنکھیں نیم وا معلوم ہوتی تھیں' پرانے زمانے کی جادوگرنیوں کے گیتوں کی طرح اس کی آنکھیں تھیں۔

پجاری نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور منتظر رہا کہ وہ خود سلسلۂ کلام شروع کرے۔

اس عورت نے کہا؛ "اے زہرہ! زرینہ تیرے سامنے حاضر ہے' دست بستہ! لے یہ بے حقیقت تحفے قبول کر جو تیرے قدموں پر رکھتی ہے' سن! اسے محبت کی نعمت بخش اور اسے تسکین دے جو تیرے نمونے پر چلتی ہے اور تیری پرستش کے لئے زندہ ہے۔"

اس نے اپنے ہاتھ بڑھائے جو سنہری معلوم ہوتے تھے اور پاؤں جوڑ کر' سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر وہی مبہم سا جاپ شروع ہوا' پجاری کی انگیٹھی میں جو بخورات جلائے جا رہے تھے' ان کے پیچ دار دھوئیں کے ساتھ ہی گویا' چنگ کی دھیمی سروں نے بت کی طرف صعود کرنا شروع کیا۔

زرینہ نے کہا؛

"اے استرتی! اے شب گیر دیوی! تو جو ہاتھوں اور لبوں کو ملاتی ہے' تیرا نشان عین اسی طرح ہے جس طرح شام کی زرد زمین پر سرخ آہو کے پاؤں کا نقش' لے زرینہ یہ شیشہ تیری بھینٹ چڑھاتی ہے۔ اے دیوی! اے ہاتھوں کی مجنونانہ حرکتوں والی جنگجو! جسم کو جسم سے اور لبوں کو لبوں سے ملا دینے والی سن! اس شیشے نے آنکھوں کے نیچے گہرے کالے حلقے دیکھے ہیں' مجلسِ عشق کے بعد آنکھوں کی چمک دمک دیکھی ہے' عیش ولذت کی کشمکش کے بعد پسینے سے بالوں کا کنپٹیوں کے ساتھ چپک جانا دیکھا ہے۔"

پجاری نے آئینہ بت کے پاؤں کے پاس رکھ دیا' اب زرینہ نے اپنے سنہری بالوں میں سے سرخ تانبے کی کنگھی نکالی' اس دھات کی کنگھی جو دیوی سے منسوب ہے' پھر کہا؛

"اے اناڈومین! (۲) تجھے زرینہ یہ کنگھی نذر کرتی ہے تو جو خون کی طرح

سرخ صبح اور دریائی جھاگ کے قہقہے سے پیدا ہوئی تھی' تو جس کے ننگے بدن سے پانی کے قطرے' چمکتے ہوئے موتیوں کی طرح ٹپک رہے تھے' تو جس نے اپنے گیلے بالوں کو سمندر کی سبز گھاس سے باندھ لیا تھا' سن رکھ ! کہ یہ کنگھی ان بالوں میں رہ چکی ہے جو تیری پیدا کی ہوئی بے چینی میں بکھر بکھر چکے ہیں۔ سن ! اے ایڈونس کی ہانپتی ہوئی معشوقہ ! کولہوں کو دکھ دینے والی' کھنچے اور تنے ہوئے زانوؤں کو سست کرنے والی سن !"

اس نے کنگھی بوڑھے پجاری کے حوالے کر دی اور ایک طرف سر جھکا کے زمرد کا ہار گلے سے اتارا پھر کہا ؛

"اے ہتیارہ ! (۳) تو جو حیادار کنواری کے چہرے سے شرم کی سرخی کو مٹا دیتی ہے اور فحش قہقہوں کی رغبت دلاتی ہے' تو جس کی خاطر ہم اس محبت کو بیچ دیتے ہیں' جو ہماری انتڑیوں سے ایک گرم رَوبن کر باہر آتی ہے' زرینہ سے یہ ہار قبول کر' یہ اس عاشق کا نذرانہ ہے جس کا نام میں نہیں جانتی' اس ہار کا ہر ایک زمرد' ایک بوسہ ہے جس میں تو خود ایک' لمحے کے لئے بس گئی تھی۔"

زرینہ نے اپنا سر جھکا لیا اور کچھ دیر تک اسی طرح کھڑی رہی۔ پھر اس نے ہار پجاری کے ہاتھ میں دے دیا' اور جانے لگی' لیکن پجاری نے اسے روک کر پوچھا ؛

"ان قیمتی تحفوں کے عوض تم دیوی سے کیا چاہتی ہو ؟"

زرینہ مسکرائی اور سر ہلا کر کہا ؛ "کچھ نہیں۔"

پھر وہ جلوس کے پاس سے گزرتی ہوئی آہستہ آہستہ نکل گئی' لیکن راہ میں کسی کی ٹوکری سے ایک گلاب کا پھول نکال کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔ کنبیاں ایک ایک کر کے اس کے پیچھے روانہ ہوئیں' مندر خالی رہ گیا۔ دروازہ بند کر دیا گیا' دیمطر لیس تنہا رہ گیا' تانبے کے چبوترے پر بیٹھا' وہ ہر ایک حرکت کا مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ اس نے ہر لفظ سنا تھا اور جب سب کچھ ختم ہو چکا تو وہ بہت عرصہ تک وہیں بیٹھا رہا' بے حس و حرکت' عذاب و نفسانیت اور شکوک کا شکار' وہ سمجھتا تھا کہ کل کی دیوانگی کا دورہ ختم ہو گیا' اور اب کوئی طاقت اسے اس نامعلوم عورت کے جلتے ہوئے سائے میں نہیں پھینک سکتی۔ لیکن اس نے زرینہ کی طاقت کا غلط اندازہ کیا تھا۔

عورت ! اے عورت ! اگر تو چاہتی ہے کہ تجھ سے محبت کی جائے تو

آنکھوں کے سامنے رہ' زرینہ کے آنے سے اس کے دل میں جو جذبات پیدا ہوئے تھے وہ ایسے گہرے' ایسے قطعی تھے کہ وہ یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ اپنی پوری قوتِ ارادی سے ان کا مقابلہ کرے' وہ محبت میں اس طرح اسیر ہو چکا تھا' جس طرح کوئی بربری غلام فاتح کی رتھ کے ساتھ زنجیروں میں بندھا' کھنچا جاتا ہے' رہائی ایک فریب خیال تھی' زرینہ نے بنا جانے بوجھے' اپنے کارنامے سے بے خبر' پھر دیمیطر لیس کو تسخیر کر لیا تھا۔

دور ہی سے اس نے زرینہ کو آتے دیکھ کر پہچان لیا تھا' کیونکہ اس کے بدن میں زرد رنگ کا وہی لباس تھا جو اس نے مہتابی کے قریب دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑی نزاکت سے ہولے ہولے کولہے مٹکاتی چلی آ رہی تھی۔ وہ سیدھی اسی کی طرف آئی' گویا پتھر کے پیچھے اس کی موجودگی کی کسی طرح اسے خبر ہو گئی تھی۔

پہلے لمحے ہی سے اس کی یہ حالت تھی کہ زرینہ کے پاؤں پر سر رکھ دینے کو جی چاہتا تھا۔ جب وہ پیٹی میں سے تانبے کا شیشہ نکال کر ایک لمحے کے لئے اس میں اپنی شکل دیکھنے کے لئے رکی تو اس وقت اس کی آنکھیں غضب کی روشن معلوم ہوئیں' اور جب تانبے کی کنگھی نکالنے کے لئے اس نے پرانے زمانے کی دیویوں کی طرح بڑے انداز سے ہاتھ اٹھا کر اپنے بال چھوئے تو اس کی قبا کے نیچے اس کے بدن کے خوبصورت و طویل' خطوط و خم ناگاہ ابھر آئے' اور سورج کی شعاعوں سے اس کی بغل میں پسینے کے کم تاب قطرے شبنم کی طرح چمکنے لگے اور جب زمرد کا بھاری ہار اتارنے کے لئے اس نے دوہرے ریشم کا وہ لباس پرے کیا جس کی تہوں میں چھاتیوں سے لے کر اس شیریں مقام تک جس پر تاریکی کا سایہ تھا اور جہاں پھول سے زیادہ کسی چیز کے رکھنے کی جگہ نہ تھی' اس کے بدن کا ہر حصہ پوشیدہ تھا تو دیمیطر لیس کا دل اس مجنونانہ خواہش سے مضطرب ہو گیا کہ اس شیریں مقام کا بوسہ لے کر اس کی قبا کو پارہ پارہ کر دے' لیکن زرینہ نے سلسلۂ کلام شروع کر دیا تھا۔

وہ بول رہی تھی اور اس کا ایک ایک بول دیمیطر لیس کے دل پر تیر کی طرح لگتا تھا۔ وہ گویا مزے لے لے کر بڑی تفصیل و تاکید سے' خوب کھلے کھلے الفاظ میں' بیان کرتی رہی تھی کہ کس کس طرح اس نے اپنے اس مینائے حسن و جمال کو یعنی اپنے جسم کو جو دیوی کے بت کی طرح سفید تھا اور جس کے سر پر لہراتے ہوئے سنہرے بالوں کا

تاج تھا' پیچ پیچ ڈالا ہے' داغدار کر دیا ہے۔ اس نے بیان کیا کہ اس کا دروازہ ہر مسافر کے لئے کھلا تھا اور اس کی آغوش ہر مسافر کی آرزوئے سرسری کے لئے وا تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا جسم بد سرشت آدمیوں کے حوالے کیا جاتا رہا تھا جنہوں نے جی بھر کے مطالعہ حسن کیا تھا' اس نے ظاہر کیا تھا کہ وہ کوشش سے ایسے ناتجربہ کار لڑکے مہیا کرتی تھی جو اس کے گالوں کو نفسانیت کی آگ سے سرخ کر دیتے تھے۔ اس نے اپنی آنکھوں کی ہوس آفریدہ خستگی اور تھکاوٹ پر غرور کا اظہار کیا تھا۔ اس نے اپنے رات کی رات کیلئے کرائے پر دیئے جانے والے لبوں' کرخت ہاتھوں سے پریشان ہونے والے بالوں اور اپنی الوہیت کی ناپاکی کا افسانہ خوب تن تن کر سنایا تھا لیکن دیمیطر لیس اسی لئے اس کی طرف کھنچا جاتا تھا کہ ہر شخص اسے حاصل کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب صرف وہ زرینہ کے جسم سے لذت یاب ہو گا اور اپنے سوا تمام کے لئے ہمیشہ کے واسطے زرینہ کا باب نشاط بند کر دے گا کیونکہ سچ یہ ہے کہ عورت صرف اس وقت مکمل طور پر بے پناہ ہوتی ہے جب مرد کے دل میں رشک کی آگ مستعمل ہو جائے۔

تو یوں ہوا کہ جب زرینہ اپنا سبز ہار دیوی کی بھینٹ چڑھا کر اس سے زیادہ قیمتی ہار کی امید میں محو شہر کی طرف جا رہی تھی اس کے منہ میں صرف ایک گلاب کا پھول ہی نہیں تھا جس کی بُن کو وہ چبا رہی تھی بلکہ دیمیطر لیس کی قوتِ ارادی بھی اس کے ساتھ ہی کچلی جا رہی تھی۔

دیمیطر لیس منتظر رہا کہ مندر خالی ہو جائے' پھر وہ باہر نکلا۔ اس نے دیوی کے بت کی طرف بے چین نگاہوں سے دیکھا' گویا اپنے اندر کسی کشمکش کا متوقع تھا۔ لیکن اپنے اندر' اپنے دل میں' اتنی جلد' ایسا شدید و قوی جذبہ از سرِ نو پیدا کرنے کے نااہل ہو چکا تھا۔ وہ حیرت انگیز طور پر سکونِ قلب کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کا دل پیش روندامت سے بالکل خالی تھا۔

بے پروایانہ وہ چبوترے پر چڑھا' زہرہ کی خم دار گردن سے موتیوں کا ست لڑا ہار اتار لیا اور اپنی عبا میں چھپا لیا۔

حوالہ جات

(۱) قائپرس' سائیتھیزیا' اپیسٹروفیا' پیفیا' افروڈائٹ' دیوی زہرہ کے نام ہیں۔

(۲) اناڈومین ؛زہرہ کا نام۔

(۳) ہتیارہ ؛دیوی زہرہ کا ایک اور نام۔

ساتواں باب

طلسمی رباب کا افسانہ

یہ لوگ بھی عجب ہیں کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا ، سحر آہن بنا لیا

اس امید میں کہ شاید زرینہ سے جا ملے ' دیمیطر لیس تیز تیز شہر کی طرف واپس روانہ ہوا۔ علاوہ ازیں اس بات سے بھی ڈرتا تھا کہ اگر رکا رہا تو شاید پھر ہمت ہار جائے اور اپنی قوتِ ارادی کھو بیٹھے۔ گرم ' سفید شاہراہ ایسی تابناک تھی کہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ' گویا سورج کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس طرح گویا سامنے کچھ نہیں دیکھ رہا۔ چلتا رہا اور قریب تھا کہ ان چار حبشی غلاموں سے ٹکرا جائے جو ایک مختصر سے جلوس کے آگے آگے چلے آرہے تھے۔ عین اس وقت کسی کی دھیمی اور میٹھی آواز کان میں آئی ؛ "پیارے دیمیطر لیس خوب ملے جی خوش ہو گیا۔"

اس نے اپنا سر اٹھا کر دیکھا ' ملکہ بیرینیس فرمانروائے مصر اپنے محمل میں کہنی کے سہارے لیٹی نظر آئی۔ اس نے کہاروں کو حکم دیا ؛ "ٹھہرو" اور اپنے عاشق کی طرف دیکھ کر اپنی بانہیں پھیلا دیں ' دیمیطر لیس جھجھلایا تو ضرور لیکن انکار بھی نہیں کر سکتا تھا ' طوعاً و کرہاً اندر داخل ہوا۔

جوشِ مسرت کی دیوانگی میں ملکہ مصر ' زانوؤں اور ہاتھوں کے بل رینگ کر محمل کے ایک کونے میں جا پہنچی اور نرم نرم گدیلوں کے درمیان لیٹ کر اس طرح کی

حرکتیں کرنے لگی جو کھلنڈری بلی سے مخصوص ہیں۔

محمل کیا تھا' ایک بڑا حجرہ تھا جسے چوبیس کہار اٹھا کر چلتے تھے' اس کے گداز نیلے نیلے غالیچوں پر اور نرم نرم گدوں پر بارہ عورتیں بہ آسانی آرام کر سکتی تھیں' اس کی چھت اتنی اونچی تھی کہ کوئی شخص اسے ہاتھ سے چھو نہ سکتا تھا' ہاتھ میں پنکھا لے کر بھی نہیں۔ اس کی چوڑائی سے اس کی لمبائی زیادہ تھی آگے کی طرف بند تھا اور تینوں طرف ہلکے زرد رنگ کے پردے پڑے تھے جو روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ پشت کا تختہ سرو لبنان کی لکڑی سے بنایا گیا تھا۔ اس پر نارنجی ریشم کا پردہ پڑا تھا۔ اس تختہ چوب کے اوپر مصر کا عظیم الشان سنہری عقاب اپنے مہیب عرض میں سایہ فگن تھا اور نیچے ایک چراغ کے پاس' جس کی گریزاں تابناکیاں نورِ صبح کا مقابلہ کرتی تھیں' استرتی کا مخصوص نشان قائم تھا۔ جو منقوش ہاتھی دانت اور چاندی سے ترتیب دیا گیا تھا۔

وہیں ملکہ بیرنیس لیٹی تھی' دائیں بائیں دو ایرانی کنیزیں مور چھل کر رہی تھیں۔

جنبشِ چشم سے ملکہ نے اس نوجوان بت تراش کو اپنے پاس بلایا اور پھر کہا؛ "پیارے خوب ملے' جی خوش ہو گیا۔"

ملکہ نے دیمیطر لیس کے رخساروں پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرا اور پھر کہا؛ "تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی تھی' پیارے کہاں تھے تم؟ دو دن ہوئے ہیں تمہارا مکھڑا نظر نہیں آیا' اس وقت تم مل نہ گئے ہوتے تو غم کے مارے مر گئی ہوتی۔ اس بڑے محمل میں اکیلی بیٹھی بیٹھی اکتا گئی تھی۔ جب پالکی ہرمیز کے پل سے گزر رہی تھی تو میں نے اپنے تمام زیور پانی میں پھینک دیئے کہ دیکھوں کیسے گول گول چکر بنتے ہیں۔ یہ دیکھو! نہ میری انگوٹھیاں ہیں' نہ ہار' نہ مالا' تمہارے پاؤں میں پڑی' غموں کی ماری' غریب دکھیاری معلوم ہوتی ہوں کہ نہیں؟"

اس نے مڑ کر دیمیطر لیس کے لبوں کا بوسہ لیا' مور چھل کرنے والی کنیزیں ایک کونے میں دبک رہیں اور جب بیرنیس نے باتیں کرنی شروع کیں تو دونوں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں' گویا وہ مطلق کچھ نہیں سن سکتیں۔

لیکن دیمیطر لیس خاموش رہا' اس نے اچھی طرح سنا بھی نہیں کہ ملکہ کیا کہہ رہی ہے۔ اسی طرح مضطرب و پریشان کھڑا رہا اسے تو صرف نوجوان ملکہ کے سرخ

ہونٹوں کا خونی تبسم نظر آتا تھا' یا اس کے سنہرے بالوں کے لچھے' ملکہ اپنے بال اس طرح ڈھیلے ڈھیلے گوندھتی تھی' گویا اس کے تھکے ہوئے سر کے لئے تکیہ کا کام دیں گے۔

وہ کہہ رہی تھی:

"پیارے! رات میں روتی رہی! میرا بستر سرد تھا' میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنی ننگی باہیں دونوں طرف پھیلائیں اور مجھے معلوم ہوا کہ تم میرے پاس نہیں ہو' کہیں کسی جگہ' میرے ہاتھ تمہارے ہاتھوں کو چھو نہ سکے' اب ان ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہوں۔ پھر تمہارے انتظار میں گھڑیاں گن گن کر کاٹتی رہی' چاند کی چودھویں تھی کہ تم چلے آئے تھے۔ میں نے غلام بھیج کر شہر کا کونہ کونہ چھان مارا' اور جب وہ تمہارے بغیر واپس آئے تو انہیں مروا ڈالا۔ کہاں تھے تم؟ کیا مندر میں؟ کہیں باغ میں تو نہیں تھے' ان کم بخت عورتوں کے پاس جو باہر کے ملکوں سے آئی ہیں؟ نہیں تمہاری آنکھوں سے میں نے جان لیا کہ تم وہاں نہیں تھے' تو پھر مجھ سے دور کیا کر رہے تھے؟ کیا دیوی کے بت کے پاس تھے؟ ہاں مجھے یقین ہے کہ تم وہیں تھے۔ اب تو تمہیں اس بت سے زیادہ پیار ہے' میرا خیال کم ہو گیا ہے۔ دیوی کا بت ہے بھی تو میری ہی طرح' میری آنکھیں' میرا منہ' میری چھاتیاں' لیکن تم ہو کہ اسی پر جان دیتے ہو' مجھے پوچھتے بھی نہیں' مجھ دکھیاری کو تو تم بھول ہی گئے' مجھ سے اکتا گئے' مجھے معلوم ہو گیا' بس تم پر تو ہر وقت اپنے سنگ مرمر کی اور ان بدصورت بتوں کی دھن سوار رہتی ہے' گویا میں ان تمام سے زیادہ خوب صورت نہیں ہوں' اور زندہ' تم پر جان وارنے والی۔ جس چیز کو جتنا چاہو اسے ہارنے والی' تحفے ناپسند ہوں تو بھی صبر کرنے والی' ہر طرح تمہاری چاکر اور تم ہو کہ کوئی چیز مانگتے ہی نہیں' بادشاہ تم نہیں ہونا چاہتے' دیوتا تم نہیں بننا چاہتے' مندر میں اپنی پوجا تم نہیں کروانا چاہتے۔ یوں نظر آتا ہے کہ تم اب مجھے چاہنا بھی نہیں چاہتے۔"

وہ اپنے پاؤں جوڑ کر' اپنے ہاتھوں پر جھک گئی:

"پیارے' تمہیں محل میں اپنے پہلو میں دیکھنے کے لئے میں سب کچھ کر سکتی ہوں' اگر میری خاطر نہیں آتے تو بتاؤ کیا کسی اور کے لئے وہاں آتے ہو؟ جس کے لیے تم آؤ اسے میں اپنی سہیلی بنالوں گی' میرے دربار کی ناز نینیں حسین ہیں' میرے خلوت خانے میں بارہ ایسی اچھوتیاں ہیں' جنہوں نے آج تک مرد کا نام نہیں سنا' اگر تم ان سے

ملنے کے لئے آنے کا وعدہ کرو تو وہ بارہ تمہاری نذر ہیں۔ پھر میرے دربار میں ایسی ایسی عورتیں ہیں جو باغ کی کسبیوں سے بھی زیادہ کھیل کھیل چکی ہیں۔ عشق کی ہولی کھیلنے کی وجہ سے ان کی محبت میں مہارت کا ایک نیا رنگ ہے' منہ سے کہہ دو اور پھر میری ہزار کنیزوں میں سے جو دور دور کے ملکوں سے آئی ہیں جسے چاہو پسند کر لو۔ انہیں میں اپنی طرح کا لباس پہناؤں گی' زردریشم' اور زیور' چاندی' سونا۔۔۔ لیکن نہیں' تم دنیا میں سب سے بڑھ کر حسین ہو۔ ہاں' اس کے ساتھ ہی تمہارے جسم میں آگ نہیں ہے۔ تمہارا دل پتھر ہے' پتھر۔ تمہیں کسی سے پیار نہیں۔ بس تم بڑی مہربانی کرتے ہو کہ دوسروں کو اجازت دیتے ہو کہ تمہیں چاہیں۔ جن کی آنکھوں میں تم چاہت کی آگ بھڑکا چکے ہو' خیرات کے طور پر اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیتے ہو۔ تم اجازت دیتے ہو کہ میں تمہاری محبت کا مزہ لوٹ لوں' لیکن یہ اجازت اسی طرح بے رنگ ہے جس طرح گائے چپ چاپ گوالے کے آگے کھڑی دودھ دوہنے کی اجازت دیتی ہے۔ گوالا دودھ دوہتا رہتا ہے گائے کسی اور خیال میں مگن ایک طرف دیکھتی رہتی ہے۔ یہ بڑا انکسار ہے تم میں! بڑی مہربانی ہے تمہاری!

خود پسند نوجوان! سن! دنیا تیری محبت میں مبتلا ہے لیکن تیری آنکھوں میں کسی کے لئے آنسو نہیں بھر آتے۔ سن! آخر یہ ہو گا کہ میں بھی تیرے بغیر رہنے کا گُر سیکھ جاؤں گی' میرے محل میں صرف عورتیں ہی نہیں ہیں' گرانڈیل' ہٹے کٹے حبشی غلام بھی میرے ملازم ہیں' جن کے سینے تانبے کی طرح سخت ہیں اور جن کے شانے بھرے بھرے اور مضبوط ہیں۔ ایسے ایسے جوان مردوں کی گود میں تیری زنانہ رانیں' اور تیری خوب صورت تراشی ہوئی داڑھی مجھے جلد ہی بھول جائے گی۔ ان کی ہوس کا نظارہ میرے لیے بالکل نیا ہو گا اور میں صرف "محبت" کی مالا جپ کر خوش ہونا چھوڑ دوں گی اور جب وہ دن آئے گا جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ تیرے نہ ہونے سے مجھے ذرا بھی دکھ نہیں ہوا اور تیرے منہ کے بوسوں کی طرح کسی دوسرے کے بوسوں میں بھی وہی لذت ہے تو ہر میز کے پل پر سے میں تجھے وہیں پھینکوا دوں گی' جہاں اپنے زیور پھینک دیئے تھے کہ؛ "جا میرے ہار اور انگوٹھیوں کے ساتھی' تجھ سے پرانے زیور کی طرح جی چڑھ گیا۔۔۔۔۔" آہ! کسی ملک کی ملکہ ہونا!" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی' لیکن دیمیطر لیس اسی طرح بے حس و حرکت غیر

متأثر کھڑا رہا' گویا اس نے ایک لفظ بھی نہیں سنا' تب ملکہ نے غصے میں کہا:
"سمجھتے ہو تم میں نے کیا کہا؟"

دیمیطر یس ایک کہنی کے بل جھک کر سکون آمیز لہجے میں بولا: "مجھے ایک افسانہ یاد آ گیا۔ دیر کی بات ہے' ابھی تمہارے آباؤاجداد نے تھریس کو مغلوب نہ کیا تھا۔ اس وقت تھریس میں یا تو وحشی جانور بستے تھے یا خوفناک آدمیوں کا ایک گروہ' یہ جانور بڑے خوبصورت تھے۔ ان میں شیر تھے' شفق کی طرح سرخ چیتے' جن کے بدن کی دھاریاں شام کے وقت جو سطح آسمان پر نقوش پیدا ہوتے ہیں ان کی یاد دلاتی تھیں۔ ریچھ تھے' رات کی طرح کالے' وہاں کے آدمی ٹھنگنے تھے' چپٹی چپٹی ناک' پرانی' بوسیدہ کھالیں پہنے ادنیٰ قسم کے نیزوں اور بد صورت کمانوں سے مسلح۔ وہ غاروں میں چھپے رہتے تھے اور جان توڑ کر زور لگاتے تھے تو کہیں غار کے منہ کو بڑے بڑے پتھر لڑھکا کر بند کر سکتے تھے۔ ان کی عمر شکار میں بسر ہوتی تھی' جنگلوں میں خون کے دریا بہتے تھے۔

یہ ملک اتنا اداس تھا کہ دیوتا اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ جب صبح کی زرد روشنی نمودار ہوتی اور ارتمس (۱) اولمپس (۲) پر رختِ سفر باندھتی تو وہ کبھی شمال کا راستہ اختیار نہ کرتی' وہاں جو لڑائیاں ہوتی تھیں ان سے مریخ (۳) بالکل بے خبر رہتا' نائے دنے کی غیر موجودگی کی وجہ سے اپالو کو اس سرزمین سے نفرت تھی' بس یہاں کوئی چیز جلوہ گر تھی تو وہ چاند تھا (دیوی ڈائنا) جو تنہائی میں چمکا کرتا گویا ڈائن میڈوسا (۴) اس سرزمین کی طرف دیکھ رہی ہو' جس کی ہر چیز بزور سحر' پتھر بنادی گئی ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک نیا آدمی تھریس میں آکر رہنے لگا۔ وہ نسبتاً کسی مہذب نسل سے تعلق رکھتا تھا' اور پہاڑی وحشیوں کی طرح کھال پہنے پھرنا اس کا دستور نہ تھا۔ اس کے بدن پر ایک لمبی سفید عبا ہوتی' جس کے کنارے زمین پر گھسٹتے تھے۔ چاندنی راتوں میں وہ سکون ریز جنگلوں میں پھرا کرتا۔ اس کے ہاتھ میں کچھوے کی کھال کا بنا ہوا ایک ساز ہوتا تھا جس میں بیل کے سینگوں کے ساتھ تین نقرئی تار آویزاں تھے' جب اس کی انگلیاں ان تاروں کو چھوتیں تو ساز میں سے ایک نوائے دلکش پیدا ہوتی۔ آب رواں کے نغموں سے شیریں تر' گندم کے خوشوں اور درختوں کی شاخوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا کی مترنم سرگوشیوں سے بھی زیادہ لطیف۔ پہلی بار جو اس نے ساز پر انگلیاں پھیریں تو تین چیتے جو حملے کے لئے تیار تھے' ایسے مسحور ہوئے کہ بجائے اسے

تکلیف پہنچانے کے جہاں تک آسکتے تھے' اس کے قریب آگئے اور جب ساز خاموش ہو گیا تو چپ چاپ چلے گئے۔ دوسرے دن بہت سے جانور جمع ہو گئے' بھیڑیئے' لگڑ بھگڑ' سانپ پھن اٹھائے' دموں کے بل کھڑے۔ اب روز اسی طرح ہونے لگا' آخر کار ایسا ہوا کہ جانور خود آتے اور نوجوان سے کہتے کہ ہمیں اپنے گیت سناؤ۔ ان میں ایک ریچھ بھی تھا جو تنہا آتا اور گیت کے تین میٹھے بول سن کر خوش خوش واپس چلا جاتا۔ ان دلکش نغموں کے معاوضے میں جانور مغنی کے لئے کھانے پینے کی چیزیں مہیا کرتے تھے اور اسے وحشی آدمیوں کے حملے سے بچایا کرتے تھے۔

لیکن وہ اس فرسودہ زندگی سے اکتا گیا۔ اب اسے چونکہ یقین ہو گیا تھا کہ مجھ میں موسیقی کا جوہر موجود ہے' اور میں جب چاہوں' جانوروں کو رجھا سکتا ہوں' اس لئے اس نے دل لگا کر ساز بجانا چھوڑ دیا' تاہم جانور اسی بات سے خوش تھے کہ سازندہ تو وہی ہے۔ اس کے بعد بہت جلد اس نے ساز کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا اور تغافل کی ایسی شان اختیار کی کہ غریب جانوروں کو یہ مسرت بخشنا بھی گوارا نہ کیا۔ جنگل کے مکین اداس ہو گئے' لیکن ابھی تک اس کے دروازے کے آگے گوشت کے ٹکڑے اور لذیذ پھل بکثرت پڑے رہتے تھے۔ جانور ابھی تک اس کے کھانے پینے کی چیزیں مہیا کئے جاتے تھے۔ اس سے ان کو محبت اور بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ جانور ایسے ہی بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں کی یہی حالت ہوتی ہے ۔ ایک دن وہ اپنے کھلے دروازے کے پٹ سے لگا کھڑا سا کت درختوں کے پیچھے غروبِ آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا کہ اس نے ایک شیرنی کو دیکھا۔ یہ سمجھ کر کہ کہیں اسے سازنوازی کے لئے مجبور نہ کرے' اندر جانا چاہا۔ لیکن شیرنی سازندے کی طرف سے بے پروا چلی گئی۔

حیران ہو کر اس نے شیرنی کو بلایا اور کہا: "تم نے مجھ سے یہ کیوں نہ کہا کہ کچھ سناؤ؟"

شیرنی نے جواب دیا "میں تمہارے گیت نہیں سننا چاہتی۔"

"تم جانتی ہو میں کون ہوں؟"

"جانتی ہوں' تم آرفورس (۵) ہو۔"

"اور تم میرے گیت نہیں سننا چاہتیں؟"

"نہیں"

آرفورس نے کہا "ہائے میری تقدیر پھوٹ گئی' تمہیں تو خاص طور پر میں اپنے گیت سنانا چاہتا تھا۔ تم ان سب سے خوبصورت ہو اور میرا دل کہتا ہے کہ تم سمجھ کر میرے گیتوں کی صحیح داد بھی دو گی' جو مانگو دوں گا۔ بس ایک گھنٹے کے لیے میرے گیت سن لو۔"

شیرنی نے جواب دیا "میں چاہتی ہوں کہ تم میرے لیے وہ تازہ گوشت چرا کر لاؤ جو میدانوں میں بسنے والوں کی ملکیت ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جو آدمی تمہیں پہلے نظر آئے' اسے مار ڈالو۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ قربانیاں جو تمہارے دیوتاؤں پر چڑھائی گئی ہیں' ان کو لا کر میرے قدموں پر ڈال دو۔"

اس نے شیرنی کا شکریہ ادا کیا' ایک گھنٹے کے لیے وہ شیرنی کو گیت سناتا رہا' پھر اس نے اپنا رباب توڑ دیا اور زندہ رہا لیکن مُردوں سے بدتر۔

ملکہ نے ٹھنڈی سانس بھری؛

"میری سمجھ میں ایسی کہانیاں کبھی نہ آئیں ! مجھے اس کا مطلب بھی تو سمجھاؤ نا ! پیارے اس تمثیل کا کیا مطلب ہے ؟"

دیمیطر لیس کھڑا ہو گیا اور بولا ؛"میں نے یہ کہانی تمہیں اس لیے تھوڑے سنائی ہے کہ تمہاری سمجھ میں بھی آ جائے۔ میرا تو مطلب یہ تھا کہ تم کو ذرا تھپکا کر تمہاری خفگی دور کر دوں۔۔۔۔۔۔لو دیر ہو گئی۔ خدا حافظ ! بیرنیس !"

وہ رونے لگی ؛

"مجھے پہلے ہی پتہ تھا' مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔"

اس نے ملکہ کو نرم' عشرت انگیز گدوں پر لٹا دیا' گویا وہ ایک الہڑ لڑکی تھی۔ اس کی غمناک آنکھوں پر مسکرا کر بوسہ دیا اور اطمینان سے اس عظیم الشان محمل سے نیچے اترا۔

حوالہ جات

(۱) ارتھمس ؛ فطرت اور اس کی قوتِ نمو کی دیوی، جس نے ایک صحت مند، قوی اور جذبات پرور اچھوتی کاروپ دھارا تھا۔

(۲) اولمپس ؛ وہ سلسلہ کوہ جو مقدونیہ اور تھسلی کو جدا کرتا ہے۔ یونانی افسانوی ادب میں یہ کوہ ہسار دیوتاؤں کا مسکن تھا۔

(۳) مریخ ؛ جنگ کا دیوتا، فارسی ادب میں بھی اس سیارے سے مصیبت و خوف کی کیفیات وابستہ ہیں۔ چنانچہ اس کا لقب 'جلادِ فلک' ہے۔ اپالو، ابولوس، رب الشمس، سورج دیوتا، نور کا خداوند، نغمہ اور موسیقی کا رب النوع۔

(۴) میڈوسا ؛ افسانوی ادب میں اس ڈائن کا اکثر ذکر آتا ہے۔ سر پر بالوں کی بجائے سانپ۔ جس طرف نظر اٹھا کر دیکھتی ہر چیز پتھر کی ہو جاتی، اس کے چہرے پر نظر پڑنے سے آدمی بھی پتھر کا ہو جاتا تھا۔

(۵) آرفورس ؛ افسانوی ادب کی مشہور شخصیت، سازندہ، شاعر، جس نے اپنی بیوی کی خاطر جہنم کا سفر اختیار کیا۔ اس کے نام سے شاعری کا ایک خاص سکول منسوب ہے، جسے آرفزم کہتے ہیں۔

حصہ سوم

پہلاباب

آمد آمد

خراماں خراماں چلے آتے ہیں وہ
گلستاں، گلستاں ہوا چاہتا ہے

پچیس سال گزرے بیقس نے کسبی کی زندگی اختیار کی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اس کی عمر چالیس سال کی تھی۔ اس دوران میں اس کے حسن کی نوعیت کئی بار متغیر ہو چکی تھی۔

کچھ سالوں سے گھر کا انتظام بیقس کی ماں کے سپرد تھا، وہی اپنی لڑکی کی مشیر کار بھی تھی، اس نے سماجی اخلاق اور کفایت شعاری کے اصول بیقس کے ذہن نشین کر دیئے تھے کہ تھوڑی تھوڑی کر کے اس نے اب اچھی خاصی دولت جمع کر لی تھی۔ اب کہ وہ عمر کے اس مرحلے پر آ پہنچی تھی، جب حسن جسمانی کی کمی اسی طرح پوری ہو سکتی ہے کہ بسترِ عشرت کی آرائش کو اور زیادہ پر تکلف کر دیا جائے۔ وہ کھلے خزانے روپیہ اٹھانے کے قابل تھی۔

بازار سے جوان کنیزیں خریدنے کی بجائے وہ گزشتہ دس سال سے صرف ایک حبشی کنیز پر قانع تھی (حالانکہ اس سامان عیش یعنی کنیزوں کا مہیا کرنا، بعض کسبیاں نہایت ضروری خیال کرتی تھیں اور اس شوق میں کچھ خود سر نوجوان کسبیاں برباد ہو چکی تھیں) ہاں بہ نظر احتیاط اور دوربینی یہ انتظام کیا تھا کہ ہر سال وہ حبشی کنیز

ایک بچہ پیدا کرتی رہے۔ اس طرح غیر ضروری مصارف کے بغیر وہ ایک ایسے عملے کی بیگم بن گئی تھی جسے آخر کار دولت پیدا کرنے کا ذریعہ بھی بننا تھا۔

اس نے ان بچوں کے باپ بڑی احتیاط سے چنے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس حبشی کنیز کے بطن سے سات دوغلی لیکن خوش گل کنیزیں پیدا ہوئیں' تین غلام بھی پیدا ہوئے تھے۔ لیکن بیقس نے انہیں اس لیے مروا ڈالا کہ یہی غلام بڑے ہو کر غیور عاشقوں کے لئے بے کار شبہات کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس نے ان ساتوں لڑکیوں کا نام سیاروں پر رکھا تھا اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض خدمت ایسے تھے کہ کسی نہ کسی طرح ان کے نام سے تعلق رکھتے تھے۔

خورشید دن کو خدمت گزاری کرتی تھی' قمر کے فرائض رات سے متعلق تھے' ناہید بستر بچھاتی تھی' برجیس لین دین کرتی تھی' بہرام دربان تھی' کیوان باورچن' عطارد گھر کی مہتمم تھی اور حساب کتاب بھی اسی کے سپرد تھا۔

ناہید جو سب سے خوبصورت' سب میں مقبول تھی' بیقس کی منظور نظر تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ناہید کی موہنی صورت بیقس کے گاہکوں کا دل موہ لیتی' ایسے موقعوں پر اسے ان کے ساتھ داد عیش دینی پڑتی تھی۔ اسے کوئی ایسا کام نہ کرنا پڑتا تھا جس سے اس کی بانہوں کی نزاکت یا ہاتھوں کی نرمی میں فرق آجائے۔ ایک خاص رعایت اس سے یہ کی جاتی تھی کہ اسے ننگے سر پھرنے کی اجازت تھی' یہی وجہ تھی کہ اکثر لوگ اسے کنیز نہیں خیال کرتے تھے۔ آج رات پینتیس سو درہم کی گرانقدر رقم کے بدلے اسے آزاد ہونا تھا۔

بیقس کو ان سات بلند بالا' شائستہ کنیزوں پر اتنا ناز تھا کہ ان کے بغیر گھر سے قدم نہ نکالتی تھی' چاہے گھر میں سیندھ لگ جائے۔ اس حماقت کی وجہ سے دیمیطر لیس نے چپ چاپ اس کے گھر میں داخل ہو کر آئینہ اڑا لیا تھا لیکن اس دعوت کے وقت تک جہاں زرینہ بھی مدعو تھی اسے خبر نہ ہوئی تھی کہ کوئی اسے جُل دے گیا ہے۔

سب سے پہلے زرینہ پہنچی۔ وہ ایک سبز قبا میں ملبوس تھی' جس پر بڑے بڑے گلاب کے پھول کڑھے ہوئے تھے اور ان کی ترکیب یہ تھی کہ شاخیں تو نیچے تھیں اور پھول عین اس کی چھاتیوں پر شگفتہ تھے' دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت ہی نہ آئی' بہرام نے دروازہ کھول دیا اور یونانی رواج کے مطابق زرینہ کو ساتھ کے کمرے میں لے

گئی۔ یہاں اس نے زرینہ کے سرخ جوتے اتارے اور نہایت نرمی سے پاؤں دھونے لگی ۔ پھر قبا کو حسب ضرورت اٹھا اٹھا کر یا ہٹا کر جہاں جہاں ضرورت تھی اچھی طرح عطر ملا' کیونکہ ان دنوں قاعدہ تھا کہ مہمانوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ دی جاتی تھی۔ کھانے سے پہلے ہار سنگھار بھی میزبان کے ذمے ہوتا تھا۔ اب کنیز نے زرینہ کو کنگھی دی' بالوں کے لیے پن دیئے' لبوں کے لیے روغن اور سرخی۔

جب زرینہ آرائش سے فارغ ہو چکی تو اس نے پوچھا؛ "سائے کہاں ہیں ؟

"ان دنوں سوائے ایک کے جو مہمان کہلاتا تھا باقی سب مہمانوں کو 'سایہ' کہا جاتا تھا۔ جس شخص کی عزت میں دعوت دی جاتی تھی' اس کو اختیار تھا کہ جسے چاہے ساتھ لے آئے' حالانکہ سایوں کو صرف یہ اجازت تھی کہ بیٹھنے کے لیے اپنی گدی اپنے ساتھ لائیں' ان کا فرض تھا کہ اپنا طریقہ شریفانہ رکھیں۔

بہرام نے جواب دیا؛ "ناقریطس نے فلاڈ یمس کو بلایا ہے اور اس کی محبوبہ فاسٹینا کو بھی جسے وہ اٹلی سے ساتھ لایا تھا' فراسیلاس اور ٹائمن بھی آرہے ہیں اور آپ کی سہیلی سیسو بھی۔"

عین اس وقت سیسو داخل ہوئی ؛

"زرینہ"

"پیاری گوئیاں"

انہوں نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا اور ان اتفاقاتِ مسعود پر اپنی مسرت کا اظہار کیا' جن کی وجہ سے دونوں سہیلیاں پھر مل گئی تھیں۔

سیسو نے کہا؛ "میں تو دل میں ڈر رہی تھی کہ کہیں دیر نہ ہو جائے' بیچارے ارکیاس کے کہنے سے رک گئی۔"

زرینہ نے پوچھا؛ "ہائیں' ابھی تک ارکیاس سے تمہاری بات بنی ہوئی ہے ؟"

"کیا پوچھتی ہو' وہ تو میری جان کا لاگو ہے' جب کہیں باہر کھانے پر جانا ہوتا ہے تو اسے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ جلسے میں ایک ایک مرد مجھ سے لپٹے گا' بس اس وہم میں نگوڑا ایسا دیوانہ ہوتا ہے کہ اپنا بدلہ پہلے ہی لے لیتا ہے' گویا سزا پیشگی ملتی ہے' اور اب کیا کہوں کیسی سزا ملتی ہے اور کب تک ملتی رہتی ہے۔۔۔ زرینہ پیاری اس نے ابھی

تک مجھے پایا ہی نہیں۔ اسے کیا خبر کہ میں اپنے عاشقوں کو دھوکا دینا نہیں چاہتی' بس جتنے ہیں کافی ہیں' بھر پایا۔"

زرینہ نے کہا؛ "اور بچے کی سناؤ' سیسو ابھی معلوم تو نہیں ہوتا کہ تمہارا پیر بھاری ہے۔"

"واہ کیا ابھی سے! ابھی تیسرا ہی تو مہینہ ہے' لیکن سچ پوچھو کمبخت پیٹ میں پھیلتا جارہا ہے' خیر ابھی تک مجھے تکلیف تو کوئی نہیں ہوئی۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں ناچنا شروع کردوں گی تو شاید گھبرا کر نکل جائے۔"

زرینہ نے کہا؛ "سچ کہتی ہو' اس کا دفعان ہونا ہی اچھا' دیکھنا کسی طرح اپنے بدن کا سڈول پن خراب نہ ہونے دینا' سنتی ہو کل مجھے فیلی مینٹیسن ملی' تم بھی جانتی ہو اسے' وہی جو تین سال سے یوباسٹس کے ایک گندم فروش کے پاس ہے۔ چھوٹتے ہی اس نے کہا' ہائے میری چھاتیاں! ہائے میری چھاتیاں! اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے' میں نے کہا' تم تو ابھی تک بڑی حسین ہو' لیکن وہ یہی دہراتی رہی' ہائے میری چھاتیاں' اور اس دوران میں ببلیس (۱) کی طرح روتی رہی۔ سیسو مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ چاہتی ہے میں اس کی چھاتیاں دیکھوں' میں نے کہا اچھا دکھاؤ تو تمہاری چھاتیوں پر کیا آفت آئی؟' سیسو سن رہی ہو نا! اس کی چھاتیاں کیا تھیں' ڈھلکے ہوئے دو خالی تھیلے' اور تمہیں یاد ہے یہی چیز تو اس کی خوب صورت تھی' دیکھنا سیسو تم کہیں اپنا یہ حال نہ بنالینا' چھاتیوں کو سخت اور تازہ ہی رکھنا' جیسی اب ہیں' کسی کے پستان ہار سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔"

ان باتوں کے دوران میں دونوں نے اپنا سنگھار ختم کر لیا تھا' آخر دونوں دعوت کے کمرے میں پہنچیں جہاں بیقس ان کی منتظر کھڑی تھی' کمر سے لے کر گردن تک کئی قسم کے سینہ بند گردن میں سنہری ہنسلیاں' انہیں دیکھ کر بولی؛ "آؤ آؤ' میرے چاند کے ٹکڑو! ناقریطس کو خوب سوجھی کہ تم دونوں کو ملادیا۔"

زرینہ نے اس طرح جواب دیا گویا بیقس کا مطلب ہی نہیں سمجھی؛ "خوشی تو اس بات کی ہے کہ ہم تمہارے گھر ملی ہیں" اور پھر فوراً ہی ایک زہر میں بجھا ہوا تیر چلایا؛ "کہو ڈاریکلس کا کیا حال ہے؟"

ڈاریکلس ایک نوجوان امیر زادہ تھا جس نے ایک کم عمر اطالوی نازنین کی

خاطر بیقس کو دھتا بتا دیا تھا۔

بیقس نے ڈھٹائی سے کہا ؛"میں نے خود ہی اسے کہہ دیا ہے کہ کھیلتے نظر آؤ۔"

"سچ"

"اور نہیں کیا' سنتی ہوں اب مجھے جلانے کے لیے آپ بیاہ رچانے لگے ہیں' میری جوتی سے' جلے میری بلا' دیکھنا بیاہ کے دوسرے دن ہی آپ یہاں براجمان ہوں گے' میرے بنا چین اسے تو کسی کل آتا نہیں۔"

اگرچہ زرینہ نے پوچھا تو بظاہر یہ تھا کہ ڈاریکلس کہاں ہے لیکن دراصل زرینہ سوچ رہی تھی کہ ؛"تمہارا شیشہ کہاں ہے"لیکن بیقس آنکھیں ملا کر بات نہ کرتی تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک بے نام سا اضطراب تھا جو کہ ہر قسم کے معانی سے معرا معلوم ہوتا تھا' اس کے علاوہ اسے پتہ تھا کہ یہ مسئلہ صاف کرنے کے ابھی کئی اور موقعے ملیں گے۔ اس لیے وہ اپنی بے صبری کے باوجود کسی اچھے موقعے کی منتظر رہی۔

وہ پھر کوئی بات شروع کرنے والی تھی کہ فلاڈیمس' فاسٹینا اور ناقریطس کو آتے دیکھ کر رک گئی' کیونکہ اب بیقس کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی تھی اور نہایت شائستگی سے ان کو خوش آمدید کہہ رہی تھی' وہ لوگ بھی بڑی تہذیب سے جواب دے رہے تھے۔

(شاعر) فلاڈیمس کی خوبصورت کڑھی ہوئی عبا کی تعریف کی گئی' اس اطالوی محبوبہ کے باریک لباس کی داد دی گئی' اس کم عمر نازنین نے جو سکندریہ کے رسم و رواج سے ناواقف تھی' باریک لباس پہن کر اپنا ذوقِ سلیم ظاہر کرنا چاہا تھا' اسے کیا خبر تھی کہ اس جلسے میں عام ناچنے والی لڑکیاں اسی قسم کا لباس پہن کر آئیں گی اور اس کا لباس ناموزوں معلوم ہو گا۔ لیکن بیقس نے ایسا ظاہر کیا گویا کوئی نامناسب بات واقع نہیں ہوئی' گویا اس نے لباس کی نوعیت پر غور ہی نہیں کیا اور اطالوی نازنین کے ان گھنے بالوں کو سراہنے لگی' جو خوشبو سے مہک رہے تھے اور جو ایک طلائی گیسوبند کے ذریعے گردن پر اس طرح سنبھال کر باندھ دیئے گئے تھے کہ مرکی کا کوئی قطرہ گر کر اس کے ریشمی لباس کو خراب نہ کر سکتا تھا۔

وہ بیٹھنے ہی والے تھے کہ ایک اور مہمان آیا۔ یہ ٹائمن تھا' جس کی بے اصولی

ایک عطیۂ فطرت تھی، تاہم اس نے اپنے عہد کی فلسفیانہ تصانیف کے مطالعے سے کچھ ایسا مبلغ علم حاصل کیا تھا کہ اپنے آپ میں مگن رہتا تھا، اس کے لئے اس کے پاس معقول دلائل بھی موجود تھے۔

اس نے ہنس کر کہا: "میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔"

بیقس نے پوچھا "کون ہے وہ؟"

"کوئی ڈیمو ہے، مند اس کی"

"ڈیمو، اے پھٹکار ہو تم پر۔ بازار کی مٹھائی اٹھا کر لے آئے، وہ تو ایسے ہے کہ ایک کوڑی بھی قبول کر لے۔"

"اچھا، اچھا! چلو جانے دو، میں تو کینوپس (۲) کی طرف جانے والی سڑک پر پھر رہا تھا کہ وہ مجھے مل گئی، کہنے لگی: "کھانا کھلوا دو، میں اسے یہاں لے آیا، خیر، اگر تمہیں اس کا آنا پسند نہیں ہے تو۔۔۔۔۔۔"

بیقس نے کہا "انہونی بات کرے گا، جب کرے گا۔"

اس نے آواز دی: "خورشید! خورشید!! اپنی بہن سے کہہ دو کہ دروازے پر ایک عورت کھڑی ہے، مار کر نکال دو اسے۔"

اس نے مڑ کر سب کی طرف دیکھا، پھر پوچھا:

"ابھی تک فراسیلاس نہیں آیا کیا؟"

حوالہ جات

(۱) ہیلس: افسانوی ادب کی ایک شخصیت، بھائی پر عاشق ہو گئی تھی۔ آخر عذاب نازل ہوا اور فوارہ بنا دی گئی۔ فوارے کی مسلسل روانی سے زیادہ رونے کو جو مشابہت ہے، وہ ظاہر ہے!

(۲) کینوپس: سکندریہ سے مشرق کی طرف، ساحلِ بحر پر ایک مشہور شہر تھا جو سیراپس کے مندر، تجارتی وسعت اور عشرت کاری کے لئے مشہور تھا۔

دوسرا باب

طعامِ شب

شب فروغِ بزم کا باعث ہوا تھا حسنِ دوست
شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا

ابھی یہ بات اس کے منہ میں تھی کہ ایک کم رو آدمی 'مٹیالے رنگ کی پیشانی' مٹیالے رنگ کی آنکھیں' چھدری 'مٹیالی داڑھی' ڈھلکی چال چلتا آگے بڑھا اور مسکرا کر کہا؛ ''یہیں تو تھا میں۔''

فراسیلاس متعدد کتابوں کا معزز مصنف تھا لیکن طرح طرح کے سنجیدہ علوم و فنون کے متعلق اس کا ذوق ایسا گریز پا اور اس کا جوش ایسا سست رو تھا کہ یہ مسئلہ کبھی صاف طور پر حل نہ ہو سکا کہ اسے بخوبی سمجھا جائے 'مؤرخ قرار دیا جائے یا ماہر صنمیات تصور کیا جائے۔ مقالہ لکھنے کی اسے جرأت نہ تھی 'ڈرامہ وہ لکھ نہ سکتا تھا' اس کے اندازِ تحریر میں کچھ ریاکاری' کچھ تصنع 'کچھ تبختر (غرور) سا تھا۔ مفکر اسے شاعر کہتے تھے' شاعر اسے فلسفی سمجھتے تھے 'سوسائٹی اسے ایک بڑا آدمی قرار دیتی تھی۔

بیقس نے کہا؛ ''آیئے 'اب بیٹھ جائیں'' اور یہ کہہ کر کھانے کی میز کے سرے پر ایک صوفے پر اپنے عاشق کے پاس دراز ہو گئی' دائیں طرف فلاڈیمس 'فاسٹینا اور فراسیلاس کے پہلو میں بیٹھا تھا' بائیں طرف ناقریطس اور سیسو تھے 'پھر زرینہ اور نوجوان ٹائمن' ان میں سے ہر ایک مہمان ریشمی گدیلے پر کہنی ٹیکے 'پھولوں کا ہار پہنے'

آڑا ہو کر لیٹا تھا' ایک کنیز سرخ گلاب اور نیلگوں کنول کے ہار لے کر آئی' پھر جلسہ شروع ہوا۔

ٹائمن محسوس کرتا تھا کہ اس کی شرارت کی وجہ سے عورتیں کچھ اداس سی ہو گئیں' اس لئے اس نے ان سے مخاطب ہو کر سلسلۂ کلام شروع نہیں کیا' بلکہ فلاڈیمس سے مخاطب ہو کر نہایت متانت سے کہنے لگا: "سنتا ہوں کہ تم سسرو(۱) کے جگری دوست ہو' اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ روشن دماغ فلسفی ہے یا صرف ایک مرتب' جسے نہ تمیز ہے نہ ذوق' اس کے متعلق یہ دونوں رائیں قائم کی جاتی ہیں۔"

فلاڈیمس نے جواب دیا: "میں اسی لئے اس بات کا جواب نہیں دے سکتا' کیونکہ میں اس کا دوست ہوں (میری اس سے گاڑھی چھنتی ہے) میں اس سے بہت قریب ہوں' اسے لئے اس کو سمجھنے سے بہت دور ہوں' فراسیلاس سے یہی سوال کرو۔ اس نے سسرو کی تصانیف کا بہت کم مطالعہ کیا ہے اور اسی لئے وہ غلطی کے بغیر سسرو کے متعلق فیصلہ کر سکتا ہے۔"

"اچھا فراسیلاس تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ٹھنگنے فراسیلاس نے کہا: "وہ خوب لکھتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

یہ کہ ہر مصنف میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوتی ہے' جس طرح کوئی منظر یا کوئی آدمی خوبیوں سے خالی نہیں ہوتا' میں تو معمولی سے معمولی میدان اور سمندر کے شاندار منظر میں بھی موازنہ نہیں کر سکتا' اسی طرح میں نہیں جانتا کہ سسرو کے مقالات' پنڈار کی غزلیات اور زرینہ کے خطوط میں سے کسے ترجیح دوں (اگر مجھے زرینہ کے انداز تحریر سے واقفیت ہو)۔

اگر کتاب بند کرنے کے بعد ایک ایسی سطر میرے حافظے میں محفوظ رہ جائے جو سلسلہ جنبانِ خیال ہو' جسے پڑھ کر میں سوچنے پر مجبور ہوا ہوں' تو میرے لئے کافی ہے۔ اب تک ہر کتاب میں ایک ایسی سطر ضرور مطالعہ میں آتی رہی ہے' لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کسی کتاب میں اس قسم کی دو سطریں نظر نہ آئیں' شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی زندگی میں صرف ایک ہی بات کہنی ہوتی ہے اور جن لوگوں نے اپنے کلام کو طول دینے کے معاملے میں ضد کی ہے' انہوں نے گویا ضرورت سے زیادہ بلند

معیار اپنے سامنے رکھا ہے' مجھے ان لوگوں کی ناکامیابی سے زیادہ ان کروڑوں انسانوں کی خاموشی پر افسوس ہے جنھوں نے کوئی بات کہی ہی نہیں (حالانکہ ان میں سے ہر ایک کم اس کم ایک اچھی بات کہہ سکتا تھا)"

ناقریطس نے اپنی آنکھیں اٹھائے بغیر جواب دیا؛" مجھے آپ سے اختلاف ہے کائنات کی تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ تین حقیقتیں بے نقاب کر دی جائیں' اور یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ آج سے پانچ سو سال پہلے قطعی طور پر یہ تین صداقتیں مکشوف ہو چکیں۔

ہیراکلیٹس (۲) نے دنیا کو خوب سمجھا تھا' پرمینی داس (۳) نے روح کے اسرار کو بے نقاب کیا' فیثاغورث (۴) نے خدا کی حقیقت کو دریافت کر لیا۔ اب مٹر کا دانہ اور اتنی ٹرٹر۔۔۔۔۔۔" سیسو نے اپنے پنکھے کا دستہ زور سے میز پر مارنا شروع کیا اور کہا؛" ٹائمن! دوست ٹائمن!!"

"کہئے"

"ایسے سوال کیوں کرتے ہو کہ نہ تو مجھے دلچسپی ہو کہ مجھے لاطینی آتی ہی نہیں اور نہ تمہیں مزا آئے کہ تم لاطینی بھولنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ غیر ملکوں کے علوم و فنون میں اپنی مہارت کا ثبوت دے کی فاسٹینا کا دل موہ لو گے' بے چارہ ٹائمن!۔۔۔۔۔۔ تم مجھے ان بڑے بڑے لفظوں سے دھوکا نہیں دے سکتے' کل رات اپنے لحاف کے نیچے تمہاری شاندار روح کو بے نقاب کر کے میں دیکھ چکی ہوں اور ٹائمن میں خوب جانتی ہوں کہ تمہاری روح کن باتوں کی طرف زیادہ راغب ہے۔"

نوجوان نے سادگی سے کہا؛" ہاں یہ بات ہے۔"

لیکن اب فراسیلاس نے طنز آمیز لیکن میٹھے لہجے میں کچھ اور کہنا شروع کر دیا تھا؛

"سیسو' جب تم ٹائمن کی روح کو بے نقاب کرنے لگو' اور ہمیں ان انکشافات سے فائدہ اٹھانے کی مسرت بخشنے لگو تو چاہے اس کی تعریف کرو جس کا وہ مستحق ہے' چاہے مذمت (اگرچہ ہم اسے سمجھنے کی کوشش کرتے تو اس کی مذمت نہ کرتے) لیکن ایک بات یاد رکھو' اور وہ یہ ہے کہ ٹائمن اور اس کی روح ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے

اس کی روح کی اپنی ہستی کوئی نہیں ہے' یا کم از کم اس ہستی کو معلوم نہیں کیا جا سکتا' اس کی روح ان روحوں کا عکس ہے جو اس پر اثر ڈالتی ہیں۔ کل رات اس کی روح تمہاری روح کا عکس تھی اور مجھے تعجب ہوا کہ تم نے اسے پسند نہ کیا۔ ابھی ایک لمحہ گزرا اس کی روح فلاڈیمس کی روح کا عکس تھی' اور یہی وجہ تھی کہ تم نے اصرار سے کہا کہ ٹائمن ریاکار ہے' جھوٹا ہے' لیکن یہ الزام غلط ہے' ٹائمن کی روح اپنے آپ کو جھٹلا نہیں سکتی' کیونکہ وہ اپنا اثبات ہی نہیں کر سکتی۔ دیکھا پیاری سیسو' فیصلہ کرنے میں اتنی جلدی نہ ہونی چاہیے' احتیاط مد نظر رہے۔"

ٹائمن نے جھنجھلا کر فراسیلاس کی طرف تیز تیز نظروں سے دیکھا لیکن خاموش رہا۔

سیسو نے کہا' اچھا یونہی سہی! لیکن یہاں چار کسبیاں موجود ہیں اور ہمارا ارادہ ہے کہ ہم تم سے صاف کہہ دیں کہ فلاں فلاں مضمون پر باتیں کرو۔ نہیں تو ہم چاروں کو منہ میں گھنگھنیاں بھر کر بیٹھنا پڑے گا' گلابی گلابی دودھ پینے والے بچوں کی طرح کہ منہ اسی وقت کھولیں گے جب دودھ پینا ہو گا۔ فاسٹینا تم سب سے بعد میں آئی ہو' تم بتاؤ۔"

ناقریطس نے کہا: "اچھی بات' بتاؤ فاسٹینا کیا باتیں کریں؟"

کم عمر اطالوی نازنین نے سر پھیرا' آنکھیں اٹھائیں' شرم سے چہرے پر سرخی جھلکنے لگی' پھر اس نے ایسی ٹھنڈی سانس بھری کہ اس کی لرزشیں اس کے سارے بدن میں رچ گئیں اور نہایت دھیمی آواز میں کہا: "محبت۔"

سیسو نے ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "کتنا پیارا مضمون ہے۔"

لیکن سب خاموش رہے۔

میز پر ہر طرف پھول اور ہار بکھرے پڑے تھے' پیالوں کاسوں اور ساغروں کے بوجھ کے نیچے میز گویا دبی جاتی تھی' کنیزیں نہایت نزاکت سے بُنی ہوئی ٹوکریوں میں برف کی طرح ہلکی پھلکی چپاتیاں لے کر آ رہی تھیں' رنگین طشتریوں میں خوب فربہ مارماہی تھے' جن پر گرم مصالحے چھڑک کر لذت کو دوبالا کر دیا گیا تھا۔ پھر دریائے ابلفیس کی مومی اور مقدس رنگین مچھلیاں بھی تھیں' ایک ارغوانی رنگ کی مچھلی تھی جس کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ اسی جھاگ سے پیدا ہوئی ہے جس سے زہرہ عالم وجود

میں آئی تھی۔ اس کے علاوہ بیسیوں قسم کے دریائی جانور تھے 'مٹیالے پیلے' کیکڑے' خوش رنگ متنوع' کچھ کھانے ایسے تھے کہ چھوٹی چھوٹی ساس پینوں (۵) میں رکھ کر لائے جاتے تھے تاکہ گرما گرم کھائے جا سکیں' انہی کھانوں میں حیوان صدف ماہی' روہو' مہاشیر' ماہی استقومری' عفریت ماہی تھی جس کے پاؤں کے سرے خوب بھر بھرے اور نرم تھے اور سب سے بعد ایک سفید برق ماہی کا شکم لایا گیا جو کسی خوبصورت عورت کے شکم کی طرح گول اور نرم تھا۔

کھانے کے پہلے دور میں یہ نعمتیں پیش کی گئیں۔ مہمان ہر پلیٹ میں سے تھوڑا تھوڑا لے لیتے تھے اور باقی کنیزوں کے لئے رہنے دیتے تھے۔

فراسیلاس نے کہا: ''محبت ایک ایسا لفظ ہے کہ یا تو اس کے معنی ہی نہیں ہیں' یا پھر ہیں تو بہت سے ہیں کیونکہ باری باری اس لفظ کا اطلاق دو متضاد کیفیات پر ہوتا ہے' لذتِ نفسانی اور جذبہ عشق' معلوم نہیں فاسٹینا کی مراد کیا ہے؟''

زرینہ نے قطع کلام کر کے کہا: ''مجھ سے پوچھو تو میں تو جانتی ہوں کہ لذتِ نفسانی میرے حصے میں آئے اور جذبہ عشق میرے گاہکوں کے حصے میں' دونوں کے متعلق باتیں کرنا نہیں تو تمہاری گفتگو میں میری دلچسپی آدھی رہ جائے گی۔

فلاڈیمس نے دبی زبان میں کہا: ''محبت' نہ لذتِ نفسانی ہے' نہ جذبہ عشق' یہ چیز کچھ اور ہی ہے۔''

ٹائمن نے جھنجھلا کر کہا: ''خدا کے لئے چپ رہو' فلسفہ بگھار کر کیوں دعوت کا لطف ضائع کرتے ہو۔''

''فراسیلاس' ہم سب جانتے ہیں کہ تم اپنی فصاحت سے اور شہد کی طرح میٹھے بولوں سے یہ ثابت کر سکتے ہو کہ لذت جس کی کیفیات گوناگوں ہیں' جذبہ عشق سے کہیں بڑھ کر ہے' جس میں صرف ایک کیفیت ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک گھنٹے تک اس مشکل مسئلے کو سلجھانے اور اس کے حق میں تقریر کرنے کے بعد تم قلابازی کھا کر ویسی ہی فصاحت اور شہد کی طرح میٹھے بولوں سے اپنے مخالف فریق کی تائید میں بھی ثبوت پیش کر سکتے ہو۔''

''میں۔۔۔۔۔۔''

فراسیلاس نے بات کاٹ کر کہا: ''مجھے اجازت دو کہ۔۔۔۔۔۔''

لیکن ٹائمن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا؛ ''میں اس کھیل کی دل کشی کا منکر نہیں' اور اس خوش مذاقی کا بھی قائل ہوں جس سے تم اس کھیل میں کام لیتے ہو' لیکن مجھے اس مسئلے کی مشکلات کے متعلق شکوک ہیں اس لئے اس کی دلچسپی بھی میری نظر میں مشکوک ہے۔ کچھ عرصہ ہوا تم نے ایک داستان بیان کی تھی یعنی ''دعوت''۔ اس داستان میں اس فرضی کردار سے جو تمہارا معیاری کردار معلوم ہوتا تھا' تم نے کچھ خیالات و جذبات منسوب کئے تھے۔ یہ خیالات مصر کے پرانے فرعونوں کے وقت میں شاید نئے خیال کئے جاتے ہوں لیکن اب تو ہمیں نوجوان ملکہ بیرینس کے زیر حکومت آئے تین سال گزر چکے ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے نظام خیال میں کس قدر یہ سبدیلی واقع ہو گئی کہ وہی نظام جس کا مقصد یہ تھا کہ بڑی ہم آہنگی' بردباری اور شگفتگی سے فلسفیانہ کتابوں کی تشریح کیا کرے' تمہارے قلم کے زیر اثر یکایک تنگ آستینوں اور زرد بالوں کے فیشن کی طرح سو سال کا بوڑھا کھوسٹ معلوم ہوتا ہے اور اے معزز استاد! مجھے اس تبدیلی کا بڑا رنج ہوا ہے۔ اگرچہ تمہارے افسانوں میں دلچسپی ذرا کم ہوتی ہے اور اگرچہ عورتوں کے متعلق تمہارے تجربات قابل ذکر بھی نہیں ہیں' تاہم فطرت کی طرف سے تمہیں ظرافت کا مادہ عطا ہوا ہے اور میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم نے میرے لبوں پر تبسم پیدا کر دیا ہے۔''

بیقس نے غصے میں بھری ہوئی آواز میں کہا؛ ''ٹائمن!''

فراسیلاس نے کہا؛ ''چھوڑو بھی پیاری بیقس! عام آدمیوں کے برخلاف میری عادت ہے کہ جب لوگ میرے متعلق کسی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو مجھے صرف ان کی تعریف یاد رہتی ہے۔ ٹائمن نے اپنی رائے ظاہر کر دی' اور کئی ایسے ہوں گے کہ میری تعریف کریں۔ کسی شخص کو یہ توقع نہ رکھنی چاہئے کہ سب لوگ اسی کے گن گائیں گے۔ میں گوناگوں آراء و خیالات کا محرک ہوں اور آراء کو میں ایک باغ تصور کرتا ہوں جس میں پہنچ کر میں گلاب کے پھول کی مہک سے خوش ہو جاتا ہوں اور اپنے باغ کو ماذریوں سے خالی کر دینے کی تکلیف برداشت نہیں کرتا۔''

زرینہ نے اس طرح منہ بنایا گویا وہ اس قسم کے آدمی کو سخت حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے جو بحث مباحثے کو اس طرح ختم کر دینے کے قابل ہو' وہ ٹائمن کی طرف مڑی جو اس کے ساتھ ہی لیٹا تھا اور اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

پھر پوچھا؛ ''زندگی کا مقصد کیا ہے؟''

جب زرینہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی فلسفی سے کس طرح باتیں شروع کرے تو وہ یہی سوال کر دیا کرتی تھی، لیکن اس دفعہ اس کے لہجے میں ایسی نرمی تھی کہ ٹائمن نے اس سوال کو اظہارِ محبت تصور کیا، تاہم اس نے سکون سے جواب دیا ''زرینہ ہر شخص کی زندگی کا مقصد جداگانہ ہے، کوئی ایسا مشترک مقصد نہیں جس کی طرف تمام لوگوں کی زندگیاں گامزن ہوں۔ میری طرف دیکھو! میں ایک ساہوکار کا بیٹا ہوں، جس کے مؤکلوں میں مصر کی سب بڑی بڑی کسبیاں شامل ہیں۔ میرے باپ نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے اچھی خاصی دولت جمع کر لی ہے اور اب میں نہایت معزز طریقے سے یہی دولت ان کسبیوں کو واپس بخش رہا ہوں، جو میرے باپ نے ان سے چھینی تھی۔ جہاں تک خدا کی دی ہوئی جسمانی طاقت اجازت دیتی ہے، کسبیوں سے لذت یاب ہوتا ہوں، میں محسوس کرتا ہوں کہ میں صرف ایک فرض پورا کرنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتا ہوں اور میں نے اس فرض کو انجام دینا اپنے ذمے لگا لیا ہے کیونکہ اس فرض کی انجام دہی میں اعلیٰ ترین نیکیاں اور ان کے متخالف لذتیں گویا شیر و شکر ہو گئی ہیں۔ نیکی کا لطف بھی اٹھاتا ہوں اور مزے بھی لیتا ہوں، یہ بات کسی اور فرض کی انجام دہی میں کہاں ممکن تھی۔''

باتیں کرتے کرتے اس نے اپنی دائیں ران زرینہ کی دائیں ران کے اوپر رکھ کر اس کے ملے ہوئے زانوؤں کو جدا کرنا چاہا۔ گویا اسی رات اپنی زندگی کا صحیح مقصد پورا کرنا چاہتا تھا، لیکن زرینہ نے اسے اجازت نہ دی۔

ایک لمحے کے لئے خاموشی رہی، پھر سیسو نے کہا؛ ''تم نے یہ کیا لغویت کی کہ جس مضمون پر ہم سب سنجیدگی سے بات کر سکتے تھے، اس کو دریابرد کر دیا، اگر چڑچڑے پن کے بغیر رہ نہیں سکتے تو نا قریطس ہی کو بولنے دو۔''

مہمان نے کہا؛ ''میں محبت کے متعلق کیا کہوں! جو دکھ سہتے ہیں ان کا دل، بڑھانے کے لئے درد کا نام محبت رکھ لیا گیا ہے۔ دکھی ہونے کے دو طریقے ہیں، جو چیز پاس نہیں اس کی خواہش کرنا، ایک، اور دوسرے، جس چیز کی خواہش کبھی تھی، اسے پا لینا۔ محبت شروع ہوتی ہے پہلے طریقے سے اور ختم ہوتی ہے دوسرے طریقے سے، یعنی بہت ہی بری طرح، دوسرے الفاظ میں محبت کرنے والا اپنی محبت میں کامیاب ہو

جاتا ہے' دیوتا ہمیں محبت سے بچائیں۔"

فلاڈیمس نے مسکرا کر کہا؛ "اچھا یہ تو بتاؤ اگر غیر متوقع طور پر مسرت حاصل ہو کہ اس کی کوئی امید ہی نہ ہو تو اسے حقیقی مسرت کہہ سکتے ہیں۔"

"یہ بہت نادر ہے' بہت کم ایسا اتفاق ہو گا۔"

"نہیں نہیں۔ ناقریطس سنو! خواہش نہ کرو' ہاں اس طرح زندگی بسر کرو کہ لذت حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوتا رہے۔ محبت نہ کرو! ہاں دور ہی دور سے سوچتے رہو کہ فلاں فلاں نازنین کیسی اچھی ہے۔ اگر اتفاق سے ایسے مواقع پیدا ہو جاتے کہ اس سے ملاقات ہو جاتی تو نتیجہ یہ نکلتا کہ اس کی طرف دل کھنچ ہی جاتا۔ کسی عورت سے ایسی صفات' ایسی باتیں منسوب نہ کرو جو تم اس میں دیکھنا چاہتے ہو' جن خوبیوں کی مالک ہونے کی طرف وہ خود اشارہ کرتی ہے' ان کے موجود ہونے کا بھی اعتبار نہ کرو۔ عورت کے وجود کو بے کیف' بے لطف' خیال کرو اور پھر جب وہ نشاط و مسرت کی جنت ثابت ہو تو تمہاری حیرت کتنی شیریں ہو گی۔ کیا یہی سب سے اچھا مشورہ نہیں جو ایک فلسفی عاشقوں کو دے سکتا ہے' صرف وہ آدمی خوش رہے ہیں جنہوں نے اپنی قیمتی زندگی میں کبھی کبھار' غیر متوقع لذتوں کی نایاب پاکیزگی کا مزا لوٹا ہے۔"

اب دعوت کا دوسرا دور اختتام کے قریب تھا' بیقس نے اس دور کے لئے دنیا کی گوناگوں نعمتیں جمع کی تھیں۔ مرغِ صحرائی' تیتر' کالے چکور' سرخ و زرد پرندگانِ دشتی۔ پھر ایک بطخ تھی' جس کے پر اسی طرح ساتھ تھے' اڑتالیس گھنٹے تک باورچیوں نے اس بطخ کو آہستہ آہستہ دھیمی آنچ پر پکایا تھا کہ جلنے نہ پائیں۔ خمدار پلیٹوں پر طرح طرح کا گوشت تھا' مرغ سقا' بٹیر اور ایک سفید طاؤس جو گویا اٹھارہ بھنے ہوئے قیمہ بھرے انڈوں پر بیٹھا تھا۔ مختصراً کھانے کی اتنی کثرت تھی کہ لذیذ ترین حصوں کے ختم ہو جانے کے بعد بھی سینکڑوں آدمیوں کے لئے کافی تھا' لیکن آخری دور کے مقابلے میں یہ تمام سامان ہیچ تھا۔

مطبخ کا یہ شاہکار (جس کا مثل سکندریہ میں کم دیکھا گیا تھا) ایک بچہ خوک تھا' جس کا نصف حصہ ابلا ہوا تھا' نصف بھنا ہوا۔ یہ دریافت کرنا ناممکن تھا کہ ہلاک کس طرح کیا گیا' نہ یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ اس کے شکم میں اتنی نعمتیں کیسے بھر دی گئی تھیں

۔فربہ بودنہ بلدر چین' سینہ مرغ' چکاوک 'لذیذ اچار اور چٹنیاں' پارہ ہائے جسم خفی' قیمہ 'غرض اس کے شکم میں عجیب عجیب نعمتیں موجود تھیں اور یہ راز نہ کھلتا تھا کہ کس طرح بھری گئی ہیں۔

اس چیز کو دیکھ کر چاروں طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے اور فاسٹینا نے فیصلہ کر لیا کہ اس کی ترکیب دریافت کر کے دم لے گی۔ فراسیلاس نے مسکرا کر خوبصورت تشبیہی کلمات میں تعریف کی' فلاڈ یمس نے فی البدیہہ ایک شعر کہا جس میں صنعتِ ابہام اس خوبصورتی سے استعمال کی گئی تھی کہ سیسو جو پی کر' سرخوش ہو چکی تھی' ہنسی کے مارے بے دم ہو گئی۔ بیقس نے کنیزوں کو حکم دیا کہ مہمانوں کے ساتوں پیالوں میں سات قسم کی نایاب شراب ڈال دیں' اور اس کے بعد گفتگو میں متانت کا لہجہ کم ہو گیا۔

ٹائمن نے بیقس سے پوچھا؛ ''تم نے اس غریب لڑکی پر خواہ مخواہ سختی کی جسے میں ساتھ لانا چاہتا تھا وہ تمہاری ہم پیشہ تو تھی نا' تمہاری جگہ میں ہوتا تو بجائے ایک امیر کبیر گھر گرہستن کے کسی دکھیاری کسبی کا زیادہ خیال کرتا۔''

بیقس نے کہا؛ ''تم تو ہو گئے ہو باؤلے!''

''میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جب کوئی بھلا آدمی ٹھونک بجا کر بات کرتا ہے تاکہ کوئی حرف نہ رکھ سکے تو لوگ اکثر اسے باؤلا کہتے ہیں' کوئی خوبصورت سی بے معنی گپ ہانک دو' پھر دیکھو' کس طرح لوگ ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔''

''اچھا' آؤ' ٹائمن' ان بھلے آدمیوں سے پوچھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایسی کسبی کو داشتہ بنانا پسند کرے گا جس کے پاس چاندی چھلا بھی نہ ہو۔''

فلاڈیمس نے سادگی سے کہا؛ ''میں ایسا کر چکا ہوں۔''

اور عورتوں کو اس سے تنفر پیدا ہو گیا۔

اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا؛ ''پچھلے سال جب سیسرو کو جلاوطن کیا تو مجھے بھی ڈر تھا کہ کہیں مجھ پر بھی کوئی آفت نہ آئے' میں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ ذرا کوہ الپس کا چکر لگا آؤں' وہاں پہنچ کر میں جھیل کیلسس کے کنارے ایک گاؤں اور دہیا میں ٹھہرا۔ بڑا دلکش چھوٹا سا گاؤں تھا' تین سو گھر ہوں گے۔ وہیں ایک عورت نے کسبی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا تاکہ دوسری عورتوں کی عصمت

محفوظ رہے۔ اس کے گھر کا نشان یہ تھا کہ دروازوں پر پھولوں کا ایک ہار لٹکتا رہتا تھا لیکن اس کی شکل و صورت وضع قطع کے لحاظ سے اس میں اور اس کے بہن بھائیوں میں کوئی فرق نہ تھا' اسے خبر ہی نہ تھی کہ دنیا میں روغن اور غازہ' عطریات' باریک انچل یا گھنگھریالے بال بنانے کے لئے اوزار بھی ہوتے ہیں۔ اس نے یہ بھی نہ سنا تھا کہ ہار سنگھار کس بلا کا نام ہے' درخت صنوبر کے شیرے سے اپنے جسم کے بال اڑایا کرتی تھی' جس طرح سنگ مرمر کے صحن سے جھاڑیاں اکھاڑ کر پھینک دی جاتی ہیں۔ تمہیں گھن تو آئے گی لیکن خیر' سنو وہ ننگے پاؤں پھرا کرتی تھی' اس لئے اس کے پاؤں کا بوسہ لینے کو جی نہ چاہتا تھا' (فاسٹینا کی طرح نہیں کہ اس کے پاؤں ہاتھوں سے زیادہ نرم ہیں) اور اس کے باوجود میرے خیال میں وہ نہایت حسین تھی' اتنی حسین کہ پورا ایک مہینہ میں نے اس کے سانولے جسم کو اپنی آغوش میں لیے رکھا' اور اس ایک ماہ میں مجھے روم یاد آیا نہ خوش نصیب ٹائیر' نہ سکندریہ۔"

ناقریطس نے اپنا سر جھکایا' اور شراب پی کر کہا: "محبت کا عظیم الشان لمحہ وہ ہے جب جسم انسانی عریاں ہوتا ہے' کسبیوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے اور عریانی کو 'حیرت کاری' کے موقع کے لیے مخصوص رکھنا چاہیئے' لیکن وہ اس کے برخلاف عمل کرتی ہیں اور ہمارے فریب خیال کے طلسم ٹوٹ جاتے ہیں' کیسا برا معلوم ہوتا ہے ان بالوں کو دیکھنا جن پر گرم لوہے کے نشان صاف نظر آرہے ہوں' کیسی گھناؤنی بات ہے ایسے گالوں کا بوسہ لینا جن کا غازہ' ہونٹوں کے ساتھ چپکا چلا آئے' اور کیسی قابل رحم حالت ہے۔۔۔ ان سرمگیں آنکھوں کی جن میں سرمہ بہہ کر کہیں کہیں آنکھ کی اصلی حالت دکھائی دے رہی ہو۔

اگر گھر گرہستنیں ایسی حرکتیں کریں تو خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ ہر عورت چاہتی ہے کہ اس کے ارد گرد اس کے مداح عاشقوں کا ایک حلقہ بنا رہے اور کسی کو یہ جرأت نہ ہوگی کہ گھر گرہستن کے فریبِ آرائش کو بے نقاب کر دے' ان کی بات بنی رہتی ہے۔ لیکن مجھے تعجب تو کسبیوں پر ہوتا ہے' ان کا تو مقصد' اور ذریعہ معاش ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں زیادہ حسین معلوم ہوتی ہیں اور بسترِ عشق پر کمتر۔"

زرینہ نے مسکرا کر کہا: "تم تو نرے گوکھے ہو' بیس عاشقوں میں سے ایک کو بھی ہم ہمیشہ کے لیے دامِ محبت میں اسیر نہیں رکھ سکتیں اور پھسلانا تو پانچ سو آدمیوں

میں سے ایک کو بھی مشکل ہے۔ گاہک پہلے تو بازار ہی میں ہمارے حسن سے متأثر ہوتا ہے، پھر کسی اور چیز کی باری آتی ہے، اگر ہم غازہ، سرخی استعمال نہ کریں تو کوئی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے، فلاڈ تمس والی کسبی سارے گاؤں میں ایک تھی، اس لیے اس پر تو نظر خواہ مخواہ پڑتی تھی، یہاں پندرہ ہزار کسبیاں ہیں مقابلہ بڑا سخت۔"

"کیا تم نہیں جانتیں کہ اصلی حسن کو گہنے پاتے اور ہار سنگھار کی ضرورت نہیں، حسن ہونا چاہیئے یہی کافی ہے۔"

"ہاں یہ بات جانتی ہوں، خیر، کسی اصلی حسین کسبی کو ذرا ناتھین کے پاس بٹھا کر دیکھو جو بوڑھی بھی ہے اور بدصورت بھی، حسین کسبی کو پرانی قبا پہنا دو، اور تھیٹر میں آخری صف میں بٹھا دو، ناتھین کو تاروں کی طرح جھلملاتا ہوا لباس پہنا دو اور کنیزوں کے لیے جو نشستیں مخصوص ہیں وہاں بٹھا دو، پھر دیکھو باہر نکلتے وقت دونوں کی کیا قیمت پڑتی ہے، اصلی حسین کی قیمت آدھا درہم ہوگی اور ناتھین کی دو سو درہم۔"

سیسو نے بحث کو ختم کرنے کے انداز میں کہا: "سب مرد گدھے ہوتے ہیں۔"

"نہیں گدھے نہیں، ست ہوتے ہیں، اپنی داشتہ کی تلاش میں تکلیف نہیں برداشت کرنا چاہتے۔ جن عورتوں کو سب سے زیادہ پیار کیا جاتا ہے، وہ سب سے بڑھ کر جھوٹ بولتی ہیں۔"

فراسیلاس نے نرمی سے کہا: "اچھا فرض کر لیجیے کہ ایک طرف تو میں تیار ہوں کہ"۔۔۔ اور اس نے نہایت دلکشی سے متضاد نظریوں کو صحیح ثابت کر دیا جو یکساں طور پر ہر قسم کی دلچسپی سے معرا تھے۔

ایک ایک کر کے بارہ کسبیاں جمع ہو گئیں، فن رقص میں ان کا ثانی نہ تھا۔ پہلی دو کے پاس بانسریاں تھیں، آخری دو کے پاس دف تھے، باقی کسبیوں کے پاس جھانجھن، انہوں نے اچھی طرح دیکھ بھال لیا کہ ان کے بند ٹھیک ٹھاک تھے، اپنی چپلوں کو درخت صنوبر کے شیرے میں تر کر لیا، اور بانہیں پھیلا کر ساز کی آواز کا انتظار کرنے لگیں، آہستہ آہستہ ایک گت بجنی شروع ہوئی، ہوا کی طرح ہلکی پھلکی اور بارہ کی بارہ کسبیاں رقص کے لیے آگے بڑھیں۔

ان کا ناچ سست، نفسانیت انگیز اور بظاہر بے ترتیب معلوم ہوتا تھا، اگرچہ

حقیقت یہ تھی کہ بہت پہلے جسم کی ہر حرکت پر غور کر لیا گیا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی جگہ میں ناچ رہی تھیں اور اس چھوٹی سی جگہ میں سمندر کی لہروں کی طرح پھیلتی اور سمٹتی تھیں، تھوڑی دیر کے بعد وہ دو دو ہو کر علیحدہ ہو گئیں، لیکن ناچ کی ہم آہنگی میں خلل نہیں پڑنے دیا، اب انہوں نے اپنے کمر بند کھول دیئے۔ ان کی قبائیں زمین پر گر پڑیں، عریاں عورتوں کی خوشبو مردوں کے حلقے میں چاروں طرف منتشر ہو گئی اور پھولوں کی مہک اور گرم گوشت کی بُو پر چھا گئی، ناچنے والی نازنینیں، کمان کی طرح پیچھے جھک گئیں، پیٹ آگے کی طرف کھنچے ہوئے، بانہیں آنکھوں پر رکھے، پھر ناگاہ وہ اس تیزی سے سیدھی ہوئیں کہ ان کی کمر کی نزاکت نمایاں ہو گئی، کولہے اندر کی طرف پچک گئے اور وہ ایک دوسری کے پاس سے اس قدر قریب ہو کر گزریں کہ ان کی لرزاں چھاتیوں کی نوکیں ایک دوسری سے چھو گئیں۔

فراسیلاس نے اپنی باریک آواز میں کہا: "کہو دوست کیا خیال ہے"

ٹائمن نے کہا: "مزے ہیں، آج رات مجھے صاف طور پر معلوم ہو گیا ہے کہ عورت کی زندگی کا کیا مقصد ہے۔"

"اور کیا ہے مقصد؟"

"آرٹ ہو یا نہ ہو، عورت کی زندگی کا مقصد ہے، کسبی بن جانا۔"

"یہ ایک مرد کا خیال ہے۔"

فراسیلاس! میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ کسی چیز کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی چیز کا وجود ہے ہی نہیں اور یہ دعویٰ بھی یقینی نہیں ہے یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ تمہیں جو خبط ہے۔ اس کے مطابق ذرا تمہید باندھ لوں۔ اب مجھے اس بات کی اجازت دو کہ میں اپنے دعویٰ کی تائید میں ثبوت پیش کروں۔ یہ دعویٰ محلِ نظر ہے، بے شک اس پر بڑی بحث ہو سکتی ہے۔

دوست! لیکن مجھے بھی اس دعویٰ سے دلچسپی ہے جس پر میرا ایمان ہے اور لوگوں کو بھی اس دعویٰ سے دلچسپی ہے جو اس کی تردید کرتے ہیں، فکر و دماغ کی دنیا میں، تازہ خیالی! وہم ہے محض وہم، خیال ہے صرف خیال! تمہارے یقین سے بھی زیادہ بے حقیقت اور اس بات کو تم خوب جانتے ہو"۔

سیسو نے کنیز سے کہا "مجھے بسوی شراب دو، دوسری شرابوں سے زیادہ نشہ

ہے اس میں"۔

ٹائمن نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا"میرا دعویٰ ہے کہ جس عورت نے شادی کے بعد اپنے خاوند کی خدمت گذاری میں عمر گذار دی (جو اسے دھوکا دیتا ہے) اور کسی دوسرے سے محبت کے پتنگ نہ بڑھائے یا اگر بڑھائے تو کبھی کبھی (ایک ہی بات ہے) جس نے مسلسل بچے پیدا کیے اور ان کی خاطر ان کے پیدا ہونے سے پہلے اپنے جسم کو بد زیب بنایا۔ جس نے بچے پیدا کرنے کے بعد ان کی خدمت کے لئے زندگی وقف کر دی، میرا دعویٰ ہے کہ ایسی عورت کی عمر اکارت گئی، جس دن لڑکی شادی کرتی ہے اس دن اپنی عمر کی سب سے بڑی حماقت اس سے سرزد ہوتی ہے"۔

ناقریطس نے اس طرح گویا اسے خود بھی اس بات پر اعتقاد نہیں ہے، کہا"وہ سمجھتی ہے کہ وہ ایک فرض پورا کر رہی ہے"۔

فرض؟ کیسا فرض؟؟ کس کا فرض! کیا اسے اس بات کا حق نہیں کہ خود ہی اس مسئلے کا فیصلہ کر لے جو صرف اس سے متعلق ہے، وہ عورت ہے اور اس حیثیت سے وہ عام طور پر ذہنی مسرتوں کی طرف سے بے پرواہو گی، اور طرہ یہ ہے کہ وہ صرف اسی بات پر بس نہیں کرتی کہ دنیا کی نصف مسرتوں سے وہ محروم ہو چکی ہے بلکہ شادی کرنے کے بعد اپنے اوپر جسمانی لذتوں کے دروازے بھی بند کر لیتی ہے، اس طرح تو لڑکی اس عمر پر جب وہ آگ ہی آگ ہوتی ہے اپنے آپ سے یہ کہہ سکتی ہے"میں شوہر سے محبت کی پتنگیں بڑھاؤں گی" پھر دس عاشقوں سے کھیل کھیلوں گی یا شاید اس سے زیادہ اور پھر ایمانداری سے اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس نے جی بھر کہ دنیا کی لذتیں چکھ لیں، میں تو تین ہزار عورتوں سے بھی سیر نہیں ہو سکتا، موت کے دن یہی حسرت ساتھ لے جاؤں گا"۔

زرینہ نے کہا"تمہارا معیار تو بہت بلند ہے"۔

فلاڈیمس نے کہا"کمبیاں تو ہماری یعنی بنی نوع انسان کی محسن ہیں، ان کی شان میں مخورات جلانے چاہئیں، زریں اشعار کہنے چاہئیں، انہی کے صدقے میں تمہیں کتنی بلاؤں سے نجات ملتی ہے، نہ لمبی چوڑی احتیاط کی ضرورت ہے، نہ کسی کے رشک و رقابت کا کھٹکا، نہ کسی تدبیر کا فکر، نہ غم درد نہ غم کالا، آشنائی میں جو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں، سب سے پنڈ چھوٹ جاتا ہے، نہ خوف نہ فکر، انہی کی طفیل مزے کرتے ہیں۔

نہیں تو آشنائی میں کوئی ایک جھمیلا تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ مینہ برس رہا ہے لیکن ملاقات کا وقت مقرر ہو چکا ہے' جانا ضرور ہے' سیڑھیاں شکستہ ہیں' چرچر کی آواز آرہی ہے ڈر کے مارے روح خشک ہوئی جاتی ہے' اس چور دروازے سے داخل ہوتا ہے! لو اب ملاقات نہیں ہوسکتی خدا جانے کیا بات ہوگئی' آج خط پکڑا گیا' کل اشارے ٹھیک سمجھ میں نہ آئے' غرض کہاں تک بیان کیا جائے" "بس میں تو اس چیز پر مرتا ہوں کہ تمہارا محاصرہ کرنے کی ضرورت نہیں یعنی مسلسل کوشش درکار نہیں' ہے کچھ پیسوں کے عوض تم وہ کچھ دے ڈالتی ہو جو گھر گرہستنیں تین ہفتے بڑی شدومد سے نہیں نہیں کرنے کے بعد' بڑا احسان کر کے عطا کرتی ہیں' بلکہ اس سے کچھ زیادہ دیتی ہو کیونکہ تم سمجھ دار ہو اور خوب جانتی ہو کہ محبت کسی قسم کی قربانی نہیں ہے یہ تو نقد سودا ہے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے' چنانچہ جو کچھ ہم تمہیں دیتے ہیں وہ تمہاری بے اندازہ محبت کا معاوضہ تو کبھی نہیں ہوسکتا' ہاں! البتہ وہ اس گوناگوں اور دلکش سامان عیش و عشرت کی مناسب قیمت ہے' جس میں تم کمال مہربانی سے گھرا رہنا پسند کرتی ہو اور جس کی آغوش میں ہماری مضطرب تمناؤں کو سکون نصیب ہوتا ہے۔

تم بے شمار ہو اس لئے ہم تمہارے حسن پر اپنی اپنی زندگی کی خوابوں کی تعبیر اور اپنی دقتی آرزوؤں کی تسکین پاتے ہیں' ہر روز حسن کا ایک نیا نمونہ مہیا ہوسکتا ہے' ہر قسم کے بال' ہر رنگ کی آنکھیں' ہر مذاق کے لب مل جاتے ہیں اس دنیا میں تم پاکیزہ سے پاکیزہ محبت کی نقل اتار سکتی ہو۔

گھناؤنی سے گھناؤنی ہوس کو پورا کرسکتی ہو آوارہ ور سوا غنڈے تمہارے پاس آئیں تو نرمی سے ان کو رجھاتی' ہو دکھوں کے مارے گاہک آئیں تو ان کو تسلی دیتی ہو۔ تمہاری مہمان نوازی میں کبھی فرق نہیں پڑتا' اور تم کتنی حسین ہو' غضب کی حسین ہو۔۔۔ اسی لیے زرینہ' بغیس' فاسٹینا' سیسو! میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا بڑا منصف ہے' اس کی مشیت ہے کہ کسبیوں کے گاہک عمر بھر ان کی محبت میں اسیر رہیں اور گھر گرہستنیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان سے جلا کریں۔"

ناچ ختم ہو چکا تھا اس کے بعد ایک کمسن لڑکی نے اپنے کرتب دکھائے وہ چھریوں سے کھیل کر بازی گری کے کمال دکھاتی تھی' زمین میں چھریاں گاڑ کر ہاتھوں کے بل ان کی قطاروں میں سے گزرتی تھی۔

لوگوں کی توجہ اس لڑکی کے خطرناک کھیل کی طرف تھی۔ ٹائمن نے زرینہ کی طرف دیکھا اور ہولے ہولے کہ کسی کو دیکھنے کا موقعہ نہ ملے وہ اس کے پیچھے اچھی طرح دراز ہو گیا۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس کا بدن زرینہ کے بدن سے چھو رہا تھا زرینہ نے آہستہ سے کہا "ہٹو ٹائمن! ہٹ جاؤ' بھلے آدمی باز آجاؤ۔"

لیکن اس نے زرینہ کے لباس کے شگاف میں ہاتھ ڈال لیا تھا اور احتیاط سے لپٹی ہوئی کسبی کی جلتی ہوئی نازک جلد پر تھپکیاں دے رہا تھا۔

زرینہ نے منت سے کہا "ٹھہرو ٹھہرو' دیکھو کوئی دیکھ لے گا اور بیقس خفا ہو گی۔"

نوجوان ٹائمن نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا کہ اس طرف کسی کی توجہ نہ تھی اور اب اس نے جرأت سے کام لے کر زرینہ کو اس طرح پیار کیا کہ اگر ایک بار اس قسم کے پیار کی اجازت عورت دے دے تو پھر عموماً مدافعت نہیں کرتی۔ پھر گویا اس دلیل سے وہ زرینہ کی گریزپا حیا کے آخری مضافات کو ملیامیٹ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے زرینہ کے ہاتھ میں جو اتفاق سے کھلا تھا اپنا بوسہ دے دیا' زرینہ نے مدافعت کرنی ترک کر دی' کم عمر باز یگر لڑکی اپنی خطرناک اور لطیف باز یگری میں مصروف تھی' وہ ہاتھوں کے بل چل رہی تھی' حاشیۂ دامن الٹا ہو' ٹانگیں آگے کی طرف سر کے اوپر لٹکتی ہوئی بڑی احتیاط سے تیز چھریوں اور چمکتی ہوئی دھاروں کے درمیان سر کو بچاتی گزر رہی تھی اس خطرناک وضع کے اختیار کرنے میں جو بدنی محنت صرف ہوتی تھی اس کی وجہ سے شاید اور زخمی ہو جانے کے خوف سے اس کے سانولے گالوں میں گرم خون اکٹھا ہو گیا تھا اور اس اجتماع خون سے اس کی کھلی آنکھوں کی تابناکی اور بڑھ گئی تھی۔ اب وہ سیدھی ہوئی اس کا بدن اپنی اصلی حالت پر آگیا اس کی رانیں رقاصہ کی بانہوں کی طرف پھیلی ہوئی تھیں' وہ اضطراب میں ہانپ رہی تھی اور اس کا عریاں سینہ لرز رہا تھا'

زرینہ نے غصے سے کہا "بس چھوڑو مجھے' بس یہی ہوانا کہ تم نے میرا جی خراب کر دیا۔ جاؤ' جاؤ"

اور جونہی رسوم قدیم کے مطابق دو آفیریائی نازنینیں "افسانہ مخنث" کی دھن بجانے کے لئے آگے بڑھیں' زرینہ اپنے صوفے سے اٹھ کر بخار کی سی حالت میں مضطرب ہو کر باہر نکل گئی۔

حوالہ جات

(۱) سسرو ؛ مشہور مقرر اور مقالہ نویس۔ اس کے زورِ تقریر سے دنیا پناہ مانگتی تھی، پیدائش : ۱۰۶ قبل مسیح۔

(۲) ہیرا کلیٹس ؛ پیدائش ۵۱۳ قبل مسیح، اس کا خیال تھا کہ علم مبنی ہے قوتِ ادراک پر، آگ کو مادے کی ابتدائی شکل تصور کرتا تھا۔

(۳) پرمینی داس ؛ مشہور یونانی حکیم۔ پیدائش ۵۱۳، قبل مسیح، ایک خاص نظام فلسفہ کا موسس ہے۔ اس کے متبعین میں سے زینو بہت مشہور ہے۔

(۴) فیثاغورث ؛ مشہور حکیم جو مسلکِ اعتدال کی تعلیم دیتا تھا۔ لزلیس نے اس کی تعلیمات کا خلاصہ کیا اور ایک کتاب موسومہ اشعارِ زریں اس کو محفوظ کر دیا۔ یہ کتاب فرانسیسی میں ترجمہ ہو کر تمہیدی مقالے کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

(۵) ساس پین ؛ (Sauce pan) جس میں چھوٹی موٹی چیزیں گھی، روغن میں تلی جاتی ہیں۔

تیسرا باب

ریکائٹس

مجلسِ وعظ تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

مشکل سے دروازہ بند ہی ہوا ہوگا کہ زرینہ نے اپنی نفسانیت کے مرکز آتشیں کو اپنے ہاتھوں سے دبالیا جس طرح کوئی اس حصہ جسم کو دباتا ہے جس سے ٹیسیں اٹھ رہی ہوں۔ ایک ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔۔۔۔۔۔ انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ شدتِ اضطراب میں سسکیاں بھر رہی تھی۔

کیا اسے کبھی معلوم نہ ہوگا کہ دیمیطر لیس پر کیا گزری، جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا کامیابی کے امکانات لحہ بہ لحہ کم ہوتے جاتے تھے اور اسے یہ بات خوب معلوم تھی وہ جرأت کر کے شیشے کے متعلق کچھ پوچھ بھی نہ سکتی تھی، نہیں تو اس طرح ہی اسے حقیقتِ حال کا علم ہو جاتا۔ اگر شیشہ چرا لیا جا چکا ہوگا تو اس سوال کے بعد فوراً ڈاس پر شبہ ہوگا اور پھر کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات تھی کہ اب وہ محفل میں چپ بھی نہ بیٹھ سکتی تھی۔ اسے خوف تھا کہ کہیں منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے۔ اسی اضطراب کی وجہ سے وہ محفل سے مجبور ہو کر چلی آئی تھی۔

ٹائمن کی دست درازیوں نے اس کے دبے ہوئے غصے کی چنگاریوں کو بھڑکا دیا تھا اور اب وہ بے چینی کی وجہ سے کانپ رہی تھی اور وہ مہیب و عظیم ستون سے

لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔اس کا باعث یہی تھا۔اس پر ضعف سا طاری ہو رہا تھا' وہ ڈر گئی تھی کیونکہ وہ محسوس کرتی تھی کہ اس کی حالت غیر ہونے والی ہے۔اس نے بہرام کو بلایا اور کہا" میرے زیوروں کا خیال رکھنا میں ذرا سیر کے لئے جا رہی ہوں" یہ کہہ کر زینے کی سات سیڑھیاں طے کر کے شہر کی طرف روانہ ہوئی۔

رات گرم تھی اور ہوا نے گویا دم سادھ رکھا تھا۔اس کی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے نمودار ہو گئے۔اس کی توقعات کے خلاف جو واقعات پیدا ہوتے رہے تو اس کے اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔اس کا سر چکرانے لگا۔لیکن وہ کسی نہ کسی طرح بازار میں سے گزرتی چلی گئی۔

بیقس کا گھر سکندریہ کے براشین حصے کے کنارے پر اصلی شہر ریکاٹس کے سرے پر واقع تھا۔ریکاٹس 'مصری عورتوں اور ملاحوں سے پٹا پڑا تھا۔ماہی گیر سارا دن بے پناہ گرمی کی وجہ سے لنگر ڈال کر اپنی کشتیوں ہی میں سوتے رہتے' لیکن ریکاٹس میں بسر کرتے تھے' جہاں گویا گھی سے چپڑی اور دو دو والا معاملہ تھا۔ایک تو بھٹیاروں کی دکانیں اور شراب کا نشہ' دوسرے کسبیوں کے حسن کا خمار۔دن بھر مچھلیاں بیچ کر جو کچھ کماتے وہ ریکاٹس میں لٹا آتے۔

زرینہ سکندریہ کے اس مضافاتی شہر کی تنگ گلیوں میں چلی جا رہی تھی جہاں جوتیوں کی سٹر پٹر و حشیانہ موسیقی' طرح طرح کی آوازوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔زرینہ نے کئی بار چوری چھپے' کھلے دروازوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ چراغوں کے بدبودار دھوئیں کے نیچے جوڑے ہم آغوش تھے۔چوک کے پاس مکانوں کے سامنے' نیچے چبوتروں پر گونا گوں چوبی چارپائیاں انسانی جوڑوں کے دوہرے دوہرے بوجھ سے چرچرا رہی تھیں' سایوں میں لرز رہی تھیں۔زرینہ بے چین تھی' لیکن چلی جا رہی تھی۔ایک عورت نے جس کا وقتی عاشق کوئی نہ تھا' اسے روکنا چاہا (کہ اسے گویاں بنا لے)۔ایک بوڑھے کھوسٹ نے اس کے سینے میں چٹکی لی۔ایک عورت نے اپنی لڑکی پیش کی' ایک اکھڑ دہقان نے جس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا' اس کی قفائے گردن کا بوسہ لے لیا' اس کا دورانِ خون تیز ہو گیا' ڈر کے مارے وہ بھاگی جاتی تھی۔اس یونانی شہر کا یہ عجیب و غریب گاؤں تاریکیوں اور خطروں سے لبریز معلوم ہوتا تھا' اس شہر کی پیچدار گلیوں سے اس کے بعض مکانوں کے اسرار و رموز سے اسے

بہت کم واقفیت تھی۔ اس سے پہلے جو وہ دو تین بار یہاں آئی تھی تو بخطِ مستقیم چلتی ہوئی ایک مختصر سے سرخ دروازے سے ایک مکان میں داخل ہو گئی تھی اور یہاں اس نے ایک قوی ہیکل ہٹے کٹے نوجوان سائیس کی انتھک ہم آغوشی میں اپنے معمولی عاشقوں کو بھلا دیا تھا اور ایک بار اس نے خوش ہو کر اس سائیس کو انعام بھی دیا تھا۔ لیکن آج اسے مڑ کر دیکھنے کے بغیر معلوم تھا کہ دو آدمی اس کا تعاقب کر رہے تھے۔

اس نے اپنی رفتار تیز کر دی تعاقب کرنے والوں نے بھی ایسا ہی کیا زرینہ کو دوڑنے کی آواز آئی۔ خوف کے مارے بے آپے ہو کر وہ ایک گلی میں مڑ گئی۔ الٹے قدموں چل کر ایک دوسری گلی میں داخل ہوئی اور ایک سڑک پر آنکلی، جو خدا جانے کس طرف جا رہی تھی۔ گلا خشک، کنپٹیاں گرم و لرزاں۔ وہ صرف بیقس کی تیز و تند شراب کے نشے میں چلی جا رہی تھی، کبھی دائیں طرف بھاگتی کبھی بائیں طرف۔ رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا، سہم گئی، آخر اس کے سامنے ایک کنواں آ گیا، راستہ مسدود ہو گیا۔ آگے کوچہ بند تھی بے بس ہو گئی، مڑنا چاہتی تھی کہ دو سانولے رنگ کے ملاحوں نے واپسی کا تنگ راستہ بھی بند کر دیا۔

ایک نے ہنس کر کہا: "کہاں بھاگ رہی ہو پیاری، ہائے ری، میرا چھوٹا سا سنہرا تیر!"

"مجھے گزر جانے دو!"

"اچھا راستہ بھول گئی، میری جانی! ریکاٹس کی نہیں تو، ہیں نا! آ۔ تجھے شہر کی سیر کرائیں۔"

دونوں نے زرینہ کو کلائیوں سے پکڑ لیا اور وہ چیخنے لگی۔ ایک دو ہتڑ مارا، کسمسائی، آخر ایک ملاح نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ سے پکڑ لئے اور سادگی سے کہا:

"لے بس، اب جانے دے، غصہ تھوک ڈال، یہاں کوئی یونانیوں کو پسند نہیں کرتا، تیری مدد کو کون آئے گا؟"

"میں یونانی نہیں ہوں۔"

"جھوٹی لپاٹن، یہ گورا گورا اپنڈا، یہ سیدھی ستواں ناک، یونانی نہیں تو؟ اچھا! لے اب چپ کر جا نہیں تو مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔"

زرینہ نے اس ملاح کی طرف دیکھا جو اس سے باتیں کر رہا تھا اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں، پھر اس نے کہا؛

"پیارے جانی چلو تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"میرے ساتھ نہیں، ہم دونوں کے ساتھ، میرے یار کا بھی حصہ ہے، کہ نہیں، دیکھو کیسے مزے کراتے ہیں تمہیں۔"

اسے معلوم نہ تھا کہ وہ اسے کہاں لے جا رہے ہیں لیکن اسے دوسرے ملاح کی درشتی اور وحشیانہ طریقے پسند آ گئے تھے۔ اس نے ملاح کی طرف ایسی بے حس پراسرار نگاہوں سے دیکھا، جس طرح کتیا گوشت کی طرف دیکھتی ہے اور چلتے چلتے کمر لچکا کر ایک طرف جھک کر اپنا بدن اس کے ساتھ چھو کر چلنے لگی، تیز تیز چلتے ہوئے وہ شہر کے ان عجیب حصوں میں سے گزر رہے تھے جہاں بیرونی ممالک کے لوگ آباد تھے۔ یہاں اس وقت زندگی کی تڑپ تھی نہ روشنی کی جھلک! زرینہ حیران ہو رہی تھی کہ جن عجیب و غریب پیچدار گلیوں سے وہ کبھی تنہا باہر نہ نکل سکتی، ان کے تاریک سایوں میں وہ کیسی آسانی سے ٹھیک راستے پر چلے جاتے تھے۔ بند دروازے، بے نور کھڑکیاں دیکھ دیکھ کر وہ سہمی جاتی تھی۔ سر پر تنگ گلیوں اور گنجان مکانوں کے درمیان زرد آسمان کی گویا پتلی سی پگڈنڈی چمکتی ہوئی نظر آتی تھی، جسے چھٹکی ہوئی چاندنی کی روشنی نے تسخیر کر لیا تھا۔

آخر کار وہ زندوں کی بستی میں آن پہنچے، ناگاہ ایک کونے سے جو مڑے تو بیسیوں کھلے دروازوں میں سے روشنی جھانکتی ہوئی دکھائی دی۔ دہلیزوں پر نبطی عورتیں آلتی پالتی مارے بیٹھی نظر آئیں، ان کے دونوں طرف فانوس روشن تھے، ان کی نورانی شعاعیں گویا صعود کرتی ہوئی ان کے سروں پر پڑتی تھیں جو سنہری بندیوں اور جھومروں کی وجہ سے تاجدار معلوم ہوتے تھے۔

دور کہیں سے پہلے مبہم سی بلند ہوتی ہوئی آوازیں آئیں، پھر گاڑیوں کے کھڑکھڑانے کا شور سنائی دیا۔ گٹھڑیوں کے گرنے کی آواز آئی، گدھوں کے سموں کی زمین پر پڑنے کی صدائیں بلند ہوئیں، انسانی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ریکالٹس کے بڑے چوک میں پہنچ گئے تھے، جہاں رات کے وقت، جب سکندریہ محوِ خواب ہوتا تھا نو لاکھ انسانوں کی خوراک کا سامان گدھوں پر لاد کر مزدور سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ کہیں

مکان نظر آتے تھے، کہیں سبزیوں کے انبار، کنول کی جڑیں۔۔۔ زیتون کی ٹوکریاں، تروتازہ مٹر، زرینہ نے چلتے چلتے ایک مٹھی بھاڑی شہتوت اٹھائے اور ٹھونگنے لگی۔ آخر وہ ایک پست دروازے کے پاس پہنچ کر اندر داخل ہوئے۔ ان ملاحوں کے ساتھ آج وہ تھی، جس کے لئے استرتی زائیدۂ کفِ دریا، دیوی زہرہ کے پاکیزہ موتیوں کا ست لڑا ہار چرایا گیا تھا۔

وہ ایک بہت بڑے کمرے میں جا پہنچے جہاں پانچ سو بد نسل تماش بین جمع تھے، جو طلوعِ صبح کے منتظر تھے۔ جَو کی پیلی پیلی شراب کے کاسے ان کے سامنے رکھے تھے۔ انجیریں کھجور کے کیک، چپاتیاں، کچی سبزیاں کھاتے جاتے تھے، شراب پیتے جاتے تھے۔ ان کے درمیان عورتوں کا ایک گروہ کا گروہ چیخنے چلانے کے شغل میں مصروف تھا، گویا ایک فضائے آتشیں میں سیاہ بالوں اور گوناگوں پھولوں کا ایک کھیت لہلہا رہا ہو۔ یہ بے گھر کی عورتیں تھیں، جس کے ہتھے چڑھ گئیں اسی کی ہو گئیں، روٹی کے ٹکڑے مانگتی پھرتی تھیں، ننگے پاؤں، ننگے سر، کھلا سینہ، بدن پر صرف ایک سرخ یا نیلا چیتھڑا سا جو ستر پوشی کے لئے کافی نہ تھا۔ ان میں اکثر عورتوں کی گود میں بائیں طرف دودھ پیتا بچہ تھا جس کے بدن پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ یہاں بھی ناچنے والیاں موجود تھیں۔ سٹیج پر چھ مصری عورتیں رقص کر رہی تھیں، تین سازندے ان کے ساتھ تھے، دو توڈھول پیٹ رہے تھے اور تیسرا پیتل کا ایک بہت بڑا گونجدار مصری عود بجا رہا تھا۔

زرینہ نے خوش ہو کر کہا "اوہ مٹھائیاں" اور کم عمر شکر فروش سے دو پیسوں کی مٹھائی خریدی۔ ناگاہ اس ہال کی ناقابل برداشت بُو سے اس پر غشی سی طاری ہونے لگی اور ملاح اسے گود میں اٹھا کر باہر لے گئے۔

باہر جا کر اسے ہوش آیا اور ذرا طاقت عود کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے پوچھا: "مجھے کہاں لئے جا رہے ہو جانی؟ جلدی کہیں پہنچاؤ، اب چلنے کی سکت نہیں ہے مجھ میں، میں اب کچھ نہ کہوں گی۔ دیکھ لو، تمہارے مطلب کی باتیں کر رہی ہوں کہ ------ بس جلدی کرو۔ کہیں پہنچ لو، نہیں تو میں بازار میں گر پڑوں گی۔"

چوتھلباب

سیاہ مستی

وہی میں ہوں پھر وہی میکشی، وہی صبح وشام کی سرخوشی
وہی جلوہ لب بام ہے کہ حریف ماہ تمام ہے

جب زرینہ واپس ہقیس کے دروازے کے پاس پہنچی تو اس کے بدن میں وہ شیریں کیفیت رچی ہوئی تھی جو نفسانی آرزوؤں کی تکمیل اور جسمانی تقاضوں کی تسکین کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اس کی پیشانی بے داغ بے شکن تھی، اس کے خطوطِ دہن نرم پڑ گئے تھے لیکن اس کے کولہوں میں ابھی تک گاہ گاہ لرزش اور ارتعاش کی رَو دوڑ جاتی تھی۔ سیڑھیوں پر سے گزر کر وہ مکان میں داخل ہوئی۔

جس وقت سے زرینہ باہر گئی ہے اسی وقت ہنگامۂ عشرت گرم ہو گیا تھا اور مہمان بھی آپہنچے تھے۔ ناچنے والی کسبیاں ان کی کمندِ آرزو میں آسانی سے اسیر ہو گئیں، فرش پر چالیس ملکے دَلے ہاروں کے پھول بکھرے پڑے تھے۔ ایک کونے میں شراب سرا قوسہ کی ایک مینائے شکستہ میں سے شراب اس طرح بہہ رہی تھی گویا میز کی طرف پگھلے ہوئے سونے کی نہر جا رہی ہے۔

فلاڈیمس، فاسٹینا کے پاس بیٹھا، اس کی عبا کو تار تار کر دینے کے بعد اس کی تعریف میں فی البدیہہ شعر پڑھ رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا: "اف! یہ نازک پاؤں۔ گول گول پنڈلیاں، پُر گوشت کولھے،

خمدار گلا' یہ بھرے بھرے شانے یہ پستان' یہ صراحی دار گردن' یہ انجیر دوپارہ۔۔۔۔۔۔ اف یہ گرم گرم ہاتھ' یہ مہارت کی حرکتیں' یہ بجلی نہ بیٹھنے والی زبان ۔۔۔۔۔۔ تو مجھے دیوانہ کردے گی' تو اطالیہ کی نازنین ہے' سانولی سلونی' تجھے سیفو کے گیت یاد نہیں لیکن کیا ہوا! پرسوس (۱) بھی ہندوستان کی سانولی سلونی انڈرومیڈا پر جان چھڑکتا تھا۔

سیسو' مصری شراب کے نشے میں دھت بکھرے ہوئے پھلوں کے درمیان پیٹ کے بل میز پر لیٹی تھی۔ ناہید جو ابھی تک کنیز تھی اپنے حلقہ عشاق میں محصور مسندِ ناز پر جلوہ فرما تھی اور اپنی غلامی کی آخری رات منانے کے لئے اس طرح کھل کھیل رہی تھی کہ نہ کبھی دیکھا نہ کبھی سنا۔ مصر کے جلسہ ہائے عشرت کے آئین کے مطابق پہلے تو اس نے بیک وقت اپنے آپ کو تین عاشقوں کے حوالے کر دیا تھا لیکن اس کا کام ابھی باقی تھا' کیونکہ جس قانون کی رو سے کنیز کسبی بن جاتی تھی' اس کا منشا یہ تھا کہ طلوعِ صبح تک کنیز اپنی ان تھک محنت سے ثابت کر کے دکھائے کہ وہ واقعی اس نئی عزت کی مستحق ہے۔

ایک ستون کے پیچھے کھڑے ناقریطس اور فراسیلاس بحث کر رہے تھے کہ ارسیلاس اور کارنیدس میں سے کس کو ترجیح ہے۔ کمرے کے دوسری طرف مرطس کوشش کر رہی تھی کہ روڈس کو ایک بے تاب مہمان کی دست درازیوں سے بچالے۔

جونہی زرینہ اندر داخل ہوئی' دونوں افیریائی نازنینیں دوڑ کر اسے ملیں۔

''چلو زرینہ پیاری چلیں' تھیانو ٹھہرے گی' لیکن ہم چلتی ہیں۔''

زرینہ نے جواب دیا: ''میں بھی ٹھہروں گی'' یہ کہہ کر وہ ایک عریض صوفے پر لیٹ گئی جس پر گلاب کے پھولوں کی سیج بچھی تھی۔

سکوں کی کھنک اور انسانی آوازیں اس کے کان میں آئیں تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ تھیانو نے اپنی بہن روڈس کی پیروی میں مذاق کے طور پر افسانہ پرسوس (۲) کا ناچ شروع کر دیا تھا' لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ جب کوئی سونے کا سکہ اس کی طرف پھینکا جاتا تھا' تھیانو اس طرح جھوٹ موٹ کیفیتِ وجد کی نقل اتارتی تھی کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کم عمر لڑکی کی ہوس پرور بے دینی کو دیکھ کر مہمان مسکرا رہے تھے۔ کیونکہ وہ دن لد گئے تھے کہ آسمان سے بجلی گرے اور اس غیر فانی دیوتا سے تمسخر کرنے

والوں کو فوراً جلا کر راکھ کر دے۔ لیکن بالکل فطری طور پر رنگ میں بھنگ پڑ گئی۔ کسی نے تھیانو کو اس طرح تنگ کیا کہ وہ زور زور سے رونے لگی۔

اب اس کا دل بہلانے کے لئے ایک نیا کھیل کھیلا گیا۔ دو ناچنے والیاں ایک نقرئی دیگ شراب جو لبالب بھری ہوئی تھی کھینچ کر کمرے کے وسط میں لے آئیں۔ تھیانو کو الٹا کر کے شراب پلائی جاتی تھی۔ ٹانگیں اوپر سر نیچے۔ وہ ہنسی کے مارے بے دم ہوئی جاتی تھی۔ یہ کھیل اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ سب لوگ اسی جگہ جمع ہو گئے اور جب آخر کار تھیانو کو زمین پر کھڑا کیا گیا اور اس کے چہرے پر نظریں پڑیں جو سر کی طرف خون چڑھ جانے سے تمتما رہا تھا اور جس سے شراب کے قطرے ٹپک رہے تھے تو ہر طرف سے قہقہے بلند ہوئے اور بیقس نے قمر سے کہا۔

''آئینہ لاؤ' آئینہ! ذرا تھیانو اپنی شکل تو دیکھے۔''

کنیز تانبے کا آئینہ لے کر حاضر ہوئی۔

''یہ نہیں روڈوفس والا شیشہ لاؤ' تھیانو نے اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کا حق ثابت کر دیا ہے۔''

زرینہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے رخسار سرخ ہو گئے' پھر پیلے پڑ گئے اور وہ اس طرح کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ رنگ فق' دل کی دھڑکن سے سینے میں تھرتھری' آنکھیں اس دروازے پر لگی ہوئیں جس میں سے گزر کر کنیز باہر گئی تھی۔ یہی اس کی زندگی کا فیصلہ کن لمحہ تھا۔ اب یا تو اس کی آخری امید پوری ہو گی یا حرمان میں بدل جائے گی۔

اس کے ارد گرد جلسۂ عشرت کے ہنگامے اسی طرح بپا تھے۔ کسی نامعلوم شخص نے پیل گوش کا ہار اس کی طرف پھینکا' زرینہ کے منہ پر لگ کر اس کے ہونٹوں پر زرگل کے تلخ ذائقہ کی یاد چھوڑ گیا۔ ایک اور شخص نے اس کے بالوں پر عطر کی ایک شیشی لنڈھا دی' تیزی سے بہہ کر عطر نے اس کے شانے کو تر کر دیا۔ کسی نے ساغرِ مے میں ایک انار پھینک دیا اور چھینٹیں اڑ کر اس کی عبا پر پڑیں۔ اس کا بدن بھیگ گیا۔ وہ اس ہنگامۂ عشرت کے تمام علائم مبتذل کو انتہائی صبر و جلال سے برداشت کر رہی تھی۔

اور ابھی تک کنیز واپس نہ آئی تھی۔

زرینہ پتھر کی طرح زرد رُو اور دیوی کی پتھریلی مورت کی طرح ساکت و جامد

کھڑی تھی۔ قریب ہی اضطرابِ محبت میں اسیر کسی عورت کی مترنم اور مرڈف سسکیاں گویا لمحاتِ گزراں کی تقطیع کر رہی تھیں۔ زرینہ کو اس طرح محسوس ہوتا تھا گویا یہ عورت کل رات سے اسی طرح سسکیاں بھر رہی ہے۔ اس کی بے چینی کی یہ حالت تھی کہ ہر چیز کو توڑنے کو جی چاہتا تھا' اپنی انگلیاں ہی سہی۔ چیخنا چاہتی تھی۔ آخر کار قمر واپس آئی' خالی ہاتھ!

بیقس نے پوچھا "آئینہ کیا ہوا۔"

کنیز نے رک رک کر جواب دیا" وہاں۔۔۔ تو نہیں ملا۔۔۔ شاید چوری ہو گیا۔

بیقس نے ایسی جگر گداز چیخ ماری کہ ہر ایک شخص گفتگو کرتے کرتے رک گیا۔ ہنگامۂ عشرت پر ایک خوفناک چپ مسلط ہو گئی۔ ہر طرف سے لوگ باگ دوڑ دوڑ کر اندر آنے لگے۔ بس وسط میں تھوڑی سی جگہ رہ گئی جہاں بیقس کنیز کے سامنے کھڑی تھی۔ رنگ زرد' چہرہ ستا ہوا۔۔۔ کنیز اپنی بیگم کے سامنے دوزانو ہو گئی تھی۔

بیقس چیخ چیخ کر پوچھ رہی تھی "کیا کہتی ہے تو؟ کیا کہتی ہے تو؟" اور جب قمر خاموش رہی بیقس نے اس کا گلا پکڑ لیا اور اسے جھنجھوڑ کر کہنے لگی؛ "تو نے چرایا ہے آئینہ؟ بول' بول! تو ہی تھی نا؟ منہ سے پھوٹ لمینی کتیا' کہ کوڑے مار کے تیری زبان کھلواؤں؟"

اب ایک اور ہولناک واقعہ پیش آیا۔ غریب کنیز سہم کر بے آپے ہو گئی۔ عذاب کا ڈر' موت کا ڈر جو اسے اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آتی تھی' ایسا شدید' ایسا قوی خوف اس پر کبھی کاہے کو طاری ہوا تھا۔

سہم کر اس نے تیزی سے کہا؛ "ناہید تھی ناہید۔ میں نہیں۔"

"تمہاری بہن؟"

تمام دوغلی کنیزوں نے مل کر مُصر ہو کر کہا؛ "ہاں ناہید!" اور وہ تمام مل کر ناہید کو' جس پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی' کھینچتی ہوئی فرش پر گھسیٹتی ہوئی' بیگم کے سامنے لائیں۔

حوالہ جات

(۱) پرسوس یا انڈرومیڈا؛ افسانوی ادب کی ایک شخصیت، زوس کا بیٹا، جس نے میڈوسا ڈائن کا سر کاٹ کر دنیا کو اس مہلک بلا سے نجات بخشی تھی۔ ای، ایچ بلیکنی ایم اے کی کلاسیکل ڈکشنری میں درج ہے کہ پرسوس نے شاہ حبش کی لڑکی انڈرومیڈا سے شادی کی تھی۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ ذکر اسی انڈرومیڈا کا ہو کیونکہ اس کے سانولے سلونے ہونے کا ذکر بھی موجود ہے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ پیرالوئی نے اس عورت کو ہندوستانی کس طرح کہا۔ غالباً غلط ہے۔ مجھ کو کسی کتاب میں ہندوستانی انڈرومیڈا کا ذکر دستیاب نہ ہو سکا۔

(۲) افسانہ ام پرسوس؛ پرسوس کی ماں کو اس کے والد نے ایک حجرے میں بند کر دیا تھا لیکن زوس (Zeus) دیوتاؤں کا دیوتا سونے کے ڈھیر کی شکل میں اترا اور پرسوس کی ماں اس سے حاملہ ہوئی۔ یہ وہی دیوی پرسوس ہے جس کا ذکر انڈرومیڈا کے سلسلے میں پہلے آچکا ہے۔

پانچواں باب

مصلوب

غیر کے کہنے سے مارا تو نے ہم کو بے گناہ
یہ نہ پوچھا ہم سے واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

تمام دوغلی کنیزیں مل کر شور مچانے لگیں : ''ناہید نے چرا لیا' کتیا کتیا' چور 'سؤر کی بچی۔''

ناہید کی مقبولیت کی وجہ سے وہ اس سے جلتی تو تھیں ہی اب یہ نفرت' جان کے خوف سے اور زیادہ ہو گئی۔ بہرام نے ناہید کے سینے میں ٹھوکر لگائی۔

بیقس نے پوچھا ''کہاں ہے آئینہ ؟ کہاں چھپا دیا ؟''

''اس کتیا نے اپنے کسی یار کو دے دیا۔''

''کون ہے وہ ؟''

''ایک اوپوی ملاح۔''

''اور اس کا جہاز کہاں ہے ؟''

آج اس نے لنگر کھول دیا۔ اب آپ کبھی اس شیشے کی شکل نہ دیکھ سکیں گی' اسے تو سولی دے دینی چاہیے۔ کتیا۔۔۔ حرامزادی۔''

بیقس غم کے مارے رونے لگی لیکن بہت جلد یہ کیفیتِ جنون غضب میں تبدیل ہو گئی۔ ناہید اب ہوش میں آچکی تھی لیکن خوف اور حیرت سے گویا اس پر فالج گر پڑا تھا۔ زمین پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ زبان گنگ' آنکھیں خشک۔ بیقس نے اسے بالوں سے پکڑ لیا اور غلیظ فرش کے مسلے ہوئے پھولوں اور گری ہوئی شراب کے کیچڑ پر گھسیٹتی ہوئی لے چلی' ساتھ ساتھ چیخ رہی تھی؛

''سولی سولی' صلیب' صلیب' لاؤ ہتھوڑا اور کیل۔''

سیسو نے اپنے ہم نشین سے کہا؛ ''اور کیا مزے دار بات ہے' میں نے ایسا تماشا کبھی نہ دیکھا تھا' آؤ چلیں۔''

جسے دیکھو اسی طرف بھاگا جاتا تھا۔ زرینہ بھی لوگوں میں شامل ہو گئی۔ صرف وہ جانتی تھی کہ اصلی مجرم کون ہے اور یہ کہ جرم کا اصل باعث وہ خود ہے۔

بیقس بخطِ مستقیم کنیزوں کے حجرے میں گئی۔ یہاں تین بستر بچھے تھے اور رات کا کام ختم کرنے کے بعد یہیں دو دو ہو کر کنیزیں سویا کرتی تھیں۔ دوسرے کونے میں ایک صلیب رکھی تھی ایک تہدید دائم۔۔۔ اس تلوار کی طرح جو سر پر لٹکتی رہے۔

ایک طرف تو انسانوں کی ملی جلی آوازیں بلند ہو رہی تھیں' دوسری طرف چار کنیزوں نے شہید ناہید کو اٹھا کر صلیب کے سروں کے برابر کھڑا کر دیا۔ اب تک اس کی زبان گنگ رہی تھی لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ سخت لکڑی کی سرد سطح اس کی ننگی پیٹھ کو چھو رہی تھی تو وہ کانپ کانپ کر سسکیاں بھرنے لگی اور آخر دم تک ان سسکیوں کی آواز اسی طرح آتی رہی۔

زرینہ یہ منظر دیکھ رہی تھی اور چپ تھی۔ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ دیمطر لیس کو مجرم بنائے بغیر وہ کنیز کو بری نہ کروا سکتی تھی اور خود دیمطر لیس بیقس کے دائرۂ انتقام سے باہر تھا اور زرینہ کا خیال تھا کہ اگر اس پر الزام قائم کیا گیا تو وہ اس کا سخت ظالمانہ بدلہ لے گا۔ اس کے علاوہ کنیز تو اپنی بیگم کی ملکیت تھی اور زرینہ کو یہ سوچ کر مسرت حاصل ہوتی تھی کہ اس کی دشمن بیقس اپنی مملوکہ شے کو جس کی قیمت تین ہزار درہم سے کسی طرح کم نہ تھی اس طرح برباد کر رہی ہے گویا فی الواقعہ اس نے تین ہزار درہم یونا سٹس میں ڈال دیئے۔ اور پھر کیا کسی کنیز کی اتنی اہمیت ہو سکتی ہے کہ اس کی جان بچانے کی فکر کی جائے۔

خورشید نے بیگم کو ہتھوڑا اور پہلی کیل دی اور اب عذابِ دردناک شروع ہوا۔ جب بیقس نے پہلی کیل ٹھونکی تو اس کے دل میں اس وقت مختلف کیفیات کارفرما تھیں۔ شراب کا نشہ' نفرت کی جلن' غصہ' کئی جذبات بیک وقت جمع ہو گئے۔ پھر اس کے ساتھ وہ جبلت ستم رانی بھی شامل تھی جو ہر عورت کے دل میں جاگزیں ہے۔ چنانچہ ناہید کی کھلی ہوئی ہتھیلی کے گوشت میں پہلی کیل لہراتی ہوئی گھسی ہے تو ناہید نے جو زہرہ گداز چیخ ماری' عین مَین اسی طرح کی چیخ بیقس کے حلق میں سے بھی نکلی۔ اس نے ایک پاؤں کو دوسرے کے اوپر رکھ کر کیل ٹھونک دی۔ پھر اس نے دوسرے ہاتھ میں کیل ٹھونکی پھر تینوں زخموں سے جو فوارے کی طرح خون کی دھار نکلی ہے تو اس نے بے آپے ہو کر چلا کر کہا؛

''یہی نہیں' ابھی اور لے چوٹی! ملاحوں کی یار' کتیا! ابھی اور لے۔''

اور ایک ایک کر کے اس نے اپنے بالوں میں سے لمبی لمبی پنیں نکال کر ناہید کے پیٹ' پنڈلیوں اور چھاتیوں میں زور سے بھونک دیں۔ جب اپنے سارے ہتھیار استعمال کر چکی تو ایک تھپڑ مار کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔

کچھ دیر تک وہ انتقام کی اس شکلِ تکمیل کی طرف دیکھتی رہی' پھر وہ واپس ہال میں چلی گئی اور مہمان اس کے پیچھے واپس ہو گئے۔ صرف ٹائمن اور فراسیلا اس رہ گئے۔

ایک لمحہ کے لئے فراسیلا اس فکر مند سا کھڑا رہا پھر ذرا کھانس کر بائیں ہاتھ میں دایاں ہاتھ رکھ دیا' سر اٹھایا' بھنویں تان کر مصلوب کنیز کی طرف گیا جس کے بدن میں مسلسل ایک ارتعاشِ ہولناک پیدا ہو رہا تھا۔

اس نے کہا اگرچہ میں بوجوہ نام نہاد نظریاتِ ثانیہ کے خلاف ہوں لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس وقت جب تم غیر متوقع طور پر ان حالات میں گرفتارِ بلا ہو گئی ہو' اچھا ہی ہوتا جو تم فلسفہ رواقیون کے اقوال سے ذرا بہتر طریق پر باخبر ہوتیں۔ زینو جس کا دماغ ہر معاملے میں منزہ من الخطا معلوم نہیں ہوتا ہمارے لئے اقوال حکیمانہ کا ایک ایسا ذخیرہ مہیا کر گیا ہے جن کی صداقت حالات عمومی میں تو ثابت نہیں ہوتی لیکن جن سے اس خاص مقصد کے حصول میں کہ آخری لمحات میں ذرا سکونِ قلب حاصل کر لو' تم فائدہ اٹھا سکتی تھیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ الم ایک لفظِ بے معنی ہے کیونکہ ہماری قوتِ ارادی ہمارے جسمِ فانی کے نقائص سے بالاتر ہے۔ یہ سچ ہے کہ زینو

۹۸ سال کا ہو کر مرا اور اس کے سوانح نگار تصدیق کرتے ہیں کہ دورانِ حیات میں اسے کوئی معمولی بیماری بھی لاحق نہیں ہوئی لیکن یہ بات اس کے خلاف ایک دلیل کے طور پر استعمال نہیں ہو سکتی اس حقیقت سے کہ وہ اپنی صحت کو قائم رکھ سکا تھا' ہم منطقی طور پر ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ اس کا بیمار ہونا ضعف طبیعت کا اظہار ہوتا' علاوہ ازیں یہ ناموزوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم فلسفیوں سے یہ توقع رکھیں کہ جس اصولِ زندگی کی تبلیغ کرتے ہیں اس پر عمل بھی کریں یا جن نیکیوں کو ارفع سمجھتے ہیں اُن کے حصول میں خود بھی کوشاں ہوں۔ تو پیاری ناہید! میں اس گفتگو کو خواہ مخواہ زیادہ طوالت نہیں دینا چاہتا جو شاید تمہاری زندگی سے زیادہ دیر تک قائم رہے' اس لئے ایک لفظ میں مختصراً یہ کہتا ہوں کہ اپنی روح کو جہاں تک ہو سکے اپنی جسمانی تکلیف سے بلند کر لو۔ تمہاری تکلیف کیسی ہی شدید' تمہارا اضطراب کیسا ہی المناک کیوں نہ ہو' لیکن میں تمہیں بصد ادب یقین دلاتا ہوں کہ میں بھی واقعی انہی کیفیات سے متاثر ہو رہا ہوں۔ تمہارا الم ختم ہونے والا ہے۔ صبر کرو' بھول جاؤ' حیات بعد الممات کے جو مختلف نظریے ہیں' اس وقت ان میں سے تم اپنے لئے وہ نظریہ انتخاب کر لو' کہ اپنی رحلت کے خیال سے جو افسوس تمہیں ہو رہا ہے' اس کے احساس کو بالکل مردہ کر دے۔ اگر یہ نظریے درست ہیں تو تم عذابِ ہولناک کے اس شگافِ عمیق میں ایک شعاعِ نور پیدا کر دو گی جن میں سے تم گزر رہی ہو' اور اگر یہ نظریے غلط ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں' تمہیں اپنی غلطی کبھی معلوم نہ ہو گی۔"

یہ تقریر کر کے فراسیلاس نے اپنا چوغہ سمیٹ کر کاندھے پر ڈالا اور لڑکھڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔

اب نزع کی تکلیف میں مبتلا ناہید کے پاس صرف ٹائمن رہ گیا تھا۔ اس نے اس بد نصیب مخلوق کی گود میں ایک رات بسر کی تھی اور رات کی یاد اسے کسی طرح نہ بھولتی تھی' اس یاد کے تاثرات میں یہ دردناک تصور بھی شامل تھا کہ یہ خوبصورت جسم جو کچھ عرصہ گزرا' اس کی گود میں حرارتِ محبت سے جل رہا تھا' بہت جلد بگڑ کر گھناؤنا ہو جائے گا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تھا کہ مقہور لڑکی اسے نظر نہ آئے لیکن وہ مسلسل اس کے بدن کے ارتعاش کی آواز سن رہا تھا' آخر اس نے جرأت کر کے نظر اٹھائی۔

چھاتیوں کے زخموں سے لے کر اکڑے ہوئے پاؤں تک جلد پر خون کی بڑی بڑی دھاریوں کا ایک جال سا بن گیا تھا' سر مسلسل ادھر سے ادھر حرکت کر رہا تھا۔ بائیں طرف بال لٹکے تھے' خون پسینے اور عطر میں ڈوبے ہوئے۔

اس نے کہا: "ناہید سنتی ہو' مجھے پہچانتی ہو' ٹائمن کھڑا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے ناہید کی نظر جو قریباً بے نور ہو چکی تھی ٹائمن تک پہنچی' لیکن سر اسی طرح متحرک رہا' بدن اسی طرح کانپتا رہا' ہولے ہولے' ٹائمن آگے بڑھا' گویا ڈرتا تھا کہ قدموں کی چاپ سے بھی ناہید کو تکلیف پہنچے گی اور پائے صلیب کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پھیلا کر کمزور' متحرک سر کو احتیاط سے اپنے شفقت پرور ہاتھوں میں لے لیا۔ بڑی عقیدت سے اس نے ان بالوں کو رخسار سے پرے ہٹایا جو آنسوؤں کی وجہ سے چپک گئے تھے اور بے انتہا محبت سے اس نے ناہید کے جلتے ہونٹوں کا بوسہ لیا۔

ناہید نے آنکھیں بند کر لیں۔ کیا اس نے اس شخص کو پہچان لیا تھا جس نے اس محبت آمیز شفقت سے اس کے دردناک انجام کو ذرا خوشگوار بنانے کی کوشش کی تھی؟ ایک پراسرار' ناقابل تشریح تبسم نے اس کی آنکھوں کے نیلگوں پپوٹوں کو طویل تر کر دیا' اور ایک آہ بھر کے اس نے اپنی جان' جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

چھٹا باب

جوشِ قدردانی

برقِ رخسارِ یار پھر چمکی
اس چمن کی بہار پھر چمکی

تو گویا کام بن گیا تھا' زرینہ کو ثبوت مل گیا اور اگر دیمیطر لیس نے پہلے جرم کا ارتکاب کر لیا تھا تو پھر دوسرے دونوں جرم توبے تاخیر فوراً واقع ہوئے ہوں گے۔ یقیناً دیمیطر لیس جیسا عالی رتبہ شخص قتل اور مذہبی شعائر کی غارت گری کو بھی چوری سے کم ذلیل خیال کرے گا' اس نے حکم مان لیا تھا' بس وہ اس کے دام میں اسیر ہو چکا تھا۔ بے شک یہ شخص وارستہ مزاج' سرد مہر اور بے حس تھا' لیکن اسے بھی غلام بنایا جا سکتا تھا اور اس کی بیگم زرینہ تھی' سرزمینِ ناصرت کی سارہ' آہ' اس طاقت کا تصور کرنا' اس بات کو دوہرانا۔ تنہائی' وہ تنہائی چاہتی تھی تاکہ بلند آواز سے چلا سکے۔ زرینہ اس پر شور گھر سے دوڑ کر نکل گئی اور گلیوں میں سے دوڑتی ہوئی چلی۔ نئے دن کے طلوع کے ساتھ ہی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی اور اس کے گالوں کو چھو کر ترو تازہ کر رہی تھی۔

اس شاہراہ پر چلتی ہوئی جو بندرگاہ کی طرف جاتی ہے' وہ بڑے چوک میں جا پہنچی' جس کے آخری سرے پر گندم کے دیوزاد خوشوں کی طرح آٹھ سو جہازوں کے مستول نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ دائیں طرف مڑ کر خیابانِ ڈوموز میں داخل ہوئی جہاں دیمیطر لیس کا گھر تھا۔ اپنے نئے عاشق کے مکان کی کھڑکیوں کے پاس سے گزری تو

اس کے جسم میں ایک لرزشِ غرور پیدا ہو گئی' لیکن اس نے یہ نہ کیا کہ آپ ہی پہلے دیمیطرس کو ڈھونڈ نکالے' یہ حرکت اس محاربہ محبت کے اعتبار سے مہلک طور پر غلط ہوتی جس میں وہ حصہ لے رہی تھی۔ وسیع خیابان میں سے گزرتی ہوئی وہ بابِ کنوپی تک پہنچی اور وہاں دو عود کے درختوں کے درمیان زمین پر لیٹ گئی۔

اس نے زرینہ کا کہا کیا تھا' آج تک کسی عاشق نے کسی عورت کے لئے ایسا کام نہ کیا ہو گا۔ یہی بات دہرا کر وہ تھکتی بھی نہ تھی' گویا اس تکرار سے اپنے حسن کی فاتحانہ طاقت پر مہرِ تصدیق لگانا چاہتی تھی۔ وہی دیمیطریس جو دنیا کا محبوب تھا' جو بے شمار نسوانی دلوں کے خواب ہائے محبت کی نہ حاصل ہونے والی تعبیر تھا' جس نے امیدوں کو حرمان میں تبدیل کر دیا تھا' ہاں وہی دیمیطریس' اس کے پھندے میں اس طرح پھنس گیا تھا کہ ہر خطرے میں کود پڑا تھا' کیسی کیسی بے حیائی' کیسی کیسی خود آفرین ندامت اس نے برداشت کی تھی۔ اس نے اپنے معیارِ تخیل کو بھی مردود کر دیا تھا۔ اس نے اپنی تخلیق کے گلے سے معجز آفریں ہار اتار لیا تھا اور یہ تو طلوع دن اب دیوی زہرہ کے پجاری کو ایک نئے بت کا پرستار دیکھے گا۔

وہ چلا کر کہنے لگی: "مجھے اپنی آغوش میں لے لو' مجھے اپنی آغوش میں لے لو" اب وہ اس کی پرستش کر رہی تھی' اسے بلا رہی تھی' اس کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں وہ تین جرم جن کا اس کی خاطر ارتکاب کیا گیا تھا' اب محنتِ شاقہ کے شاہکار بن چکے تھے اور وہ سوچتی تھی کہ ان کا معاوضہ کس طرح ادا ہو سکتا ہے۔ دنیا میں وہ ابدی محبت' وہ بے پناہ نفسانیت کہاں ہے کہ اس احسان کا بدل ہو سکے۔ اب ان کی محبت کے بے مثال شعلے کس کس طرح بھڑکیں گے' ان دو ہم عمر نوجوانوں کی بے نظیر محبت کیسی شدید ہو گی جو ایک دوسرے کے دامِ عشق میں گرفتار تھے اور جن کو مزاحمتوں کا صحرائے بے پایاں طے کرنے کے بعد یہ مواصلت نصیب ہوئی تھی۔

وہ کہیں چلے جائیں گے' وہ ملکہ کے اس شہر کو خیرباد کہہ دیں گے۔ ان کی کشتی پر اسرار سرزمینوں کی طرف روانہ ہونے کے لئے لنگر اٹھائے گی' سرزمینِ امارنتھیس کے لئے یا اپی ڈارس کے لئے' یا شاید پر اسرار روم کے لئے جو سکندریہ کے بعد دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا اور جو اب تمام اقوام کو مفتوح کر رہا تھا' جہاں کہیں بھی وہ جائیں' وہ کچھ کر سکیں گے۔ ان کو ہر قسم کی خوشی حاصل ہو گی' ہر انسانی سعادت کو

ان کی مسرت پر رشک آئے گا اور ان کی رفتارِ مسحور کے سامنے خوشیاں پھیکی پڑ جائیں گی۔

زرینہ کا ذہن تصورات کی تابناکیوں سے چندھیا گیا' وہ کھڑی ہوئی' بانہیں پھیلا دیں' تن کر' ایک ادائے غرور سے سیدھی کھڑی ہو گئی' آرزو کی ایک کیفیتِ سست رَونے' فزوں کار مسرت کے ایک احساس نے' اس کی مضبوط چھاتیوں کو سخت تر کر دیا۔

جب اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو ایک لمحے کے لئے حیرت میں بت بنی کھڑی رہ گئی۔ اسے تعجب تھا کہ پچھلی رات سے لے کر اب تک اس کے کمرے میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ اس کی میز پر اور الماریوں میں جو پرانی چیزیں رکھی تھیں وہ اب اسے اپنی نئی زندگی کی تصویر کا ناموزوں فریم معلوم ہوتی تھیں۔ کئی چیزیں تو اس نے توڑ ہی ڈالیں کیونکہ وہ بے واسطہ اسے پرانے بے کار عاشقوں کی یاد دلاتی تھیں اور اس لئے ناگاہ ان چیزوں کی طرف سے اس کے دل میں نفرت کا احساس پیدا ہو گیا' بعض چیزیں محفوظ رہیں' اس لئے نہیں کہ اس کو ان کی پروا تھی بلکہ اس لئے کہ اگر دیمیطر لیس یہاں شب باش ہونا چاہے تو کمرہ خالی خولی نہ معلوم ہو۔

آہستہ آہستہ اس نے لباس اتارنا شروع کیا اور بزم دوشیں کی یادگار چیزیں' کیک کے ٹکڑے' بال' گلاب کی پتیاں' اس کی قبا سے گرنے لگیں۔ جلد کے اس حصے کو جو پیٹی کے دباؤ سے آزاد کیا گیا تھا' ہموار کیا۔ پھر سر کا بوجھ کم کرنے کے لئے اس نے بال کھول دیئے۔ سونے سے پہلے اس کے دل میں یہ آیا کہ ذرا مہتابی کی سیر کا لطف اٹھائے' جہاں غالیچے بچھے ہوئے تھے اور جہاں کی ہوا میں ایک شیریں ٹھنڈک تھی۔ وہ کوٹھے پر چڑھ گئی۔

ابھی آفتاب ابھرا ہی تھا اور افق پر ایک عظیم الشان' متورم نارنج کی طرح قائم تھا۔ پاس ہی ایک بلند خمدار نخل تھا' جس کے گھنے سبز پتے شہ نشیں پر جھکے ہوئے تھے۔ ان پتوں میں زرینہ نے اپنی لرزاں عریانی کو چھپا لیا اور چھاتیاں ہاتھ میں لئے کانپنے لگی۔ اس کی آوارہ نگاہیں شہر پر پڑ رہی تھیں' جو نورِ آفتاب میں لحہ بہ لحہ سفید تر ہوتا جا رہا تھا۔ صبح کی بنفشئی دھند خاموش بازاروں میں سے اٹھ کر صاف ہوا میں غائب ہو رہی تھی۔

ناگاہ اسے ایک بات کا خیال آیا۔ یہ خیال بڑھتا بڑھتا اس کے ذہن پر چھا گیا اور

اسے دیوانہ بنا گیا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دیمیطر لیس جس نے یہ کچھ کر دیا تھا اب ملکہ کو بھی مار ڈالے اور بادشاہ بن بیٹھے اور پھر۔۔۔۔۔۔؟

عمارات کا یہ بحرِ بے پایاں' یہ محل' یہ مندر' محرابیں' یہ ستونوں کا سلسلہ جو مغربی قبرستان سے لے کر باغ ہائے زہرہ تک اس کی آنکھوں کے سامنے تیر رہا تھا' یہ براشیاں' یونانیوں کا درخشاں اور احتیاط پروردہ شہر' یہ ریکاٹس مصری شہر' جس کے سامنے درخشاں پنیان کوہ کی طرح کھڑا تھا' سیر آپس کا یہ عظیم الشان مندر' جس کے گلابی رنگ کے اہرام نما ستون سرور کے سامنے' سینگوں کی طرح معلوم ہوتے تھے ۔۔۔۔۔۔ یہ زہرہ کا عالی رتبہ مندر جس کی فضا تین لاکھ نخل ہائے بلند کے پتوں کی سرسراہٹ اور انبوہ در انبوہ لہروں کے شور سے لبریز ہے' یہ پرسیفوں کا مندر اور یہ آرسینو کی ہیکل' یہ پوسیڈان کی دو خانقاہیں' یہ فیرس کے تین مینار' لوکیاس کے سات ستون' تھیٹر' ہپودروم (جانوروں کی تماشاگاہ) یہ بازی گاہ' جہاں پیسٹاکوس نے نکوسیتھنز کا مقابلہ کیا تھا' سٹراٹونیس کا مقبرہ' سکندر کا مزار' سکندریہ؟۔۔۔ سکندریہ ام نسلِ انسانی' سنگِ مرمر کا مینارِ نور' جس کا پتھر جہاز رانوں کی جانیں بچاتا تھا' سکندریہ' ملکہ بیر نیس کا وطن اور گیارہ فرعونوں کا شہر' فسکون' فلومیٹر' پی فنیز فلاڈلفس کا مسکن' سکندریہ' تمام خوابوں کی تعبیر' تین ہزار برسوں میں جو فتوحات ممفس' ایتھنز' تھیبیہ' کارنتھ میں حاصل ہوئی ہیں' تیشے سے ہوں یا نئے سے' قطب نما سے ہوں یا تلوار سے۔۔۔ ان تمام فتوحات کا ماحصل سکندریہ! وہ دور افتادہ ڈیلٹا' جس میں دریائے نیل کی سات زبانوں نے شگاف کئے ہیں' سائیس' بوٹاسٹس' ہیلی پولس اور پھر دوسری طرف' جنوب کی جانب' زرخیز زمین کا وہ ٹکڑا ایپٹانوموس کے بارہ ہزار مندر' جو دریا کے دونوں طرف واقع ہیں اور جو تمام خداؤں کے نام سے منسوب ہیں اور اس سے دور' تھیبالیس' ڈیاسی پاس' جزیرہ الفانٹس' وہ ناقابلِ عبور آبشار' جزیرہ آرگو' جزیرہ میرو' وہ سرزمینِ نامعلوم اور اگر پرانی مصری حکایات سچی ہیں تو وہ افسانوی جھیلیں جو کہنہ سال نیل کا منبع ہیں' اس قدر وسیع و عریض کہ جب ان کے ارغوانی پانیوں پر سفر کیا جائے تو افق گم ہو جاتا ہے اور پہاڑ اتنے بلند کہ نزدیک کے ستارے ان میں سنہرے پھلوں کی طرح منعکس ہوتے ہیں۔۔۔ پھر یہ تمام چیزیں زرینہ' کسبی کی دولت' اس کی سلطنت' اس کی ملکیت ہوں گی۔

اس کا دم گھٹنے لگا' اس نے اپنی بانہیں بلند کیں گویا آسمان کو چھو لے گی اور عین

اس وقت اس نے دیکھا کہ بائیں طرف ایک بڑا پرندہ کالے پروں والا آہستہ آہستہ سمندر کی طرف اڑا جارہا تھا۔

ساتواں باب

قلوپطرہ

زباں پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

ملکہ بیرینس کی ایک چھوٹی بہن تھی جس کا نام قلوپطرہ تھا۔ یہی نام اس سے قبل بھی بہت سی مصری شہزادیوں کا تھا لیکن یہ وہی لڑکی تھی جو بعد میں زبان زدِ خاص و عام ہوئی' اور جس کی قسمت میں خود اپنی سلطنت کو ملیامیٹ کر دینا اور گویا اپنی مردہ حکومت کی لاش پر بیٹھ کر خودکشی کرنا لکھا تھا۔ اس وقت وہ بارہ سال کی تھی اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس کے حسن کا رنگ کیسا نکھرے گا۔ بلند وبالا' نازک اندام' وہ اس خاندان کی رکن معلوم نہ ہوتی تھی جس کی تمام عورتیں موٹی تازی تھیں۔ اس کی جوانی اس مخلوط النسل پیوندی پھل کی طرح رسیلی ہوتی جارہی تھی' جس کی اصل مجہول ہو' اور جس کی قلم کسی غیر معروف دور افتادہ مقام سے لائی گئی ہو' اور پیوند لگانے میں نقص رہ گیا ہو' اس کے چہرے کے کچھ نقوش تیکھے اور کھڑے کھڑے تھے' جس طرح مقدونیہ کے لوگوں کے ہوتے ہیں' لیکن کچھ نیوبیا کے اندرونی شہروں کا ورثہ معلوم ہوتے تھے جہاں کی عورتوں کا رنگ سانولا سلونا اور چہرہ بھولا بھالا ہوتا ہے۔ اس کی ماں ادنیٰ نسل کی تھی' اس کی ولدیت بھی مشکوک تھی۔ قلوپطرہ کے موٹے موٹے قریباً حبشیوں جیسے ہونٹ اور اس کی نفیس و نازک ستواں ناک دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ اس کی

چھاتیاں نوبہار' گول' چھوٹی چھوٹی اور ایک دوسرے سے کافی دور تھیں اور ان کے ارد گرد جو ابھرا ہوا دائرہ ذرتھا وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ وادیٔ نیل کی دوشیزہ ہے۔

یہ کم عمر شاہزادی ایک وسیع محل میں رہتی تھی جس کا ایک حصہ عظیم الشان سمندر کی طرف کھلتا تھا' یہ عمارت ایک دالان کے ذریعے جو بڑے بڑے ستونوں پر قائم تھا' ملکہ کے محلات سے ملحق تھی۔ قلوپطرہ کا قاعدہ تھا کہ رات سبز ریشم کے بستر پر بسر کرتی' جس کے رنگ کے اثر سے اس کے سانولے بدن کا رنگ اور سنولایا نظر آتا۔

ایسا ہوا کہ 'اس رات جب متذکرہ واقعات پیش آرہے تھے اور جن سے وہ بے خبر تھی' قطوپطرہ بہت سویرے اٹھی۔ کچھ دن ہوتے ہیں 'اس نے اپنی بلوغت کو محسوس کیا تھا اور اس احساس سے ایک خلفشار سا پیدا ہو گیا تھا' جس نے اس رات قطوپطرہ کو اچھی طرح جی بھر کے سونے نہ دیا۔ کچھ یہ اور کچھ گرمی بھی زیادہ تھی۔

آہستہ سے پلنگ سے اتری' محافظ عورت کو بھی نہیں جگایا جو سونے میں اس کی پاسبانی کیا کرتی تھی' سونے کے چھڑے پہن لیے' سانولی سانولی کمر کے گرد بڑے بڑے موتیوں کی مالا لپیٹ لی' اور بس اسی لباس میں ملبوس حجرے سے نکلی۔ بلند دالان میں مسلح سپاہی محوِ خواب تھے' ہاں ایک ملکہ کے دروازے کے آگے چوکنا کھڑا تھا۔ وہ دوزانو ہو گیا اور سہم کر لرزتی ہوئی آواز میں' گویا اس نے آج تک اپنے آپ کو فرض اور خطرے کی اس کشمکش میں مبتلا نہ پایا تھا' کہنے لگا: "ملکۂ عالم' عفو کا خواستگار ہوں' لیکن آپ کو اندر جانے کی اجازت دینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

کم عمر شہزادی تن کر کھڑی ہو گئی' غصے میں تیوریاں چڑھ گئیں اور مٹھی بھینچ کر سپاہی کے منہ پر ایک مکہ مارا۔ پھر اس نے غضبناک لیکن دبی آواز میں کہا: "ابھی شور مچاتی ہوں کہ تو نے مجھ پر ہاتھ ڈالا' اور دیکھ تجھے کس طرح عذاب دیا جاتا ہے۔"

پھر چپ چاپ نہ ملکہ کے کمرے میں داخل ہوئی؛

بیرینیس بازو پر سر رکھے محوِ خواب تھی' ہاتھ ڈھیلا ڈھالا لٹک رہا تھا' عظیم الشان ارغوانی بستر پر ایک فانوس آویزاں تھا' اس کی ہلکی ہلکی روشنی چاند کے نور میں جذب ہو گئی تھی' جو سفید دیواروں پر پَرتو فگن تھا۔ ان دو متخالف روشنیوں کے درمیان خوابیدہ ملکہ کی خمدار عریانی کے مبہم لیکن درخشاں خطوط دھندلے سایوں میں ملفوف نظر آتے تھے۔

قلوپطرہ اپنے نازک جسم کو تان کر بستر کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں نازک نازک ہاتھوں میں بہن کا چہرہ لے کر، چھو کر اور بول کر اسے جگادیا۔

اس نے پوچھا؛ "آج تمہارا عاشق کیا ہوا؟"

بیرینس نے چونک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔

"قلوپطرہ تو یہاں کیوں آئی؟ کیا بات ہے؟"

کم عمر لڑکی نے مُصر ہو کر پوچھا؛ "تمہارا عاشق کیا ہوا؟ تمہارے پاس کیوں نہیں ہے؟"

"کیا وہ میرے پاس نہیں ہے؟"

"بے شک تم خوب جانتی ہو کہ نہیں ہے۔"

"سچ ہے، اب تو وہ میرے پاس آتا ہی نہیں، تو بھی کیسی ظالم ہے کہ اب چرکا لگانے کے لئے مجھے جگادیا۔"

"لیکن وہ آتا کیوں نہیں؟"

بیرینس نے آہ بھر کر کہا؛ "جب اس کا جی چاہتا ہے آجاتا ہے، دیکھ لیتی ہوں، مل لیتی ہوں، دن کے وقت کبھی ایک دو منٹ کے لئے آتا ہے۔"

"کل اس سے ملاقات ہوئی تھی؟"

"ہاں سڑک پر ملی تھی، میں محمل میں تھی، وہ بھی اندر آیا تھا۔"

"محل تک تمہارے ساتھ آیا تھا؟"

"نہیں، ذرا پرے ہی اتر گیا تھا، شاید دروازوں تک جتنا فاصلہ ہے، اتنا فاصلہ ہوگا۔"

"تم نے اسے کیا کہا تھا؟"

"مجھے بڑا غصہ تھا، میں نے خوب جلی کٹی سنائیں، سچ مچ پیاری قلوپطرہ، خوب کھری کھری سنائیں۔"

قلوپطرہ نے طنز سے کہا؛ "سچ!"

"شاید میری باتیں سن کر وہ ڈر گیا، چپ لگ گئی اسے، جب میں غصے میں بے آپے ہو گئی تو اس نے میرے فائدے کے لیے ایک لمبی چوڑی نگوڑی کہانی شروع کر دی، میری سمجھ میں تو اس کہانی کا سر پیر آیا نہیں، کچھ نہ سوجھا کہ کیا کہوں، میں سوچ ہی

رہی تھی کہ اسے اپنے پاس کس طرح ٹھہرائے رکھوں کہ وہ محمل سے نکل گیا۔"

"تم نے اسے واپس کیوں نہ بلایا۔"

"میں ڈرتی تھی، کہیں بگڑ نہ جائے۔"

قلوپطرہ لال پیلی ہو گئی، اور بہن کو شانوں سے پکڑ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی: "تم ڈرتی تھیں! ملکہ، اپنی رعایا کی دیوی! آدھی دنیا کی مالک، نیل اور سارے سمندر، جس چیز پر رومیوں کی حکومت نہیں وہ تمہاری ہی تو ہے، آسمانوں پر بھی تمہاری حکومت ہے، تم سے زیادہ کوئی دیوتاؤں کا پیارا نہیں ہے، اور اس کے باوجود تم اس ایک آدمی پر حکومت نہیں کر سکتیں جس سے تم کو عشق ہے۔"

بیرینس نے سر جھکا کر کہا: "حکومت، حکومت! منہ سے کہنا آسان ہے، کر کے دکھانا مشکل ہے، محبت میں حکومت نہیں رہتی، معشوق کوئی بد نصیب غلام نہیں ہوتا۔"

"ذرا یہ تو فرمائیے، کیوں؟"

"کیوں کہ ------ تیری سمجھ میں یہ بات نہ آئے گی ------ جب دل کسی سے پیار کرنے لگتا ہے تو اس کی خوشی پر اپنی ذاتی خوشیاں قربان کرنے کو جی چاہتا ہے، اگر میں کسی طرح دیمیطریس کو خوش کر سکوں تو میں اس بات پر بھی راضی ہوں کہ اکیلی بیٹھی رویا کروں کیونکہ اس سے دور رہ کر مجھے یہی بات خوش کر سکتی ہے کہ وہ خوش ہے، اس کی خاطر کوئی کام کرنے سے مجھے خود خوشی ہوتی ہے۔"

قلوپطرہ نے کہا: "تب تمہیں پتہ ہی نہیں کہ عشق کس طرح کرتے ہیں۔"

بیرینس کے لبوں پر ایک غمناک سا تبسم نمودار ہوا، اس نے بانہیں پھیلا کر، سینہ ابھار کر، جسم کو کمان کی طرح خم دے کر انگڑائی لی۔

پھر آہ بھر کر کہا: "خود سر ننھی! تو ابھی کنواری ہے، جب تو پہلی بار عاشق کی گود میں غش کرے گی تو تجھے خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ جو شخص تجھے یہ چیز دے سکتا ہے تو اس پر حکومت نہیں کر سکتی!"

"عورت چاہے تو ہمیشہ حکومت کر سکتی ہے۔"

"لیکن اس میں ایسا چاہنے کی قوت نہیں رہتی۔"

"مجھ میں یہ قوت رہے گی، تم نے کیوں اس قوت کو کھو دیا، تم تو مجھ سے بڑی

ہو۔"

ملکہ نے مسکرا کر کہا؛ "ننھی تو کس پر حکومت چلاتی ہے، کسی گڑیا پر؟"

قلوپطرہ نے کہا؛ "اپنے عاشق پر۔"

اور اس سے پہلے کہ ملکہ اپنی حیرت کا اظہار کر سکے اس نے تیزی سے بڑھتی ہوئی بلاغت سے کہنا شروع کیا؛ "ہاں میرا بھی ایک عاشق ہے، ہاں ہے! جسے دیکھو! اس کا ایک عاشق ہے، تمہارا بھی ہے، اماں کا بھی ہے، خالہ کا بھی ہے، مصر کی ذلیل سے ذلیل عورت کا بھی ہے، میرا کیوں نہ ہو عاشق؟ ہاں میرا بھی ایک عاشق ہے اور کیوں نہ ہو، چھ مہینے ہوتے ہیں میں عورت بن چکی ہوں، اور ابھی تک تم نے میرے لیے شوہر بھی نہیں ڈھونڈا، اب میں کوئی ننھی تھوڑے ہی ہوں۔ میں اب سب کچھ جانتی ہوں، سب کچھ! بس اب چپ رہو! میں تم سے زیادہ جانتی ہوں، میں اس آدمی کی ننگی کمر میں باہیں ڈال چکی ہوں جو اپنے آپ کو میرا آقا تصور کرتا تھا، اس نے میری بانہوں کو اس طرح دبایا تھا کہ مجھے ڈر تھا، ٹوٹ جائیں گی۔ میں بھی تمہاری طرح خلا میں پاؤں کی انگلیوں کا تناؤ محسوس کر چکی ہوں۔ گویا میرے جسم سے جان نکلی جاتی ہو۔ میں بھی تمہاری طرح، سینکڑوں بار مر چکی ہوں، لیکن بیرینس! اس کے بعد فوراً ہی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاتی تھی۔ میرے حواس قائم رہتے تھے، مجھ سے نہ بولو، تمہیں اپنی ملکہ کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، تم تو ایک مرد کی کنیز ہو۔"

ننھی قلوپطرہ تن کر سیدھی کھڑی ہو گئی تاکہ جوان عورت کی طرح بلند بالا معلوم ہو، اس نے اپنے ہاتھ بلند کیے، گویا کوئی ایشیائی ملکہ تاج پہن رہی ہے۔

بڑی بہن بستر پر بیٹھی سن رہی تھی اور دیکھ رہی تھی، پھر اس نے آگے جھک کر قلوپطرہ کے قریب پہنچ کر اس کے خم دار نازک شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا؛ "تیرا بھی ایک عاشق ہے؟"

ملکہ کی آواز دھیمی تھی، گویا قلوپطرہ کی تعظیم کرنے پر مجبور ہوئی ہے۔

لڑکی نے خشک سے انداز میں کہا؛ "تمہیں یقین نہ ہو تو چلو دکھا دوں۔"

بیرینس نے کہا؛ "کس وقت ملتی ہے تو اس سے؟"

"دن میں تین بار۔"

"کہاں؟"

"بتاؤں ؟"

"ہاں"

"اس کی کیا وجہ ہے کہ تمہیں آج تک میری ملاقاتوں کی خبر نہیں ہوئی۔"

"مجھے تو کسی بات کی خبر نہیں ہوتی، محل میں جو کچھ ہوتا ہے، مجھ سے تو وہ بھی پوشیدہ رہتا ہے۔ بس میں تو دیمطر لیس ہی کی باتیں سننا چاہتی ہوں اور اسی کی باتیں کرنا چاہتی ہوں، مجھے تمہارا خیال رکھنا چاہئے تھا، یہ سب میرا قصور ہے۔"

"تمہارا جی چاہے تو اب میرا خیال رکھ کے دیکھ لو، جب میری من مانی باتیں پوری نہ ہو سکیں گی تو میں خود کشی کر لوں گی، مجھے کچھ پروا نہیں۔"

بیرینس نے گردن ہلا کر کہا؛ "نہیں نہیں، جو تیرا جی چاہے کر ننھی! اور اب ہو بھی کیا سکتا ہے لیکن یہ تو بتا ننھی! تیرا جو عاشق ہے، تو اس پر حکومت کس طرح کرتی ہے ؟"

"میں جانتی ہوں طریقہ حکومت کرنے کا۔"

"اور یہ طریقہ سیکھا کس سے تو نے ؟"

"خود بخود، یہ ایسی چیز ہے کہ بس خود بخود ہی آجاتی ہے، یا پھر آتی ہی نہیں، جب میں چھ سال کی تھی تو مجھے پتہ لگ گیا تھا کہ میں جوان ہو کر اپنے عاشق کو کس طرح قابو میں رکھوں گی۔"

"مجھے نہیں بتاتی یہ طریقہ ؟"

"آؤ میرے ساتھ۔"

بیرینس آہستہ سے اٹھی، قبا پہنی، اور اوپر ایک ردا لپیٹ لی، گھنے بال تکیے کی رطوبت سے ایک دوسرے کے ساتھ چپک گئے تھے، انہیں جھٹکا، اور دونوں بہنیں کمرے سے نکلیں، قطو پطرہ آگے تھی، دالان سے گزر کر سیدھی اپنے کمرے میں پہنچی، تازہ خشک گھاس کی توشک کے نیچے سے اس نے ایک نئی بنی ہوئی کنجی نکالی، پھر کہا؛ "آؤ ذرا دور ہے۔"

وسط راہ میں ایک جگہ سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں، ان پر چڑھ کر، ایک بے نہایت سلسلہ اساطین کے پاس سے گزرتی ہوئی، کئی دروازے کھول کر، غالیچوں پر سے گزر کر، سنگ مرمر کی سفید سیڑھیاں اتریں اور بڑی آواز سے بند ہونے والے دروازوں

کی دہلیز پر پہنچیں ۔اب انہیں کچھ سپاہی نظر آئے جو دو دو ہو کر چٹائیوں پر بیٹھے تھے۔ نیزے پہلوؤں سے پیوستہ۔ دیر کے بعد وہ ایک صحن میں پہنچیں جسے نور مہتاب منور کر رہا تھا۔ ایک نخل بلند کا سایہ قلوپطرہ کے کولہوں پر پڑا۔ بیرینس پیچھے پیچھے ایک نیلگوں ردا میں لپٹی چلی آرہی تھی۔ آخر انہیں ایک مضبوط دروازہ نظر آیا، جس کے پٹ جنگجو سپاہیوں کے سینہ ہند کی طرح آہن پوش تھے، قلوپطرہ نے قفل میں کنجی ڈال کر دوبار پھرائی۔ اس نے دروازہ کھولا اور زندان کی تاریک فضا میں ایک دیو ہیکل مرد اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

بیرینس نے گوناگوں کیفیات سے متأثر ہو کر جھانک کر دیکھا اور سر جھکا کر کہا؛ ''ننھی! تجھے پتہ نہیں، عشق کس طرح کرتے ہیں، کم از کم ابھی نہیں، میں نے تجھے سچ کہا تھا۔''

لڑکی نے کہا؛ ''عشق ایسا کیا اور ویسا کیا، مجھے اسی قسم کا عشق پسند ہے، کم از کم اس کے عشق میں مجھے سکھ ہی ملا، دکھ کبھی نہ ملا۔''

قلوپطرہ زندان کی دہلیز پر تن کر کھڑی ہو گئی اور وہیں سے کھڑے کھڑے سایوں کی طرح ساکن اس مرد کو بلایا۔

''ادھر آ کتے کے بچے، میرے پاؤں چوم۔''

جب وہ پاؤں چوم چکا تو قلوپطرہ نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

حصہ چہارم

پہلا باب

دیمیطر لیس کا خواب

جمنا میں جب نہا کے کل جس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے
بندہ ہوں میں تو اس کی آنکھوں کی ساحری کا
تارِ نظر سے جس نے صاحبِ کمال باندھا

اس اثنا میں دیمیطر لیس شیشہ، کنگھی اور ہار لیے گھر چلا گیا اور رات کو اس نے ایک خواب دیکھا، کیا دیکھتا ہے کہ جہنت سے آدمیوں کے ساتھ وہ خود ساحلی مہتابی کی طرف جا رہا ہے، رات حیرت انگیز تھی، نہ چاند تھا نہ تارے، نہ بادل، لیکن یہ رات اپنی ہی روشنی سے منور تھی۔

اسے معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ کیوں کھنچا جا رہا ہے، کیا چیز اسے کھینچے لیے جا رہی ہے، بس اتنا جانتا تھا کہ وہاں جلدی پہنچنا چاہتا ہے، جہاں تک ہو سکے جلد از جلد۔ لیکن چلنا دوبھر ہو رہا تھا، ہوا اس کے پاؤں کو ناقابلِ تشریح طور پر روک رہی تھی، گویا گہرے پانی میں چل رہا تھا۔ ڈرتا تھا کہ شاید منزلِ مقصود تک پہنچ نہ سکوں، شاید معلوم ہی نہ کر سکوں کہ اس روشن ابہام میں اتنی تکلیف میں کسے ملنے جا رہا ہوں۔

گاہ گاہ آدمیوں کا ہجوم غائب ہو جاتا تھا، یعنی یا تو گم ہو جاتا تھا یا اس کی موجودگی کا شعور نہ ہوتا تھا، پھر ہجوم کے لوگ پہلے سے زیادہ گستاخانہ طور پر اسے دھکے دیتے اور

آگے بڑھتے جاتے' آگے ہی آگے' تیز پُر شور قدموں سے اتنی جلدی حرکت کرتے کہ وہ ان کے ساتھ نہ چل سکتا۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ وہ چاروں طرف سے گھر گیا اور سہم گیا۔ کسی شخص کا کھوا اس کے کھوے سے چھل گیا' کسی عورت کا بند اس کی قبا میں الجھ گیا اور قبا پھٹ گئی' ریلے میں ایک لڑکی اس پر آگری' جو اتنی قریب تھی کہ اس نے اپنے سینے پر اس کی بھنٹیوں کا لمس محسوس کیا۔ اس لڑکی نے سہم کر ہاتھوں سے دیمیطر لیس کا منہ پرے ہٹا دیا۔ ناگاہ وہ مہتابی پر تنہا رہ گیا' لوگ اس سے کہیں آگے نکل گئے۔ دور چوک کے پاس ہجوم ایک انبوہِ سفید کی مثل معلوم ہوتا تھا' اس وقت اسے معلوم ہو گیا کہ اب لوگ آگے نہ بڑھیں گے۔

سکندریہ کی ساحلی مہتابی سامنے تھی' سفید اور سیدھی' گویا اس نامکمل شاہراہ کا پہلا حصہ تھی جو سمندر کو طے کرنے کے لیے بنائی گئی ہو۔ وہ چلا جاتا تھا' منارِ نور تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب اس کے پاؤں ناگاہ بہت ہلکے ہو گئے تھے' راہگزار سے آنے والی ہوائیں اسے زور سے دھکیلتی ہوئیں سمندر کی ان خلوت گاہوں کی طرف لے جا رہی تھیں جن پر مہتابی کا کچھ حصہ معلق تھا۔ لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتا تھا' مینار پیچھے ہٹتا جاتا تھا اور مہتابی کی لمبائی بے نہایت ہوتی جاتی تھی۔ اب وہ بلند مینارِ مرمری جہاں ایک ارغوانی شعلہ بھڑک رہا تھا' نیلگوں افق کے قریب پہنچ گیا' کانپا اور نیچا ہوا' جسامت میں کم ہوا' اور پھر ایک چاند کی طرح غروب ہو گیا۔

لیکن دیمیطر لیس چلتا گیا' ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سکندریہ کا وسیع ساحل چھوڑے کئی دن گزر گئے اور اسے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی' ڈرتا تھا کہ بس وہی سڑک نظر آئے گی جسے طے کرتا آرہا تھا۔۔۔۔۔ ایک سفید لکیر جو ازلیت اور سمندر کی طرف گامزن تھی۔ اس کے باوجود اس نے مڑ کر دیکھا۔

اس کی پشت پر ایک جزیرہ تھا جہاں اونچے اونچے درخت لہلہا رہے تھے اور بڑے بڑے پھول مہک رہے تھے۔ شاید وہ اندھا دھند اس جزیرے کو طے کر چکا تھا یا ابھی یہ قطعہ زمین سمندر سے ابھر کر حیرت انگیز طور پر مرئی ہو گیا تھا۔ اس نے حیران ہونے کا خیال بھی نہ کیا۔ ناممکنات کو وہ اب مظاہر فطری سمجھ کر قبول کر لیتا تھا۔ جزیرے پر ایک عورت تھی' وہ جزیرے پر جو ایک ہی مکان تھا اس کے دروازے پر کھڑی تھی' آنکھیں نیم وا' چہرہ پیل گوش کے ایک دیو قامت پھول کی پتیوں میں

پوشیدہ جو اس کے لبوں تک بلند تھا' اس کے بال گھنے تھے' ان کا رنگ میلے سونے کا تھا' اور اس کی خمیدہ گردن پر جو گھنے لچھے پڑے تھے انہیں دیکھ کر وہ دیکھ سکتا تھا کہ بال اتنے لمبے ہوں گے کہ یقین نہ آئے۔ یہ عورت ایک کالی قبا پہنے تھی' اور اس پر ایک کالی ردا لپیٹے تھی اور وہ پیل گوش کا پھول جس پر یہ عورت پلکیں جھکائے سانس لے رہی تھی' رات کی طرح سیاہ تھا۔ اس تمام ماتمی لباس میں دیمیطر لیس کو صرف اس کے بال نظر آئے جو ایک آبنوسی ستون کے تاج طلائی تھے۔ اس نے زرینہ کو پہچان لیا۔ کچھ یوں ہی سا اسے شیشہ' کنگھی' ہار کا خیال آیا' لیکن اسے ان چیزوں کے وجود پر اعتبار نہ تھا' کیونکہ اس حیرت انگیز خواب میں صرف حقیقت کا وجود باطل معلوم ہوتا تھا۔

زرینہ نے کہا: "آؤ! میرے ساتھ آؤ۔"

وہ ساتھ ہو لیا' وہ ہولے ہولے سیڑھیاں چڑھی جن پر سفید کھالیں بچھی تھیں' اس کا بازو زینے پر تھا' اس کے ننگے پاؤں دامن قبا سے باہر آتے اور اندر جاتے دکھائی دیتے تھے۔ مکان کی ایک ہی چھت تھی' زرینہ آخری سیڑھی پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے کہا: "یہاں چار حجرے ہیں' جب تم چاروں دیکھ چکو گے تو یہیں کے ہو جاؤ گے' چلو میرے ساتھ' میرا اعتبار کرو گے؟"

وہ اس کے ساتھ ہر جگہ جانے کے لیے تیار تھا۔ زرینہ نے پہلا دروازہ کھولا اور پھر گزر کر بند کر دیا۔ پہلا حجرہ لمبا اور تنگ تھا۔ اس میں صرف ایک نور آور کھڑکی تھی' جو گویا تصویر بحر کا چوکھٹا تھی' دائیں بائیں دو چھوٹی چھوٹی میزوں پر مسودات رکھے تھے۔

زرینہ نے کہا: "یہ وہی کتابیں ہیں جو تمہیں پیاری ہیں اور کوئی کتاب یہاں ہے ہی نہیں۔"

دیمیطر لیس نے کتابوں کو کھول کر دیکھا۔ شریمان تصنیف اونوس تھی' الکسس کی کتاب ریٹرن تھی۔ ارسٹی پوس کی تالیف مرمراف لائیس تھی' تھاکریٹز کی کتابیں' انچانٹرس' سائیک لوپس' سکوبس تھیں' ایدی پس ایٹ کلونوس تھی اور سیفو کی غزلیات بھی موجود تھیں۔

زرینہ نے ایک سنہرے ظرف سے ایک مسودہ نکال کر کہا: "یہ دیکھو پرانی شاعری کا وہ صفحہ ہے جسے تم روئے بغیر نہ پڑھ سکتے تھے۔۔۔"

وہ رک گیا' پیار کی نظروں سے دیکھ کر تعجب سے بولا؛ ''تم' تم مجھے یہ چیزیں دکھا رہی ہو۔''

''تم نے ابھی دیکھا کیا ہے' آؤ میرے ساتھ' جلدی کرو۔''

انہوں نے ایک اور دروازہ کھولا' دوسرا حجرہ مربع تھا' اس میں ایک نور آور کھڑکی تھی جو یکسر فطرت کا چوکھٹا تھی' وسط میں ایک چوبی تپائی پر سرخ مٹی کا ڈھیر پڑا تھا' اور ایک کونے میں ایک خمدار کرسی پر ایک لڑکی عریاں و خاموش بیٹھی تھی۔

''یہاں بیٹھ کر تم انڈرومیڈا' زاگریس اور چار توسن آفتاب طالع کے مجسمے بنانا' بس اپنے لیے بنانا اور پھر مرنے سے پہلے توڑ دینا۔''

دیمیطریس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں کہا؛ ''یہ دارِ مسرت ہے۔''

لیکن زرینہ نے ایک اور دروازہ کھولا۔

تیسرا حجرہ وسیع اور مدوّر تھا' اس میں ایک نور آور کھڑکی تھی' جو تمام نیلگوں آسمان کا چوکھٹا تھی۔ اس کی برنجی دیواریں مشبک تھیں' آڑی ترچھی پٹیاں اس طرح بنائی تھیں کہ ہیروں کے ترشے پہلوؤں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ ان میں سے نغمے جاری تھے' گویا ان دیکھے مطرب دھیمی سروں میں نائے دنے بجا رہے تھے۔ سامنے دیوار سے لگی ایک کمسن عریاں نازنین خاموش بیٹھی تھی۔ زرینہ نے دوہرا کر کہا؛ ''آؤ' آؤ''

انہوں نے ایک اور دروازہ کھولا۔ چوتھا حجرہ تاریک' چاروں طرف سے بند اور مثلث نما تھا' اس کی چھت نیچی تھی' فرش سے سقف تک انتہائے تنعم کی شان میں غالیچے اور سمور اس طرح بکھرے پڑے تھے کہ یہاں عریانی باعثِ حیرت نہ ہو سکتی تھی' اور محبت کرنے والے جوڑے آسانی سے خیال کر سکتے تھے کہ انہوں نے اپنے کپڑے اتار کر چاروں طرف پھینک دیئے ہیں۔ اس کمرے میں ایک بھی کھڑکی نہ تھی' یہاں دنیا سے باہر ایک اور ننھی سی دنیا آباد تھی۔ کچھ چپکے ہوئے کالے بالوں سے عطر کے اشک مثال قطرے گر کر فضا کو مشکبو کر رہے تھے۔ حجرہ مرکی کے چھوٹے چھوٹے شیشہ ہائے منظری سے روشن تھا جو زیرِ زمین چراغوں کے ناقابلِ تشریح نور کو سات مختلف رنگ بخش رہے تھے۔

کمسن نازنین نے متین لیکن پیار بھرے لہجے میں کہا؛ ''دیکھا ہمارے حجرے کے تینوں کونوں میں تین بستر ہیں۔''

دیمیطر لیس خاموش رہا' وہ سوچ رہا تھا "کیا یہی انجام ہے ؟ کیا انسانی زندگی کا یہی مقصد ہے ؟ کیا مختلف حجروں کی سیر میں نے اسی لیے کی ہے کہ اس حجرے تک آن پہنچوں اور کیا ایسا ہو سکے گا' ایسا ممکن ہو سکے گا کہ ایک بار اس کمرے میں ساری رات گزار کر محبت کی وضع میں لیٹ کر (جو خود خوابِ لحد کا تتمہ ہے) میں پھر باہر نکل جاؤں ؟"

لیکن زرینہ کہہ رہی تھی : "پیارے تم نے مجھے بلایا تھا' لو میں آگئی' مجھے جی بھر کے دیکھ لو۔"

اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے' سر پر رکھ لئے' اس کی باہر نکلی ہوئی کہنیوں میں سے اس کا متبسم چہرہ نظر آرہا تھا۔ "پیارے میں تمہاری ہوں' لیکن ابھی نہیں' میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں گانا سناؤں گی' پہلے گانا سنو۔"

اس وقت صرف یہ عورت اس کے دل میں سمائی تھی' وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ وہ چھوٹی کالی چپلیاں پہنے تھی۔ اس کے انگوٹھوں کے درمیان نیلے نیلے موتیوں کی چار لڑیاں بندھی تھیں اور ناخنوں پر شب خار سے ہلال کی تصویر کھنچی تھی' سر ایک طرف کئے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر تال دے کر اور ذرا جھوم کر اس نے یہ گیت گایا۔

"اپنے پلنگ پر رات کو میں نے اسے ڈھونڈا جسے میرا جی چاہتا ہے' میں نے اسے ڈھونڈا' پر وہ مجھے نہ ملا' اے یروشلم کی بیٹیو' میں تمہیں قسم دیتی ہوں کہ اگر تمہیں میرا محبوب مل جائے تو تم اسے کہیو کہ میں عشق کی بیمار ہوں۔"

"آہ! دیمیطر لیس! یہ غزل الغزلات (۱) ہے' میرے وطن کی لڑکیوں کی بیاہ کی رات کا یہی گیت ہے' میں سوتی ہوں پر میرا دل جاگتا ہے' میرے محبوب کی آواز ہے' جو کہ دروازہ پر کھٹکھٹاتا ہے' وہ میرے محبوب کی آواز ہے' دیکھ وہ پہاڑوں پر سے کودتے اور ٹیلے پر سے پھاندتے ہوئے آتا ہے' میرا محبوب آہو (جوان ہرن) کی مانند ہے۔"

"میرا محبوب بولتا ہے اور مجھے کہتا ہے' میری بوا' میری جانی' میرا سر اوس سے تر ہے' اور میری زلفیں رات کی بوندوں سے بھری ہیں' اٹھ اے میری پیاری' اے میری نازنین چلی آ' کیونکہ جاڑا گزر گیا' اس موسم کا بھاری مینہ برس چکا اور نکل گیا' زمین پر پھولوں کی بہار ہے۔ چڑیوں کے چہچہانے کا وقت آن پہنچا اور ہماری سرزمین

میں قمریوں کی آواز سننے میں آتی ہے' اٹھ اے میری پیاری' اے میری نازنین چلی آ۔
زرینہ نے اپنا آنچل اتار دیا' اب وہ ایک چست لباس میں نظر آئی جو اس کے کولہوں اور ٹانگوں سے پیوستہ تھا۔

''میں تو اپنا سایہ اتار چکی ہوں' میں اسے کیونکر پہنوں' میں تو اپنے پاؤں دھو چکی ہوں' میں انہیں کیونکر میلا کروں۔ میرے محبوب نے اپنا ہاتھ روشن دان کی راہ سے بڑھایا اور میرے دل و جگر میں اس کی طرف جنبش ہوئی۔''

''میں اپنے محبوب کے لیے قفل کھولنے کو اٹھی' اور میرے ہاتھوں سے 'مر' ٹپکا' میری انگلیوں سے 'مر' کی خوشبو ٹپکی' قفل کے قبضوں پر پڑی' وہ اپنے منہ کے چوموں سے مجھے چومے۔''

اس نے سر پیچھے جھکا لیا اور آنکھیں آدھی بند کر لیں۔

''مجھ کو قرار دو' کیونکہ میں عشق کی بیمار ہوں' اس کا بایاں ہاتھ میرے سر تلے ہے اور اس کا داہنا ہاتھ مجھے اپنے گلے سے لگاتا ہے۔''

''تو نے میرا دل غارت کیا' تو نے اپنی آنکھوں میں سے ایک آنکھ سے' اپنے گلے کی ایک زنجیر سے میرے دل کو غارت کیا ہے' تیرا عشق کیا خوب ہے' تیری محبت مے سے کتنی زیادہ لذیذ ہے اور تیرے عطروں کی مہک' ساری خوشبوؤں سے۔ تیرے ہونٹوں سے شہد کے قطرے ٹپکتے ہیں' شہد اور شیر تیری زبان کے تلے ہیں' اور تیری پوشاک کی مہک لبنان کی خوشبو کی سی ہے۔''

''میری بہن' میری زوجہ' ایک مقفل باغیچہ ہے' بند کیا ہوا' ایک سوتا ہے اور سر بمہر' ایک چشمہ۔''

''اے اُتر کی ہوا جاگ' اور دکھن کی ہوا چل' میرے باغ پر بہہ۔۔۔ کہ اس کی باس مہکے۔''

اس نے اپنی بانہوں کو بل دے کر اپنا منہ اونچا کیا: ''میرا محبوب اپنے باغیچے میں آئے اور اس کے لذیذ میوے کھائے۔''

''میں اپنے باغ میں آیا ہوں' اے میری بہن! میری زوجہ' میں اپنا 'مر' اپنے بلسان سمیت بٹورتا ہوں' میں اپنا شہد اس کے چھتے کے ساتھ کھاتا ہوں۔ میں اپنی مے اپنے دودھ سمیت پیتا ہوں۔''

"نگین کی مانند مجھے اپنے دل میں لگا رکھ اور خاتم کی مانند اپنے بازو پر' کیونکہ عشق موت کی مانند زبردست ہے۔"

زرینہ کے پاؤں بے حرکت' اس کے زانو ناکشادہ اور تنے رہے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے جسم کو بے حرکت کولہوں کے محور پر گردش دے رہی تھی' اس کی رانوں کے چست لباس پر اس کا چہرہ اور چھاتیاں اس طرح معلوم ہوتی تھیں گویا اس کا لباس گلدستہ تھا اور یہ چیزیں تین بڑے بڑے گلابی پھول ۔۔۔۔۔۔وہ انتہائے متانت سے صرف اپنے سر' شانوں اور خوبصورت بل کھائی بانہوں کو کام میں لا کر ناچ رہی تھی۔ ایسا ظاہر ہوتا تھا گویا لباس کی چستی اسے تکلیف دے رہی ہے اور اس کے نیم اسیر جسم کی زردی کو بڑھا کر دکھا رہی ہے' اس کے سینے میں سانس رکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنا منہ بند کر سکتی تھی' آنکھیں کھول سکتی تھی' اس کے رخسار شعلوں کی طرح تمتما رہے تھے ۔ کبھی کبھی دسوں انگلیاں چہرے پر آڑی ترچھی رکھ لیتی' کبھی کبھی بانہیں اٹھا کر مستی میں انگڑائی لیتی۔ اس کے اٹھتے اور گرتے شانوں میں ایک جدولِ مسلسل پیدا ہوتا تھا۔ آخر کار ایک چکر لے کر' جس سے اس کا چہرہ بالوں میں اس طرح ملفوف ہو گیا گویا نقابِ عروسی پہنے ہے۔ کانپ کر اس نے وہ خم دار بند کھول دیا جس سے لباس کولہوں پر اٹکا تھا' اور اس کی رعنائی کے تمام رموز منکشف ہو گئے۔

دیمیطر لیس۔۔۔اور۔۔۔زرینہ۔۔۔!

مواصلت سے پہلے ان کی ہم آغوشی ایسی مکمل' ایسی ہم آہنگ تھی کہ وہ بے حس و حرکت پڑے گونا گوں کیفیتوں کا مزہ لیتے رہے۔ ایک بازو کے نیچے' جو زرینہ کو تنگ گرفت میں لئے تھا' اس کی چھاتی گول اور ابھری' نمایاں تھی۔ اس کی ایک پنڈلی دو ٹانگوں کی گرفت میں' گویا جل رہی تھی' دوسری سپاٹ اور بوجھل ٹانگوں کے اوپر رکھی تھی۔ اس طرح وہ پڑے رہے۔ بے حس و حرکت' ہم آغوش' لیکن نارسا۔ وہ ایک ناقابلِ مفتوح خواہش کی کیفیاتِ عالیہ میں گرفتار تھے' جسے وہ پورا نہ کرنا چاہتے تھے۔ پیاسی جوانی کے لمس سے ایک دوسرے کو سرمست کیے لیتے تھے۔

کسی چیز کو ہم اس قدر قریب سے نہیں دیکھتے جس طرح محبوب کے چہرے کو دیکھتے ہیں۔ اس تنگ ہم آغوشی کے وقت زرینہ کی آنکھیں حیرت ناک طور پر بڑی بڑی معلوم ہوتی تھیں۔ جب وہ انہیں بند کرتی تھی تو ہر پپوٹے میں دو متوازی شکن پڑ

جاتے تھے اور بھوؤں سے لے کر گالوں کی ابھری ہوئی ہڈی تک یکساں ہلکی ہلکی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ جب وہ انہیں کھولتی تو ایک دائرۂ سبز، تارِ حریر کی طرح نفیس و باریک تاج رنگ سے اس کی پتلیوں کی اتھاہ گہرائیوں کو روشن کر دیتا جو لمبی گھنی پلکوں کے نیچے اس طرح پھیل گئی تھیں گویا بے کراں ہو گئی ہیں، سرخ گوشت کا وہ ٹکڑا جہاں سے آنسو بہتے ہیں گاہ گاہ پھڑک اٹھتا تھا۔

ان کا بوسہ لبدی تھا۔ زرینہ کی زبان غزل الغزلات کے الفاظ کے مطابق شہد اور دودھ کی طرح نہ تھی بلکہ زندہ، رواں، مسحور، پانی کی طرح تھی اور اپنے تمام ذوق و شوق اور تمام ہوس آلود فینٹسی (۱) سے کام لے کر وہ اس زبان میں زندگی اور حرکت پیدا کر رہی تھی، جو ہر آن ایک نئی شکل اختیار کرتی تھی، کبھی اس میں خوف پیدا کرتی، کبھی غلطانی، کبھی اسے کھینچ لیتی، کبھی تیزی سے نکالتی۔ چنانچہ اس کی زبان ہاتھوں سے زیادہ پیار کر سکتی تھی، آنکھوں سے زیادہ اظہارِ جذبات پر قادر تھی، وہ ایک پھول کی طرح تھی جو کبھی گرزن کی طرح گول ہو جاتی کبھی پتیوں کی طرح سپاٹ۔ وہ گرم گوشت کے پارے کی طرح تھی جو تن کر لرزاں ہو جاتا ہے، اور نرم لہو کو چاٹنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا تھا۔ زرینہ کسمسا کسمسا کر اس لذتِ مضطرب کو طول دے رہی تھی۔ وہ دیمیطر لیس کے بدن میں سرِ انگشت گڑوا کر، اس کے پہلوؤں میں درد کی لرزاں اور متلاطم جنبش پیدا کر رہی تھی، اس نے خود ایک بار کہا تھا کہ دو موقعوں پر وہ خوش ہوتی ہے، یا تو اس وقت جب نفسانیت سے مضطرب ہو یا اس وقت جب تھک کر ناتوانی و خستگی محسوس کر رہی ہو۔ ان دو انتہاؤں کے درمیانی مدارج اس کے لئے عذاب تھے۔ دیمیطر لیس نے اسے اپنی طرف کھینچا، زرینہ نے بانہیں تان کر مدافعت کی، زانو اس طرح ساتھ ملا لئے گویا قفل لگ گیا ہو، البتہ منہ سے عجز و آرزو کا اظہار ہوتا تھا۔ دیمیطر لیس نے زرینہ سے بالجبر مواصلت کر ڈالی۔

ایک بار جب انسان اپنی آغوش میں کسی عورت کی تبدیلیٔ ہیئت دیکھ چکتا ہے تو اس کے بعد کوئی چیز تعریف و تحسین کے لائق معلوم نہیں ہوتی ؛۔۔۔ آسمان کے مغربی کناروں پر شفق کی آتشیں سرخیاں سمندری طوفان، نخل ہائے بلند، سراب، تموج و تلاطم، سب نظروں سے گر جاتا ہے۔

زرینہ دیوزاد معلوم ہوتی تھی، کبھی اس کا جسم کمان کی طرح اوپر اٹھتا تھا، کبھی

نیچا ہو جاتا تھا۔اس کی جھکی ہوئی کہنیاں ایک گدے پر ٹکی تھیں۔اس نے ایک تکیہ کا کونہ زور سے پکڑ رکھا تھا اور اس کو اس طرح بھینچ کر تھامے تھی گویا ڈوب رہی ہے' جان نکل رہی ہے' سر پیچھے جھکا تھا۔اس کی آنکھوں سے' جو اظہارِ تشکر کے نور سے روشن تھیں' ایک سرمست اور کیف آور نگاہ ہویدا تھی۔اس کے رخسار شعلوں کی طرح دہک رہے تھے اس کے بالوں کا خم اتنا حسین نظر آتا تھا کہ دل بے چین ہوا جاتا تھا۔ عضلات کے دو نہایت جمیل خطوط کان اور شانوں سے اتر کر دائیں پستان کے نیچے جمع ہو گئے تھے جو ایک پکے پھل کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

دیمیطریس مذہب کے بعض تصورات سے متاثر ہو کر' خوف زدہ ہو کر' دیکھ رہا تھا۔ جسم نسوانی کی سرشت میں یہ دیوئ قہر کا خمیر! یہ لذت جو ایک وجود میں سکونت پذیر ہے' یہ مافوق انسانی اضطرابِ جسمی' جس کا براہ راست وہ خود باعث تھا اور جسے وہ اپنی مرضی سے پیدا کر سکتا تھا یا روک سکتا تھا اور جو اسے آج ہزارویں بار بھی متحیر بنا رہا تھا۔

اس نے دیکھا کہ حیات کی تمام عظیم الشان قوتیں عمل تخلیق میں کوشاں تھیں' ابھری چھاتیوں کی نوکوں میں مہر مادری کی عظمت پوشیدہ تھی' نسوانیت کا مقدس رحم' استقرارِ حمل کا وظیفہ انجام دے رہا تھا۔

حوالہ جات

(۱) غزل الغزلات کا ترجمہ مترجم نے خود نہیں کیا بلکہ "کتابِ مقدس" کے مستند ترجمے کو اختیار کیا گیا ہے جو لندن میں ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا۔

Old Testament in urdu with references; 1887.

(۲) فینٹسی؛ غرابت کاری (Fantasy)۔

دوسرا لباب

ہیئت

کہ آج کوچے میں اس کے شور بائے ذنب قتلتنی ہے

سمندر کی سطح پر اور دیوی کے باغوں پر مہتاب اپنے مقام رفیع سے نور کی شعاعیں بر سا رہا تھا۔ ملیطہ 'وہ نازک بدن لڑکی' جسے دیمیطر لیس نے ایک لمحہ گزراں کے لئے اپنا بنایا تھا' اور جو اسے کاہنہ شمیر لیس کے پاس لے کر گئی تھی' وہیں پیش گو عورت کے پاس بیٹھی رہ گئی تھی۔ شمیر لیس دبک کر بیٹھی تھی اور ابھی تک غضبناک تھی۔

وہ کہہ رہی تھی ؛ "اس آدمی سے بچنا۔"

"کیوں بچوں ؟ میں نے اس سے یہ بھی تو نہیں پوچھا کہ پھر ملاقات ہو گی یا نہیں۔ جاؤں' اس کا ایک بوسہ تو لے آؤں' ابھی آئی۔"

نہیں' اب تو اسے نہ دیکھ سکے گی' اور یہی ٹھیک بھی ہے۔ جو عورت ایک بار اس سے ملی' اسے دکھ ملا' لیکن جو دوبارہ ملی وہ گویا موت سے کھیلی۔"

"یہ کیوں کہہ رہی ہو ! میں تو اس سے ایک بار ملی ہوں اور اس کی گود میں یونہی سکھ کا سایہ سا دیکھا ہے۔"

"ننھی تجھے جو لطف حاصل ہوا اس کی وجہ تو یہ ہے کہ تجھے پتہ ہی نہیں "لذت" کسے کہتے ہیں' اسے بھول جا' جس طرح بچے کھیل کے ساتھیوں کو بھول جاتے ہیں اور شکر کر کہ تو گیارہ سال کی ہے۔"

ملیطہ نے کہا: "بڑے ہو کر لوگ باگ خدا جانے دکھی کیوں معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں جس عورت کو دیکھو کسی تکلیف کا رونا ہی روتی ہے، میں تو کبھی روئی نہیں، ہر روز کسبیوں کو روتے دیکھتی ہوں۔"

شمیریس نے دونوں ہاتھ بالوں میں ڈال کر فریاد کی ایک صدائے دردناک بلند کی، اس کے بکرے نے اپنا سنہرا پٹہ ہلایا اور اس کی طرف منہ موڑا، لیکن اس نے جانور کی طرف نظر نہ اٹھائی۔

ملیطہ نے معنی خیز انداز میں کہا: "تم کچھ ہی کہو، میری ایک گوئیاں ہے زرینہ، وہ ضرور خوش ہے، میں جانتی ہوں وہ کبھی روئی نہیں۔"

"شمیریس نے کہا: "روئے گی۔"

"کمبخت کیا کالی زبان ہے تیری، منہ سے بری بات ہی نکالتی ہے، کوئی اچھی بات منہ سے نکال، جلدی، نہیں تو مجھے تجھ سے نفرت ہو جائے گی۔"

بکرے نے جو ملیطہ کی تہدید آمیز حالت دیکھی تو ٹانگیں جھکا کر، سینگ بڑھا کر، آگے آیا۔

ملیطہ بھاگ کھڑی ہوئی، لیکن یہ خبر نہ تھی کہ کہاں جا رہی ہے۔ تھوڑی دور گئی ہو گی کہ جھاڑیوں میں ایک جوڑے کی حالت دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ بس اسی بات سے اس کے خیالات کی رَو دوسری طرف پھر گئی۔ بڑا چکر کاٹ کر اپنے گھر پہنچی، اور پھر فیصلہ کیا کہ گھر رہے گی ہی نہیں۔ باغ، گفتگو اور گیتوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ دیمیطریس سے جو کچھ اسے وصول ہوا تھا اسے کافی سمجھا اور اب خیال آیا کہ چلو جنگل کے اندرونی حصوں میں گزرتے ناداروں کے درمیان، آوارہ گرد لڑکی کے روپ میں پھروں جو سڑکوں پر ماری ماری پھرتی ہے۔ اس روپ میں دو تین بار لوگ اس سے مستفید ہوئے، کسی درخت کے ساتھ لگ کر یا پتھر کے ستون کے پاس، یا کسی بنچ پر۔ اس کھیل میں اسے بڑا مزا آیا، کیونکہ ہر بار منظر بدلتا تھا اور اس تبدیلی کی وجہ سے کھیل نا معلوم ہوتا تھا۔ ایک سپاہی نے جو سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا تھا اسے اٹھا لیا، وہ باغوں کا دیوتا معلوم ہوتا تھا جو گلاب بیچنے والی لڑکیوں سے مواصلت کرتا ہے اور ان کے پاؤں زمین سے لگنے نہیں دیتا۔ اس سپاہی کی آغوش میں ملیطہ نے کامرانی کا ایک نعرہ مارا۔

جب وہ اس کے پنجے سے چھوٹی تو پام کے خیابان میں سے گزر کر اسے ایک

نوجوان لڑکا ملا' مکی لوس نامی' جو شاید جنگل میں راستہ بھول گیا تھا۔ اسے ملیطہ نے راستہ دکھانے کا وعدہ کیا لیکن جان بوجھ کر کہیں کی کہیں لے گئی' تاکہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اسے اپنے پاس رکھے' مکی لوس بھی جلد ہی ملیطہ کا مطلب سمجھ گیا اور اس نے ملیطہ کی معمولی صلاحیتوں اور فن کاریوں کا لطف اٹھایا۔

اب وہ عشق کی بجائے دوستی کا دم بھرنے لگے اور اس خاموشی میں پہلو بہ پہلو دوڑتے بھاگتے رہے' جو ہر لمحہ زیادہ پرامن ہوتی جاتی تھی۔ انہیں خبر بھی نہ ہوئی اور وہ جنگل سے نکل کر سمندر کے سامنے آن پہنچے۔ یہ مقام اس جگہ سے بہت دور تھا جہاں کسبیاں عام طور پر اپنے مقدس پیشے کی رسمیں پوری کرتی تھیں۔ اگر اس سے پوچھا جاتا کہ اس مقام کو چھوڑ کر جو سب سے اچھا تھا وہ ملاقات کے لئے دوسرے مقام کیوں مقرر کرتی تھیں تو وہ اس کا جواب نہ دے سکتی۔ جنگل کا وہ حصہ جہاں لوگ جمع ہوا کرتے تھے' بہت جلد بدنام ہو گیا اور چاروں طرف پگڈنڈیاں اور بن لیکھیں بن گئیں۔ اس مقام سے پرے' چاروں طرف بڑا دلکش منظر تھا' لیکن ازلی خاموشی حکمران تھی۔ ہر جگہ سبزہ و گل سے پٹی تھی۔ ہاتھ میں ہاتھ دیئے مکی لوس اور ملیطہ باغ عامہ کی سرحد تک جا پہنچے۔ یہاں زہرہ اور اس کے اعلیٰ پجاریوں کے باغوں میں چھوٹے چھوٹے عود کے پودوں سے ایک غیر ضروری حد فاصل قائم کر دی گئی تھی۔ بحیرہ روم ان کے تلے تھا۔ کنارے تک اس کی لہریں اس طرح آتی تھیں جس طرح دریائی جھالریں ہوں۔ وہ پانی میں سینے تک اتر گئے' ہنستے کھیلتے' بھاگتے دوڑتے رہے۔ پانی کے اندر مشکل آسنوں کی مشق کرتے رہے۔ ان کرتبوں کی طرح جن کی پہلے کافی مشق نہ ہو' یہ کرتب کامیاب نہ ہو سکا اور انہوں نے اس پر خاک ڈالی۔ چاندنی میں ان کے بدن روشن اور نمناک اور ان کی ٹانگیں مینڈکوں کی ٹانگیں معلوم ہوتی تھیں۔ آخر وہ باہر نکل کر سمندر کے تاریک کنارے پر آ گئے۔ ریت پر نشاناتِ پاء دیکھ کر وہ بڑھتے چلے گئے۔ دوڑتے ہوئے ہاتھاپائی کرنے لگے' ایک دوسرے کو ہاتھ پکڑ کے کھینچا' ان کے سیاہ نمایاں سائے زمین پر ابھرے ہوئے نقوش پیدا کرتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس طرح کہاں تک چلے جائیں گے۔ کنارِ افق تک کسی آدمی کا سایہ تک نظر نہ آتا تھا۔

ناگہاں ملیطہ نے مڑ کر کہا: "دیکھنا' ذرا دیکھنا۔"

"کیا دیکھنا۔"

"کوئی عورت ہے۔"

"کوئی کسبی ہو گی' بے حیا! گھر سے باہر ہی سو مر گئی۔"

ملیطہ نے سر ہلا کر کہا؛ "نہیں نہیں' کسبی نہیں' مجھے تو اس کے پاس جاتے ڈر آتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں کسبی ہے کوئی۔"

نہیں' مکی لوس! ہم میں سے کوئی عورت نہیں یہ۔۔۔ یہ تو طونیہ ہے' سب سے بڑے کاہن کی بیوی' ذرا دیکھو' وہ سو تو نہیں رہی' مجھے تو اس کے پاس جاتے ڈر آتا ہے' اس کی آنکھیں کیسی پھٹی پھٹی سی ہیں' چلو چلیں' مجھے ڈر آتا ہے' مجھے ڈر آتا ہے۔"

مکی لوس پنجوں کے بل تین قدم آگے بڑھا؛ "تم نے سچ کہا تھا ملیطہ' بے چاری طونیہ مر گئی غریب' سوئی نہیں۔"

"مر گئی؟"

"ہاں اس کے دل میں ایک پن کھبی ہے۔"

اس نے چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر پن نکال لے' لیکن ملیطہ سہم گئی۔

"ہاتھ نہ لگانا اسے' اس کا جسم پوتر ہے' یہیں ٹھہرو' اس کی حفاظت کرو' میں جا کر سب کو بتاتی ہوں اور لوگوں کو بلا کر لاتی ہوں۔"

جتنی تیز بھاگ سکتی تھی بھاگ کر درختوں کے گھنے سائے میں غائب ہو گئی۔

تنہا' کانپتا کانپتا' مکی لوس جوان عورت کی لاش کے پاس گیا۔ مجروح سینے کو چھوا' پھر ناگاہ بھاگ گیا۔ شاید ڈر گیا تھا یا اس بات سے خوفزدہ ہو گیا تھا کہ کہیں لوگ اسے جرم میں شریک نہ تصور کریں۔ اس نے سوچ لیا کہ اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کروں گا۔

طونیہ کی یخ مثال عریانی اسی طرح چاند کی تیز روشنی میں مردود اور مطرود پڑی رہی۔

بہت دیر کے بعد جنگل کا وہ حصہ جو اس کی سرد لاش کے قریب تر تھا دھیمی دھیمی آوازوں سے گونجنے لگا' جن کے دھیمے پن سے خوف آتا تھا۔ چاروں طرف سے درختوں کے تنوں اور جھاڑیوں کے درمیان ہزاروں کسبیاں خوف زدہ بھیڑوں کی طرح جمع ہو کر ایک سوادِ اعظم کی شکل اختیار کئے ہولے ہولے اس طرح آگے بڑھ

رہی تھیں گویا یہ انبوہ بیک وقت لرزشِ خوف محسوس کر کے کانپ جاتا ہے جس طرح لہریں ریتلے ساحل پر آتی ہیں۔ اس ترتیب و نظام سے اس فوج کا ہراول' پیچھے آنے والیوں کے لیے جگہ چھوڑ دیتا تھا' گویا ان میں سے کوئی سب سے پہلے طونیہ کی لاش تک پہنچنا نہیں چاہتی تھی۔ جب ایک درخت تلے طونیہ کی لاش پڑی نظر آئی تو ایک چیخ کی آواز دور پہنچ کر غائب ہوتی بلند ہوئی جو ہزاروں کسبیوں نے اٹھالی گویا طونیہ کو سلام کر رہی ہیں۔

خوف و ہیبت کے اظہار کے لیے ایک ہزار ننگی بانہیں بلند ہوئیں اور اسی وقت ایک ہزار اور۔۔۔'

اب وہ سسکیاں بھر کے کہہ رہی تھیں: "ہم سے انتقام نہ لے' اگر انتقام لینا ہے اے دیوی! تو ہم سے نہ لے' رحم' رحم۔۔۔' جان کی امان۔۔۔"

کسی نے خشک گلے سے آواز نکال کر' للکار کر کہا "مندر چلو۔۔۔ دیوی کے مندر۔"

عورتوں نے پکار کر کہا: "مندر چلو۔۔۔' مندر چلو۔"

اب اس چڑھتے سیلاب میں ایک نیا گرداب پیدا ہو گیا' کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس چیز کی طرف دیکھے جو زمین پر پڑی تھی۔۔۔' آنکھیں اٹھا کر بانہیں پیچھے پھینک کر تمام کسبیاں' کالی' گوری' مشرقی' مغربی' بعض شاندار چادروں میں لپٹی' بعض چیتھڑے لگائے' بعض عریاں ایک انبوہ کثیر کی شکل میں درختوں کے جھنڈ میں سے گزرتی' لانگتی' پھاندتی' پگڈنڈیوں اور لیکھوں پر چلتیں' مکانوں کے سامنے کھلے میدان میں جا پہنچیں اور آخر گلابی سنگِ مرمر کی ان سیڑھیوں پر چڑھ گئیں جن پر نئے دن کی روشنی میں گہرے سرخ رنگ کی میناکاری ہو گئی تھی۔ کم طاقت مٹھیاں بھینچ کر وہ بلند برنجی دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں اور بچوں کی سی کمزور آواز میں چیخ رہی تھیں:

"دروازہ کھولو' کھولو' ہمیں اندر آنے دو۔"

تیسرا باب

ہجوم

ساغرِ حسن یار میں بادہ و زہر جمع ہیں

اُس رات کو بیقس کے ہاں جلسۂ عشرت قائم تھا اور صبح کو سکندریہ میں ایک واقعہ گزرا۔

مینہ برسا؛

افریقہ کے بعض حصوں میں ایسے موقعوں پر اتنی بے تابی کا اظہار نہیں کیا جاتا لیکن یہاں سکندریہ کے لوگ گھروں سے باہر نکلے کہ بارش کا خیر مقدم کریں ۔اس بارش میں کوئی طوفانی یا سیلابی رنگ نہ تھا۔ ایک بھنشئ بادل سے بھاری گرم قطرے گر رہے تھے' عورتوں نے اپنے جلدی میں باندھے ہوئے جُوڑوں اور اپنی چھاتیوں پر نمی محسوس کی۔ مرد دلچسپی سے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بچے پتلی پتلی کیچڑ میں ننگے پاؤں پھرتے اور خوش ہو کر ہنستے تھے۔ پھر بادل نور میں تحلیل ہو گیا۔ آسمان نکھر آیا اور سورج کی حرارت سے کیچڑ خاک بن گئی۔

لیکن اس چھینٹے نے شہر میں زندگی کے آثار پیدا کر دیئے تھے۔ مردوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بڑے چوک کی پٹڑیوں پر کھڑی تھیں اور عورتیں جمع ہو کر مہین آواز سے ایک دوسری کو بلا رہی تھیں۔

صرف کسبیاں موجود تھیں کیونکہ زہرہ کے میلے کا تیسرا دن بیاہی عورتوں کی عبادت کے لئے مخصوص تھا' اور وہ ایک جلوس کی شکل میں ہیکلِ زہرہ کی طرف چل

پڑی تھیں۔ چوک نقشیں عباؤں اور سرمہ آلود آنکھوں والی کسبیوں سے پُر تھا۔

مرطس بھیڑ میں جارہی تھی کہ فلوتس نامی ایک لڑکی نے جو ایک ٹکڑی میں کھڑی باتیں کر رہی تھی، اس کی آستین پکڑ کر کھینچی۔

"تم کل بیقس کے ہاں گئی تھیں نا؟ گانے بجانے کے لئے! کیا ہوا وہاں؟ کچھ بتاؤ تو سہی، کیا بیقس نے اپنی جھریائی ہوئی گردن کو چھپانے کے لئے پہلے سے بڑا کالر پہنا تھا؟ اس کی چھاتیوں کے خول لکڑی کے ہیں کہ تانبے کے؟ میں جانتی ہوں، مصنوعی بال لگانے سے پہلے اس کو کنپٹیوں کے سفید بالوں کو خضاب لگانا بھول ہی گیا ہوگا۔ آؤ ذرا باتیں تو سناؤ۔"

"مجھے کیا خبر؟ میں کیا اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دعوت کے بعد گئی تھی، ساز بجایا، روپیہ لیا اور بھاگ آئی۔"

"ہاں یہ تو میں جانتی ہوں کہ تم آوارہ نہیں پھرتیں۔"

"کیوں پھروں؟ عبا پر داغ پڑ جائیں گے اور مار خواہ مخواہ کھانی پڑے گی۔۔۔ نہیں، نہیں۔ امیر عورتیں تو ان جلسوں میں مزے لوٹتی ہیں لیکن بے چاری غریب بنسی بجانے والیوں کو یہاں دکھ ہی ملتا ہے۔"

"خیر عبا کو داغوں سے بچانا چاہتی ہو تو باہر لباس کے کمرے میں رکھ جایا کرو نا! باقی رہی مار تو اس کے لیے ڈبل فیس لے لیا کرو، چلو چھٹی ہوئی، تو پھر کچھ بتاؤ گی نہیں؟ کوئی ہنسی مذاق کی بات، کوئی عجیب ماجرا، کسی کی رسوائی کی کنسوئیاں، دیکھو ہمارے منہ میں تو پانی آرہا ہے، تمہیں کچھ پتہ نہیں تو اب دل سے ہی گھڑ لو نا!"

"میں تو چلی آئی تھی، میری سہیلی تھیانو ٹھہر گئی تھی۔ ابھی جاگ کر دیکھا تو نہیں لوٹی تھی، وہیں ہوگی، شاید اب تک گلچھرے اڑ رہے ہوں۔"

کسی اور کسبی نے کہا: "نہیں، جلسہ تو ختم ہو لیا، وہ دیکھو تھیانو کھڑی ہے، دیوارِ شعر کے پاس۔"

کسبیاں بھاگ کر تھیانو کے پاس جا پہنچیں، لیکن اس سے فاصلے پر رک گئیں اور رحم کے انداز میں مسکرانے لگیں۔ تھیانو جس کو طفلانہ مخموری کی وجہ سے کچھ سدھ بدھ نہ تھی، بار بار ایک گلِ دوزُو کو پکڑ کر کھینچنا چاہتی تھی جس کے کانٹے اس کے پاؤں میں اٹک گئے تھے۔ اس کی زرد قبا پر سرخ و سفید داغ تھے گویا ہوس رانی کے تمام تیروں

کا ہدف وہی رہی تھی۔ وہ برنجی بند جس سے اس کے لباس کے ملتے ہوئے جھول بائیں شانے پر دبے ہوا کرتے اس کی کمر سے نیچے آگیا تھا۔ اس کی نو بہار چھاتی کے کرۂ ذی حیات پر رگڑ کے ارغوانی نشان تھے۔ اس نے مرطس کو دیکھ کر ہنسنا شروع کیا۔ اس کی ہنسی کی شان ہی نرالی تھی۔ سکندریہ کا بچہ بچہ اسے پہچانتا تھا اور اس ہنسی کی وجہ سے لوگ باگ اسے مرغی کہہ کر بلاتے تھے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اس کی ہنسی کی آواز اس طرح تھی گویا کوئی کڑک مرغی مسلسل کٹ کٹ کر رہی ہو۔ ہنسی کیا تھی خوشی کا ایک آبشار تھا جو تیزی سے بے صدا ہوتا ہوا اس کے گلے میں جاگرتا تھا اور ایک زہرہ گداز صدا کے ساتھ پھر رواں ہو جاتا تھا۔ بے صدائی اور بلند آوازی کا ایک چکر تال کے ساتھ قائم ہو جاتا تھا گویا کوئی کڑک مرغی نعرۂ فتح بلند کر رہی ہو۔

فلوتس نے پکار کر کہا؛ ''انڈا دے دو انڈا!''

لیکن مرطس نے اشارے سے تھیانو کو بلایا اور کہا؛ ''آؤ تھیانو' ذرا سور ہو' تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے' میرے ساتھ آؤ۔''

تھیانو زور زور سے ہنسنے لگی اور پھر اپنے نازک ہاتھ اپنی چھاتیوں پر رکھ کر بیٹھی ہوئی آواز میں کہنے لگی؛ ''او ہو' ہو شیشہ' شیشہ۔''

مرطس نے بے صبر ہو کر پھر کہا؛ ''آؤ' میرے ساتھ' چلیں!''

تھیانو ہنس کر بولی؛ ''شیشہ! شیشہ! چوری ہو گیا' گیا' گیا' او ہو ہو'۔۔۔''

''کتنی ہنسی آئی ہے مجھے! میری عمر کردن (۱) کی ہو جائے تو بھی اتنا ہنسا نہ جائے گا۔''

''چوری ہو گیا' چاندی کا شیشہ چوری ہو گیا۔''

مرطس نے چاہا کہ اسے کھینچ کر لے جائے لیکن فلوتس معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی تھی' اس نے باہیں بلند کر کے پکار کر کہا؛ ''ارے دوڑ کر آنا' نئی بات سنو' بیقس کا شیشہ چوری ہو گیا۔''

ایک لمحے میں نے نواز کے گرد تیس عورتیں جمع ہو گئیں۔

''کیا ہوا؟''

''تھیانو کہتی ہے' کسی نے بیقس کا شیشہ اڑا لیا۔''

''کب؟''

"کس نے اڑالیا؟"

تھیانو نے شانے سکوڑ کر کہا: "مجھے کیا پتہ۔"

"تم وہیں تو رہیں رات بھر! اور کس کو پتہ ہو گا' لیکن یہ بات ہو نہیں سکتی' کس نے چرایا ہو گا؟ تمہیں ضرور بتایا ہو گا' اچھی تھیانو ذرا یاد تو کرو۔"

تھیانو نے جواب دیا: "میری جوتی کو خبر ہے کس نے چرایا' بیس سے زیادہ تو آدمی تھے وہاں' مجھے تو بلایا تھا بنسی بجانے کے لئے' لیکن نگوڑوں کو گانے بجانے میں خاک مزا نہ آیا' اس لیے انہوں نے مجھے کہا کہ ام پرسوس کا ناچ دکھاؤں۔ میری طرف سونے کے سکے پھینکتے تھے' بیقس نے مجھ سے چھین لیے' کیا بتاؤں مجھے تو سب پگلے معلوم ہوتے تھے' بڑے سے برتن میں شراب بھر کر مجھے الٹا لٹکا کر شراب پلائی' شراب بہت تھی' برتن میں' شراب کے ساتھ پیالے ڈال رکھے تھے' کیونکہ میز پر سات طرح کی شراب تھی' میرا چہرہ بھیگ گیا' بال بھی' میرے گلاب کے پھول بھی۔"

مرطس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "ہاں' ہاں تم بڑی شریر ہو۔ لیکن یہ تو کہو' شیشہ کون لے گیا؟"

تھیانو بولی: "یہی تو بات ہے' جب میں پاؤں کے بل کھڑی ہوئی تو میرا چہرہ سرخ بھبھوکا ہو رہا تھا' کانوں تک ہر حصے سے شراب ٹپک رہی تھی' مجھے دیکھ کر ہنس ہنس کر دوہرے ہوئے جاتے تھے' بیقس نے اپنا شیشہ منگوایا' اور شیشہ ملا ہی نہیں' اوہو' کوئی اسے پہلے ہی لے اڑا تھا۔"

"کون؟ کون؟؟"

"مجھے کیا خبر' میں نے نہیں لیا' وہ میری تلاشی بھی تو نہیں لے سکتے تھے' میں تو پہلے ہی ننگی تھی' درہم کی طرح شیشے کو میں اپنی آنکھوں کے پپوٹوں میں تھوڑے ہی چھپا سکتی تھی' بس مجھے تو یہ پتہ ہے کہ میں نے شیشہ نہیں چرایا تھا' بیقس نے ایک کنیز کو سولی چڑھا دیا' شاید اس نے چرایا ہو۔ میں نے تو موقع پا کر چند درہم اٹھا لیے' دیکھ مرطس یہ رہے' پانچ ہیں' ہم تینوں نئی عبائیں خریدیں گی۔"

رفتہ رفتہ' چوری کی خبر چوک میں پھیل گئی اور ہر کسی کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے شیشے کے چوری ہو جانے سے رشک آفریدہ مسرت حاصل ہوئی ہے' عورتوں کی متحرک ٹولیوں میں شور آفرین استعجاب کی رَو دوڑ گئی۔

فلوتس نے کہا؛ ''یہ کسی عورت کا کام ہے' یہ کام ہی کسی عورت کا ہے۔''

''ہاں' شیشہ' ایسی جگہ چھپا کے رکھا جاتا تھا کہ معمولی چور ہوتا تو لاکھ سر پٹکتا' کبھی شیشے والا پتھر ملتا ہی نہ اسے۔''

''بیقس کے دشمن بھی تو ہیں' پرانے دشمن' بیسیوں' وہ تو اس کے تمام بھید جانتے ہیں' ان میں سے کسی نے یہ تدبیر کی ہو گی کہ عین وقت پر بیقس کو کسی طرح پھسلا کر باہر بلا لیا ہو گا' اور خود چلچلاتی دھوپ میں' گلی کو سنسان دیکھ کر اندر چلا گیا ہو گا۔''

''میں تو سمجھتی ہوں کہ پرانا قرض چکانے کے لیے خود ہی چھنال نے پیچ دیا ہے شیشہ۔''

''کہیں کسی دھگڑے کو تو نہیں دے دیا' سنتی ہوں کہ آج کل قلیوں سے بغل گیر ہوتی ہے۔''

''نہیں' یہ کسی عورت ہی کا کام ہے' مجھے یقین ہے اور سچ پوچھو تو اچھا ہوا۔''

عین اس وقت ہراساں لوگوں کا ایک گروہ ریلتا' پیلتا چوک کے ایک کونے کی طرف چلا آ رہا تھا اور اس کے عقب میں لحہ لحہ بلند تر ہونے والی صدائیں سنائی دیتی تھیں جو گزرنے والوں کی توجہ کو اپنی طرف پھیر لیتی تھیں۔

''کیا ہوا' کیا بات ہو گئی۔''

اس گروہ میں جو لوگ شامل تھے ان کے چہروں پر فکر و تردد کے آثار تھے' انہی میں سے کسی نے چیخ کر کہا' تاکہ شور میں آواز دب نہ جائے؛ ''بڑے پجاری کی بیوی کو کسی نے مار ڈالا۔''

خوف اور ہیبت کی وجہ سے ہجوم میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی' لوگوں کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ تھا' انہیں یقین نہ آتا تھا کہ زہرہ کے میلے کے دوران اس طرح کا واقعہ ہو سکتا ہے' جس کی وجہ سے سکندریہ پر دیوتاؤں کا قہر نازل ہو جائے' لیکن ہر طرف یہی بات دہرائی جا رہی تھی۔۔

''بڑے پجاری کی بیوی کو کسی نے مار ڈالا' مندر میں رسمیں پوری نہیں ہو رہیں۔''

جلدی جلدی واقعہ بیان کر دیا گیا' مقتولہ کی لاش باغ کے بالائی حصے میں ایک

سنسان جگہ پڑی ہوئی پائی گئی تھی' بائیں چھاتی میں ایک لمبی طلائی پن پیوست تھی' زخم سے خون نہیں بہا تھا لیکن قاتل نے مقتولہ نازنین کے بال کاٹ دیئے تھے اور ملکہ نطاقریط کی پرانی کنگھی چرا کر لے گیا تھا۔

پہلے تو خوف وہراس کی ایک عام آواز بلند ہوئی' اس کے بعد ہجوم اس طرح چپ چاپ بے حس و حرکت ہو گیا' گویا سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ لمحہ بہ لمحہ ہجوم بڑھتا جارہا تھا' معلوم ہوتا تھا کہ تمام شہر جمع ہو گیا ہے' ننگے سروں اور ٹوپیوں کا ایک بحرِ موّاج' ایک عظیم الشان گلہ' شہر کی نیلگوں' سایہ دار گلیوں سے' لوگ سکندریہ کے بڑے چوک کی طرف دوڑے آرہے تھے' جہاں دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ جس دن ملکہ بیرینس کے طرف داروں نے بطلیموسی فرعون ایستر کو تخت سے اتار کر شہر بدر کیا ہے' اُس دن اس طرح کا ہجوم دیکھنے میں آیا تھا۔ اُس کے بعد آج تک ایسا ہجوم کبھی نہ دیکھا گیا۔ بے دینی کی اس حرکت کے مقابلے میں' جس پر شاید اب شہر کی نجات کا دارومدار تھا' سیاسی انقلاب کے کرشمے بھی کم معلوم ہوتے تھے۔ لوگ باگ ان آدمیوں کے گرد جمع تھے جنھوں نے کچھ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا' نئی تفصیلات دریافت کر رہے تھے' قیاس کے گھوڑے دوڑا رہے تھے' عورتیں نوواردوں کو شیشے کی چوری کا حال سنا رہی تھیں۔ جو لوگ بہت سیانے تھے وہ کہتے تھے کہ دونوں جرم ایک ہی شخص نے کئے ہیں' لیکن کس نے ؟ جن لڑکیوں نے ابھی اگلے دن سال بھر کے لئے مندر میں نذریں چڑھائی تھیں' اب ڈرتی تھیں کہ دیوی غصے میں آکر نذروں کو نظر انداز نہ کر دے' وہ ایک طرف سر جھکائے بیٹھی رو رہی تھیں۔

پرانے زمانے سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ جب اس قسم کے دو واقعات ہوں تو ان کے بعد تیسرا واقعہ بھی ضرور ہوتا ہے اور وہ پہلے دو واقعات سے ہوتا بھی کہیں خوفناک ہے۔ ہجوم اس واقعے کا منتظر تھا' شیشے اور کنگھی کے بعد پراسرار چور نے کیا چرایا ہوگا ؟ بے حرکت ہجوم کو جو فضا محیط تھی اس میں سانس گھٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور جنوبی ہوائیں جو ریت کے ذرے لا رہی تھیں ان کی وجہ سے اس فضائی کیفیت میں یک گونہ اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر بغیر شعور کے گویا یہ اجتماع ایک جسمِ واحد تھا۔ ہجوم میں ایک کپکپی سی پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ اس ارتعاش نے وحشت انگیز خوف کی شکل اختیار کر لی اور تمام آنکھیں افق کے قریب ایک ہی نقطہ کی طرف مڑ گئیں۔

تمام لوگ دور اس سایہ دار سیدھی راہ کے دوسرے سرے کی طرف دیکھ رہے تھے جو سکندریہ کو قطع کرتی ہوئی باب کنوپک کو ایک طرف اور مندر کو دوسری طرف چھوڑ کر عظیم الشان چوک کی طرف آتی ہے۔ دور جہاں ذرا سا نشیب تھا اور جہاں سڑک وسیع آسمان کی طرف جاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی وہاں انسانوں کا ایک اور وحشت زدہ ہجوم ابھی ابھی ظاہر ہوا تھا اور پہلے ہجوم کی طرف آرہا تھا۔

"کسبیاں 'پوتر کسبیاں"

کسی نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی' کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر انہیں ملے' کیونکہ خدشہ تھا کہ خدا جانے ان کی زبانی کس نئے حادثے کی خبر ملے گی۔ کسبیاں ایک ذی حیات سیلاب کی طرح بڑھتی چلی آرہی تھیں اور ان کے آگے آگے ان کے دوڑنے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ وہ بانہیں اٹھائے ایک دوسرے کو ریلتی پیلتی (گویا کوئی فوج ان کا تعاقب کر رہی ہو) چلی آرہی تھیں۔ اب ان کے چہرے پہچانے جاتے تھے' ان کی عباؤں میں تمیز کی جا سکتی تھی' ان کے کمر بند' ان کے بال نظر آرہے تھے' ان کے سنہری زیورات میں آفتاب کی شعاعیں الجھ رہی تھیں' وہ اب بہت قریب تھیں' انہوں نے اپنے منہ کھولے' خاموشی چھا گئی۔

"دیوی کا ست لڑا ہار انادو میں کے سچے موتی چوری ہو گئے۔"

یہ مہلک خبر سنائی گئی تو یاس و حرماں کی ماتمی آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک لہر کی طرح ہجوم پہلے پیچھے ہٹا پھر گویا سر کے بل آگے بڑھا' دیواروں کے ساتھ ٹکرایا' راہوں پر پھیل گیا۔ خوف زدہ عورتوں کو دھکیلتا ڈرموز کی سایہ دار سڑک کی طرف بڑھا' جو غیر فانی دیوی کے مندر کی طرف جاتی تھی۔ وہ غیر فانی دیوی جس کی بے حرمتی کر دی گئی تھی۔

حوالہ جات

(۱) کردن ؛ایک غیر فانی دیوتا۔

چوتھا باب

جواب

نہ دے جو بوسۂ لب تو کہیں جواب تو دے!

جس طرح جذر کے بعد ساحلِ بحر خالی ہو جاتا ہے اسی طرح چوک خالی ہو گیا۔ خالی، ہاں، لیکن بالکل سنسان بھی نہیں۔ ایک مرد اور ایک عورت وہاں موجود تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو چاہتے تو اس اضطراب کی وجہ بیان کر سکتے تھے جس نے ہجوم کو بے چین کر دیا تھا اور جو ایک طرح اس اضطراب کا باعث تھے۔ زرینہ اور دیمیطر یس!

نوجوان، مندر کے نزدیک سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پر بیٹھا تھا، جوان عورت چوک کے اس سرے پر کھڑی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان تو نہ سکتے تھے لیکن ایک دوسرے کی موجودگی کا اندازہ لگا سکتے تھے۔

زرینہ غرور میں مخمور اور پھر شہوانیت میں مدہوش ہو کر گرمی میں دوڑتی ہوئی آئی۔ چیخ کر بولی: "تم نے کیا ہے یہ کام؟ تم نے میرا کہا پورا کر ہی دیا۔"

نوجوان نے سادگی سے کہا: "ہاں تمہارا کہا پورا ہوا۔"

وہ گھٹنوں کے بل جھک گئی اور سرمستی کے سے عالم میں اس سے لپٹ گئی۔

"میں تم پر مرتی ہوں، تم پر جان چھڑکتی ہوں، اب مجھے پتہ لگا ہے کہ پیار کرنا کیا ہوتا ہے۔ میری طرف دیکھو، پیارے جن جن چیزوں کا دو دن قبل میں نے تم سے وعدہ کیا تھا، ان سے زیادہ، تمہیں کیا کچھ دیئے دیتی ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اک

بار اس طرح بدل جاؤں گی' میں جس نے آج تک کسی کو نہیں چاہا' میں نے اپنا جسم تمہارے ہاتھ بیچا تھا۔

سیج کا جسم' پر اب میں تمہیں وہ سب کچھ دے رہی ہوں جو میرے پاس ہے' ہر وہ بات جو مجھ میں اچھی ہے' ہر وہ چیز جو مجھ میں پاک ہے' سچی ہے' امٹ ہے' تمہاری ہے۔ میری روح جو ابھی تک اچھوتی ہے' تمہاری ہے' ذرا سوچو' دیمیطر لیس' آؤ میرے ساتھ کچھ وقت کے لئے سکندریہ سے چلے جائیں' کہیں چھپ رہیں' بس تم اور میں! ہماری زندگی کے دن ایسے میٹھے' ایسے سہانے ہوں گے کہ آج تک اس زمیں پر کسی نے ان کا مزہ نہ چکھا ہوگا' آج تک کسی چاہنے والے نے اپنی پیاری کے لئے یہ کچھ نہیں کیا جو تم نے کیا ہے اور کسی عورت نے اس طرح محبت نہیں کی جس طرح میں تم سے کرتی ہوں۔ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے' ممکن ہی نہیں ہے۔ میرے منہ سے بات نہیں نکلتی' اتنی محبت ہے تم سے مجھے' میرا سانس رک رہا ہے' دیکھو میں رو رہی ہوں۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے رونا کسے کہتے ہیں' رونے کا مطلب ہے بہت خوش ہونا' جواب کیوں نہیں دیتے' تم تو بات ہی نہیں کرتے' میرا منہ تو چوم لو۔"

دیمیطر لیس نے دائیں ٹانگ پھیلائی اور تھکے ہوئے زانو کو خم کیا۔ پھر اس نے کم عمر نازنین کو اٹھایا' خود کھڑا ہوا' اپنے لباس کے جھول ٹھیک کئے اور نرمی سے کہا: "نہیں! خدا حافظ۔" اور وہ چپ چاپ مڑ گیا۔

زرینہ حیرت کے مارے منہ کھولے کھڑی کی کھڑی رہ گئی' اس کی بانہیں سست سے انداز میں ہل رہی تھیں۔

"یہ کیا کہا' یہ کیا کہا تم نے؟"

دیمیطر لیس نے آواز بلند کئے بغیر دہرا کر کہا: "میں نے کہا تھا' خدا حافظ۔"

"لیکن تمہی تو تھے کہ تم نے۔۔۔۔۔۔"

"ہاں' میں نے وعدہ جو کیا تھا۔"

"تو پھر اب۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا بات ہوئی۔"

"تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے' مجھے اب اس کی پروا نہیں رہی' یہ معمہ تم خود ہی سوچ بچار کے بعد حل کرو' جو تم نے کہا ہے' اگر وہ سب سچ ہے تو دیر تک تم اپنے تصورات میں اسیر رہو گی اور یہ بات خوب موقع پر ہوئی' اب کم از کم کوئی بات تو ہے نا

جس کے متعلق تم سوچ بچار کرتی رہو گی۔۔۔ خدا حافظ۔"

"دمیطر لیس کیا کہہ رہے ہو' اس طرح' اس لہجے میں کیوں بات کرتے ہو' تمہی ہو' اس طرح کی باتیں کرنے والے! مجھے سمجھاؤ تو سہی ہو کیا گیا' اس طرح تو میں پگلی ہو جاؤں گی۔"

کیا بار بار وہی باتیں کئے جاؤں' ہاں میں نے شیشہ چرایا' ہاں میں نے مندر کے بڑے پجاری کی بیوی طونیہ کو مار ڈالا تاکہ کنگھی تمہیں مل جائے' ہاں' میں نے دیوی کے گلے سے ست لڑا ہار اتار لیا اور میں ہی نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تم مجھے ایک چیز بخش دو گی تو یہ تمام چیزیں تمہیں نذر کر دوں گا۔ تم نے اس چیز کی بڑی قیمت لگائی تھی' ہے نا؟ خیر اب میں اس چیز کو اتنا قیمتی تصور نہیں کرتا' اور میں تم سے کچھ نہیں مانگتا' میں تو حیران ہوں کہ اس سیدھی سی بات کا مطلب تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔"

"مجھے تمہارے تحفے نہیں چاہئیں' کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے ان تحفوں کا خیال ہے' کیا میں نے تم سے وہ تحفے مانگے ہیں؟ تم کیا سمجھتے ہو' میں ان تحفوں کو لے کر کیا کروں گی؟ میں تو صرف تمہیں چاہتی ہوں۔"

"ہاں' ہاں' میں یہ بات جانتا ہوں لیکن میں پھر کہتا ہوں کہ میں اب تم سے کچھ نہیں چاہتا' ملاقات کے لئے عاشق' معشوق دونوں کی رضامندی ضروری ہے اور اگر میرا نقطۂ نظر یہی رہا جو اب ہے تو ہماری ملاقات شاید ہی ہو۔ یہی بات میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جہاں تک ہو سکتا ہے کھلے کھلے' صاف صاف الفاظ میں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میری سلاست ناکافی ہے' کیا کروں اس سے زیادہ صفائی بیان پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لئے عرض کرتا ہوں کہ جو حقیقت میں بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اسے مانتے ہی بن پڑے گی' تو پھر سہج سبھاؤ سے مان ہی لو۔ وہ بات دریافت کرنے کی کوشش نہ کرو جو تمہیں اس لیے پراسرار معلوم ہوتی ہے کہ تمہارے خیال میں اس کا ہونا ذرا ممکن نہیں ہے' مجھے اس بات کی بڑی فکر ہے کہ یہ بحث ختم ہو جائے' اس کا انجام اچھا نہ ہو گا اور شاید ایسا ہو جائے کہ میں کوئی ایسی بات کہہ دوں جو ناشائستہ ہو۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ لوگ میرے خلاف تمہارے کان بھرتے رہے ہیں۔"

"نہیں"

''اونہہ' میں دیکھ جو رہی ہوں' ضرور کسی نے تمہارے کان بھرے ہیں' اب انکار سے کیا فائدہ ہے' کیا بری بری باتیں کہی ہوں گی' میرے دشمن بھی تو بڑے خوفناک آدمی ہیں' دیمیطر لیس ان کی باتوں پہ کان نہ دھرو۔ مجھے تمام دیوتاؤں کی قسم ہے' وہ سب بہتان باندھتے ہیں۔''

''میں ایسے آدمیوں سے شناسا نہیں ہوں۔''

''میرا اعتبار کرو' پیارے' میری بات کو سچ سمجھو! میں تو تم سے' صرف تمہی کو چاہتی ہوں' پھر بھلا مجھے کیا ضرورت ہے کہ تمہیں دھوکا دوں' تم پہلے مرد ہو جس سے میں نے اس طرح بات کی ہے۔''

دیمیطر لیس نے زرینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور پھر کہا؛ ''وہ وقت گزر گیا' میں تمہاری محبت سے لذت یاب ہو چکا ہوں۔''

''تمہارا دماغ پھر گیا ہے' کب؟ کہاں؟ کس طرح؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں' تمہاری خواہش کے خلاف میں تم سے لذت یاب ہو چکا ہوں' بغیر شعور کے' تم مجھے خواب میں اس سرزمین کی طرف لے گئیں' جہاں تم جانا چاہتی ہو' اور تم کتنی حسین معلوم ہوتی تھیں' ہائے! زرینہ تم کتنی حسین معلوم ہوتی تھیں' اور میں اس سرزمین سے واپس آگیا ہوں' کوئی انسان اب مجھے اس سرزمین کی طرف واپس جانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ ایک ہی واقعہ دوبار یکساں مسرت کا احساس پیدا نہیں کر سکتا۔ میں اتنا دیوانہ بھی نہیں ہوں کہ اس واقعے کی میٹھی یاد کو برباد کر دوں۔ تم شاید کہو یہ میٹھی یاد تمہیں میں نے بخشی ہے' لیکن میں تمہارے سائے سے محبت کرتا تھا' اس لئے مجھے امید ہے کہ تم مجھے اس بات پر مجبور نہ کرو گی کہ اس سائے کے 'شخص' (ا) کا شکریہ ادا کروں (یعنی تمہارا)۔''

زرینہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''اے ہے گھن آتی ہے' یہ بات سن کر' گھن آتی ہے۔ اور تم کو یہ جرأت ہوئی کہ یہ واقع بیان کرو اور تم تو خوش بھی ہو؟''

''تم تو نتیجہ نکالنے میں بہت جلدی کر رہی ہو' میں نے کہا تھا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے' کیا تمہیں یقین ہے کہ میں سو رہا تھا' میں نے کہا تھا کہ میں خوش تھا' کیا تمہارے خیال میں خوشی اسی عامیانہ مجلسی لذت کا نام ہے' جو اپنے قول کے مطابق تم بڑی خوبی سے پیدا کر سکتی ہو' لیکن جس میں تنوع پیدا کرنا تمہارے بس کا روگ نہیں

کیونکہ ہر عورت جسے تسخیر کیا جاتا ہے اس قسم کی لذت بخش سکتی ہے۔ نہیں' یہ نامناسب وضع اختیار کر کے تم اپنی توہین کر رہی ہو۔ مجھے تو اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ تم ان تمام لذتوں سے پوری طرح باخبر نہیں ہو جو تم پیدا کر سکتی ہو۔ جو مختلف عورتیں مرد کی محبوب ہوتی ہیں ان میں فرق تو صرف اتنا ہوتا ہے کہ ہر عورت کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ ہر عورت نرالے ہی رنگ سے اس کھیل کی تیاریاں کرتی ہے اور پھر سب سے انوکھی وضع میں اس کھیل کو ختم بھی کرتی ہے' ورنہ یہ کھیل جیسا ضروری ہے ویسا اکتا دینے والا بھی تو ہے۔ اگر یہ کھیل کھیلنا ہی ہمارا مقصد ہوتا تو پھر سب گن پوری (ہمہ صفت موصوف) محبوبہ کی تلاش میں جو ہم زحمت برداشت کرتے ہیں وہ اکارت ہی جاتی' اور تم باقی سب عورتوں سے بڑھ چڑھ کر اس کھیل کی تیاری اور تکمیل میں طاق ہو۔ کم از کم مجھے یہ خیال کر کے خوشی ہوتی ہے اور شاید یہ بات تم مان ہی لو گی کہ جس شخص نے اپنے تخیل کے زور سے زہرہ کو بہ ایں شانِ جمال دیکھ لیا ہو کہ اس کا مندر والا بت تراش کر رکھ دیا ہو وہ تصور میں تمہیں بھی پوری نسوانی رعنائی کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ کوئی رات کا خواب یا دن کا فریبِ خیال نہ تھا۔ بس یہ کافی ہے کہ خواب تھا یا خیال' ایک عجیب فضا میں' ایک عجیب پس منظر کے سامنے تمہاری تصویر نمودار ہوئی۔ تم کہو گی وہم! لیکن زرینہ میں تمہیں کبھی اجازت نہ دوں گا کہ وہم کے اس طلسم کو پارہ پارہ کر دو۔"

"اور میں کیا کروں' مجھے بھی تو بتاؤ' میں کہاں جاؤں' مجھے ابھی تک تم سے عشق ہے' خواب کی ان گھناؤنی باتوں کو سن کر بھی میری محبت کم نہیں ہوئی۔ کیا مجھے تمہارے گھناؤنے خواب کی خبر تھی۔ کیا اس لذت میں میرا بھی کچھ حصہ تھا جس کا تم ذکر کرتے ہو' اور جو گویا تم نے مجھ سے چرالی ہے۔ ایسا لو بھی عاشق کسی نے سنا ہے کہ اپنی معشوقہ کو رِجھانے کی پروانہ کرے اور خود اکیلا ہی اکیلا مزے لوٹ لے۔ اس طرح تو میں پگلی ہو جاؤں گی' پگلی ہو جاؤں گی۔"

دیمیطر لیس نے طنز کا لہجہ ترک کر دیا اور ذرا لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "بتاؤ' جب میرا دل جذبات کی آگ میں بھسم ہو رہا تھا' اور مجھ پر ایک دیوانگی کا سا عالم طاری تھا' اور تم نے ضد کر کے مجھ سے تین جرم کرنے کا وعدہ لیا تھا اور جرم بھی ایسے جو مجھے برباد کر سکتے تھے اور جن کی یاد میرے سر کو سہ گونہ ندامت کے بوجھ تلے دبائے رکھے گی' تو

کیا تم نے میرا خیال کیا تھا۔"

"میں نے یہ وعدہ اس لئے لیا تھا کہ تم میرے ہو جاؤ' اگر میں تمہاری ہو جاتی تو تم میرے کبھی نہ ہوتے۔"

"خوب تو پھر تمہیں مطمئن ہو جانا چاہئے' میں تمہارا ہو گیا تھا' بہت عرصہ کے لئے نہیں' لیکن کچھ دیر کے لئے۔ میں غلام کی طرح تمہاری خواہشوں کی زنجیروں میں اسیر تھا' یہی تم چاہتی بھی تھیں' لیکن اب اجازت دو کہ میں ان زنجیروں کو توڑ ڈالوں۔"

"دیمیطر لیس' میں تمہاری کنیز ہوں۔"

ہاں تم کنیز ہو گی یا میں غلام ہوں گا' ایسا ہی ہوتا ہے' اگر ہم میں سے ایک کو بھی دوسرے سے عشق ہے تو ایسا ہی ہو گا۔ غلامی' غلامی' غلامی' یہی محبت کا صحیح نام ہے' تم کیا' سب عورتیں ایک ہی قسم کا خواب دیکھتی ہیں۔ تم سب کے دماغ میں ایک ہی قسم کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اپنی کمزوری کے ہر ہتھیار سے کام لے کر مرد کی طاقت کو پارہ پارہ کر دینا' اپنی نا سود مندی کے حربہ سے کام لے کر مرد کی عقل کو مغلوب کر لینا۔ جونہی عورتوں کی چھاتیاں ذرا ابھرتی ہیں تو ان کا جی نہیں چاہتا کہ وہ کسی کی ہو رہیں یا کسی کو اپنا کر رکھیں۔ نہیں' وہ چاہتی ہیں کہ کسی مرد کو اپنی نوکِ پاء سے باندھ لیں' اس کو ذلیل کر دیں' اس کا سر جھکا دیں' اور اس پر اپنے پاؤں رکھ دیں۔ اور پھر عورتیں اس قابل ہو جاتی ہیں کہ اپنی معیاری آرزو کو پورا کر سکیں۔ مرد کے ہاتھ سے تلوار یا تیشہ یا قطب نما چھین لیں۔ ہیرا کلیس کو تکنی کا ناچ نچا دیں اور اسے اون کاتنے پر مجبور کر دیں۔ لیکن اگر تم کسی مرد کا سر نہیں جھکا سکتیں' یا اس کی قوت ارادی کو مغلوب نہیں کر سکتیں تو پہلا مرد جو تمہیں جوتا لگاتا ہے تم اس کی پرستش کرتی ہو۔ وہ زانو جو تمہیں زمین پر گرا دیتا ہے' وہ منہ جس میں سے تمہارے لئے گالیاں نکلتی ہیں' تمہارا معبود ہو جاتا ہے' جو مرد تمہارے ننگے پاؤں کا بوسہ لینے سے انکار کرتا ہے اور جبراً تم سے لذت یاب ہوتا ہے' وہی تمہاری تمام آرزوؤں کو پورا کر سکتا ہے۔ جب تم گھر چھوڑ کر جانے لگو اور کوئی مرد ٹسوے نہ بہائے تو وہ تمہیں چٹیا سے پکڑ کر واپس لا سکتا ہے۔ تمہاری محبت از سر نو تمہارے آنسوؤں سے پیدا ہوتی ہے۔ جب عورت کسی مرد کو اپنا غلام نہیں بنا سکتی تو محبت میں صرف ایک بات اسے خوش رکھ سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ خود کسی مرد کی کنیز

ہو جائے۔"

"ہائے' مارو! دیمیطر لیس مجھے مارو' لیکن پھر پیار بھی کرو۔" زرینہ نے اس طرح ناگہاں دیمیطر لیس کا بوسہ لے لیا کہ اسے اپنے ہونٹوں کو بچانے کا موقع ہی نہ ملا۔ اس نے اپنے آپ کو زرینہ کی بانہوں کی گرفت سے چھڑا لیا' اور پھر کہا: "میں تم سے نفرت کرتا ہوں' خدا حافظ۔"

لیکن زرینہ نے اس کا لبادہ تھام لیا۔ اس نے کہا "جھوٹ نہ بولو' دیمیطر لیس! تم تو میری پرستش کرتے ہو' تمہاری روح میرے عشق سے لبریز ہے' لیکن تمہیں یہ بات مانتے ہوئے شرم آتی ہے۔ سنو' پیارے میری بات سنو! اگر اس طرح تمہارے غرور کو تسکین ہوتی ہے اور میں تمہیں اپنا سکتی ہوں تو جو کچھ میں نے تم سے مانگا تھا' میں اس سے زیادہ دینے کے لئے تیار ہوں۔ تم جو کہو کروں گی اور یہ قربانی کرنے کے بعد' تمہیں پا لینے کے بعد کبھی گلہ نہ کروں گی۔"

دیمیطر لیس نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور جس طرح ساحلِ بحر پر زرینہ نے آج سے دو دن پہلے کہا تھا' آج دیمیطر لیس نے کہا: "قسم کھاؤ گی؟"

"زہرہ کی؟"

"تمہارا زہرہ پر اعتقاد کب ہے' یہوداہ کی قسم کھاؤ۔"

جلیلوی نازنین کا رنگ فق ہو گیا۔

"ہم لوگ یہوداہ کی قسم نہیں کھاتے۔"

"تو انکار ہوا نا!"

"یہ قسم بڑی خوفناک ہے۔"

"مجھے اسی کی ضد بھی ہے۔"

کچھ وقت کے لیے زرینہ متأمل رہی پھر ہلکی آواز میں بولی: "میں یہوداہ کی قسم کھاتی ہوں۔ کیا چاہتے ہو دیمیطر لیس؟"

نوجوان خاموش رہا۔

زرینہ نے کہا: "کہو پیارے' بولو' جلدی بتاؤ' میں سہم گئی ہوں۔"

"کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

"میں یہ نہیں چاہتا کہ تم مجھے تین تحفے دو' میرے تحفے تو نایاب تھے' میں تین

معمولی تحفے بھی نہیں مانگتا' جو کچھ ہو گیا اب اس کا کیا ذکر' لیکن میں یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ تم میرے تحفوں کو قبول کرو۔"

"زرینہ نے خوش ہو کر کہا: "ہاں! کیوں نہیں۔"

دیمیطر لیس بولا "تمہارا یہ خیال نہ تھا کہ تم یہ شیشہ' کنگھی اور ہار استعمال کر سکو گی جن کے لئے تم نے مجھے حکم دیا تھا۔ چوری کا شیشہ' ایک مقتول عورت کی کنگھی' ایک دیوی کا ست لڑا ہار۔ ان جواہرات کی نمائش ذرا مشکل ہے۔ کیوں ہے نا؟"

"بالکل! یہ کیا سوچ رہے ہو؟"

"میرا بھی یہی خیال تھا' تو گویا تم نے یونہی تفریحاً ظلم ڈھانے کے لئے تین جرم کروائے تھے' جن سے آج سکندریہ گونج رہا ہے۔ خیر! تو۔۔۔ لو اب ان چیزوں کو تمہیں پہننا پڑے گا۔

جس مختصر چار دیواری والے باغ میں ہر میز کا بت ہے تم وہاں جاؤ گی' وہ جگہ ہمیشہ سنسان رہتی ہے۔ کوئی تمہاری خلوت میں خلل انداز نہ ہو گا۔ دیوتا کی بائیں ایڑی اٹھا کر دیکھو گی' پتھر ٹوٹا ہوا نظر آئے گا' وہیں اس پتھر کے چبوترے میں تم بیقس کا شیشہ دیکھو گی' یہ تم اپنے ہاتھ میں تھام لو گی' وہیں ملکہ نطاقریط کی کنگھی ملے گی' یہ تم اپنے بالوں میں لگا لو گی' وہیں دیوی استرتی کا ست لڑا ہار ملے گا' یہ تم گلے میں ڈال لو گی۔ اس طرح آراستہ ہو کر حسین زرینہ' تم شہر میں سے گزرو گی' لوگ تمہیں پکڑ کر ملکہ کے سپاہیوں کے حوالے کر دیں گے' لیکن تمہاری آرزو تو پوری ہو جائے گی نا! اور طلوعِ آفتاب سے پہلے میں قید خانے میں تم سے ملنے آؤں گا۔"

حوالہ جات

(۱) شخص: سایہ کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو مولانا روم کا مصرعہ ع

تن بود چو سایہ و جاں شخص آں۔

پانچواں باب

ہرمیز(۱) کا باغ

عقل ہے اپنی خطاؤں پر بھی اترائی ہوئی

پہلے تو زرینہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شانوں کی ایک بے پروایانہ حرکت کے ساتھ اس تجویز کو بھول جائے۔ وہ اتنی احمق نہ تھی کہ اپنے وعدے پر قائم رہتی، لیکن پھر خیال آیا کہ چل کر دیکھ تو لوں، لمحہ بہ لمحہ اس کا اشتیاق بڑھتا چلا جا رہا تھا اور گویا اسے کشاں کشاں اس زمینِ پر اسرار کی طرف لئے جا رہا تھا، جہاں دیمیطر لیس نے اپنے جرموں سے حاصل کردہ مالِ غنیمت کو پوشیدہ کیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ان تحفوں کو اٹھا کر دیکھے، انہیں چھوئے، آفتاب کی تابش میں ان کو چمکتا ہوا دیکھے، ایک لمحہ کے لئے ان کو اپنے قبضے میں رکھے۔ وہ ایسا محسوس کرتی تھی کہ اس نے اپنی بلند نظری کے انعام کو حاصل نہ کیا تو اس کی فتح دراصل نامکمل رہے گی، باقی رہا دیمیطر لیس تو اس کا کیا ہے، اسے پھر جُل دے کر موہ لیا جائے گا، اس کا خیال تھا کہ جو آگ دیمیطر لیس کے سینے میں بھڑک رہی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ بجھ کر پھر روشن نہ ہو سکے۔ جن عورتوں سے آدمی دل و جان سے محبت کر چکتا ہے ان کی یاد حافظہ پر ثبت ہو جاتی ہے، گویا ان تأثرات کا جزو بن جاتی ہے، جن کو دماغ معمولی واقعات میں سے انتخاب کر لیتا ہے۔ اور جب ہم اپنی پرانی معشوقہ سے ملتے ہیں تو ہم اس کو بھول ہی کیوں نہ چکے ہوں، اس سے نفرت ہی کیوں نہ کرتے ہوں، پھر بھی ہمارے دل میں غیر متوقع اضطراب کی سی

کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ وہ خاکستر ہے جس میں محبت کی چنگاری از سرِ نو پیدا کی جا سکتی ہے۔ زرینہ اس نقطے سے باخبر تھی' وہ خود بھی اس آدمی کو فتح کرنے کے لئے بے تاب و بے قرار تھی جس سے اس نے عمر میں پہلی بار محبت کی تھی' لیکن اتنی پگلی بھی نہیں تھی کہ جس شخص کو کسی طرح معمولی طریقوں سے پھسلایا جا سکتا ہو اس کو اپنی جان دے کر خرید لے' لیکن۔۔۔ اس نے کیسا شیریں انجام تجویز کیا تھا' تمام باشندوں کے سامنے کھڑا ہونا' اس طرح کہ ہاتھ میں وہ پرانا شیشہ ہو جس میں سیفو اپنا عکس دیکھا کرتی' بالوں میں وہ کنگھی ہو جو ملکہ نطاقریط کے شاہوار بالوں کی زینت تھی اور چھاتیوں پر ان بحری موتیوں کا ست لڑا ہار ہو جو استرتی زائیدۂ کفِ دریا کے محملِ بحری میں سے بر آمد ہوئے تھے۔ پھر صبح سے لے کر شام تک یہ دیکھنا کہ دیوانہ وار محبت ایک عورت کے ساتھ کیا کر سکتی ہے اور شام کے قریب کوشش و اضطراب کے بغیر مر جانا کیسا بے مثال انجام تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

لیکن نہیں۔۔۔۔۔۔ وہ اس آزمائش میں مبتلا نہ ہو گی۔ وہ خطِ مستقیم ریکاٹس میں سے گزرتی ہوئی اس شاہراہ پر ہو لی جو عظیم الشان سرا پیوں کی طرف جاتی ہے' یہ شاہراہ یونانیوں نے تراشی تھی اور شہر کے اس حصے میں جو پیچدار گلیوں پر مشتمل تھا' اس شاہراہ کا وجود ایک تعجب خیز نوعیت رکھتا تھا۔ یہاں دو قومیں حیرت انگیز طور پر مختلط ہو گئی تھیں لیکن اس اختلاط میں ابھی تک نفرت کا رنگ شامل تھا۔ مصریوں کی نیلگوں قمیضوں کے مقابلے میں یونانیوں کی نشستہ قبائیں سفیدی مائل داغوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ زرینہ تیزی سے جا رہی تھی۔ وہ اس گفتگو سے بے خبر تھی جس کا موضوع وہ تین جرائم تھے جو اس کی خاطر کئے گئے تھے۔

ہیکل کی سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر وہ دائیں طرف مڑ گئی۔ ایک تاریک گلی میں سے گزری' پھر دوسری میں سے' جس میں مکانوں کی چھتیں گویا اوپر ایک دوسرے کو چھو رہی تھیں۔ پھر ایک ستارہ مثال چوک طے کر کے رک گئی۔ یہاں چمکتی دھوپ میں دو سانولی سلونی سی لڑکیاں ایک فوارے سے کھیل رہی تھیں۔

ہر میز کا باغ' دراصل ایک چھوٹا سا قبرستان تھا' جو دیر سے ویران پڑا تھا۔ گویا ایک سنسان قطعہ زمین تھا' جہاں اب لوگ اپنے رشتہ داروں کی قبروں پر عطریات و

روغنیات چڑھانے کے لئے بھی نہیں آتے تھے۔ ادھر سے گزرنے والے بھی اس قبرستان سے بچ کر گزرتے تھے۔

شکستہ وریختہ سنگ ہائے مزار میں گویا گہری خاموشی محوِ خواب تھی اور زرینہ اس خاموشی کو طے کرتی ہوئی جارہی تھی لیکن جب کوئی سنگ ریزہ اس کے قدموں کے نیچے آکر صدا پیدا کرتا تھا تو وہ سہم سہم جاتی تھی۔ ہوا میں ابھی تک ریت کے باریک ذرے ملے ہوئے تھے' جھونکوں سے زرینہ کی کنپٹیوں کے قریب کے بال متحرک ہو گئے تھے اور اس کا ارغوانی دوپٹہ توتِ انجیر کے سفید پتوں کی طرف اڑا جاتا تھا۔

اس نے دیکھا کہ بت تین سنگ ہائے مزار کے وسط میں نصب ہے جو ایک مثلث کی طرح محیط ہیں۔ یہ جگہ کسی مہلک راز کی پردہ داری کے لئے خوب موزوں تھی۔ وہ احتیاط سے تنگ پتھریلے راستے سے داخل ہوئی۔ بت کو دیکھ کر اس کا رنگ زرد پیلا پڑ گیا۔

بھیڑیئے کے سر والا دیوتا اس طرح کھڑا تھا کہ دائیں ٹانگ آگے بڑھی ہوئی ہے' سر پر ایک شال سی ہے جو اتنی لمبی ہے کہ اس کے شگافوں میں سے ہاتھ باہر نکلے ہیں۔ تنے ہوئے بدن کے اوپر' سر آگے کی طرف جھکا ہے گویا دیوتا اپنے ہاتھوں کی حرکات کا مشاہدہ کر رہا ہے جو حنوط کے عمل میں مصروف ہیں' بایاں پاؤں اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔

زرینہ نے سہم کر ہولے ہولے اِدھر اُدھر دیکھا اور اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ وہ تنہا ہے۔ اس کے عقب سے آواز جو آئی تو وہ کانپنے لگی۔ ایک سبز گرگٹ سنگ مرمر کے ایک شگاف میں داخل ہو رہا تھا۔ آخر کار اس نے دل کڑا کر کے بت کا ٹوٹا ہوا پاؤں پکڑ کر بڑی مشکل سے ترچھا کر کے اٹھایا لیکن ساتھ ہی پتھریلے چبوترے پر جو کھوکھلا ٹکڑا تھا وہ بھی اٹھ آیا۔ ناگاہ پتھر کے نیچے اسے بڑے بڑے موتی چمکتے ہوئے نظر آئے۔

اس نے ہار نکال لیا۔ کتنا بوجھل تھا! اسے گمان بھی نہ تھا کہ جڑاؤ کام کے بغیر موتی اتنے وزنی ہوں گے۔ ان چھوٹے چھوٹے کُروں کی گولائی حیرت انگیز تھی اور ان میں چاند کی سی چمک تھی' جس طرح ستاروں کے نور سے روشن سطحِ آب پر دائرہ نما

بادل ہوتے ہیں اسی طرح ساتوں لڑیوں میں سے ہر لڑی دوسری سے بڑا دائرہ بناتی تھی۔

اس نے ہار گلے میں ڈال لیا اور احتیاط سے لڑیوں کو پھیلا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ جسم پر ان کی خنکی کے تاثر کو اچھی طرح محسوس کر سکے۔ اس نے ساتوں لڑیوں کو تناسب سے اپنے ننگے سینے پر ترتیب دے لیا اور درمیانی موتی کو اس وادیٔ گرم پر آویزاں کر دیا جو اس کی چھاتیوں کے درمیان واقع تھی۔

پھر اس نے ہاتھی دانت کی کنگھی اٹھائی، کچھ دیر دیکھتی رہی، نازک سے بالائی حصے پر جو سفید بت کی تصویر کھدی تھی اس پر ہاتھ پھیرتی رہی اور یہ فیصلہ کرنے سے پہلے کہ کنگھی کو کہاں ہونا چاہئے اس مرصع شے کو کئی بار اپنے بالوں میں الجھا الجھا کر دیکھتی رہی۔

آخر کار اس نے چاندی کا شیشہ نکالا، اس میں اپنا عکس دیکھا اور اپنی شانِ فتح مندی۔ اس کی آنکھیں غرور سے ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں، اس کے شانے دیوتاؤں کے مالِ غنیمت سے آراستہ تھے۔

اس نے اپنے آپ کو نوکِ پا سے بُنِ مو تک ازغوانی شال میں لپیٹ لیا اور وہی خوفناک زیورات پہنے قبرستان سے واپس آئی۔

حوالہ جات

(۱) ہرمیز؛ شاہراہوں کھیل کود اور جوئے کا دیوتا۔ مصری اسے روحِ انسانی کے سفر سے منسوب کرتے تھے۔

چھٹا باب

دیوارہائے ارغوانی

بلائیں ان کی لے آ کر بلائیں سر سے پاؤں تک

جب دیوداسیوں کے منہ سے لوگوں نے دوبارہ دیوی کی بے حرمتی کی تصدیق سن لی تو وہ آہستہ آہستہ باغوں میں پھیل گئے۔ زیتون کے سیاہ درختوں کے درمیان جو روشیں تھیں ان پر سینکڑوں کسبیاں جمع تھیں۔ کچھ اپنے سر پر راکھ ڈال رہی تھیں، کچھ مٹی پر ماتھا رگڑ رہی تھیں، بال نوچ رہی تھیں اور کچھ اس مصیبت عظمیٰ کے ماتمی نشان کے طور پر ناخنوں سے اپنی چھاتیاں کھرچ رہی تھیں، بعض بانہوں پر آنکھیں رکھے رو رہی تھیں۔

ڈرموز میں سے ہوتا ہوا، بندرگاہ کے پاس سے گزرتا ہوا ہجوم چپ چاپ شہر کی طرف واپس جا رہا تھا۔ عالمگیر نالہ وماتم کی وجہ سے لوگ باگ خوفزدہ تھے، سہمے ہوئے دکانداروں نے جلدی سے اپنے رنگ رنگ کے تختے اندر رکھ لئے تھے اور بے روزن مکانوں کی زمینی منزلیں بند دروازوں کی وجہ سے یک آہنگ احاطے کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ بندرگاہ کے قریب زندگی کے آثار گم ہو چکے تھے اور ملاح گالوں پر ہاتھ رکھے چپ چاپ پتھروں پر بیٹھے تھے، جو جہاز لنگر اٹھانے کے لئے تیار تھے ان کے پتوار بھی اٹھا کر اندر رکھ لئے گئے تھے۔ ان کے نوک دار بادبان ہوا میں جھومتے ہوئے ستونوں کے ساتھ باندھ دیئے گئے تھے۔ جو جہاز بندرگاہ میں داخل ہونا چاہتے تھے وہ ساحل سے ذرا

دور سرکاری افسروں کے نشانات کا انتظار کر رہے تھے اور کچھ مسافر جن کے رشتہ دار ملکہ بیرینس کے ملازم تھے انقلاب اور خونریزی کا گمان کر کے جہنمی دیوتاؤں کی درگاہ میں قربانیاں کر رہے تھے۔

جزیرۂ مینارِ نور' اور ساحل مہتابی کے کونے پر روڈس نے ناگاہ دیکھا کہ ہجوم میں زرینہ اس کے پاس کھڑی ہے۔

''اوہ زرینہ' میرا خیال رکھنا' میں تو سہم گئی ہوں' مرطس میرے پاس ہے تو سہی' لیکن ذرا دیکھنا لوگ باگ کتنے جمع ہیں' ڈرتی ہوں کہیں ہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جائیں' ہمارے ہاتھ تھام لو''۔

مرطس نے کہا کچھ تمہیں پتہ بھی ہے' ہو کیا گیا؟ کچھ خبر ہے یہ کس کا کام ہے' اسے ابھی شکنجے میں کسا کہ نہیں؟ ہیروستراتس (۱) کے وقت سے ایسی بات کبھی نہ ہوئی تھی دیوتا تو ہمیں چھوڑ کر کہیں چلے گئے' دیکھئے کیا حشر ہوتا ہے ہمارا۔''

زرینہ چپ رہی۔

کم عمر بنسی بجانے والی نے کہا؛

''ہم نے فاختہ کا جوڑا دیوی کی نذر کیا تھا' دیکھیں اسے یاد رہتا ہے کہ نہیں دیوی تو جھلا رہی ہو گی اور تم بتاؤ زرینہ! بچاری زرینہ!! تمہیں تو آج بڑا خوش ہونا تھا نا؟ یا طاقت والی!''

کسبی نے کہا ''سب کچھ ہو چکا۔''

''کیا کہا تم نے''۔

زرینہ دو قدم پیچھے ہٹی اور دایاں ہاتھ اپنے لبوں پر رکھ لیا۔

''دیکھو روڈس خوب غور سے دیکھو' دیکھو مرطس تم آج وہ نظارہ دیکھو گی جو اس دن سے لے کر جب دیوی خود کوہ اڈا پر اتری تھی آج تک کسی بشر کی آنکھوں نے نہیں دیکھا اور جب تک دنیا قائم ہے ایسا نظارہ پھر دیکھنے میں نہ آئے گا۔''

دونوں سہیلیاں حیران ہو کر پیچھے ہٹیں۔ گویا زرینہ کو پگلی خیال کرتی ہیں لیکن زرینہ اپنے خواب میں مدہوش مینارِ نور کی طرف جا رہی تھی جو مرمر فروزاں کا ہشت پایہ عظیم الشان مسدس تھا۔ اس نے برنز کا دروازہ کھولا اور عام بے پروائی کی رو سے فائدہ اٹھا کر اندر سے بند کر دیا اور گونجتی ہوئی سلاخیں گرا دیں۔

کچھ منٹ گزر گئے۔ ہجوم اس طرح بے چین اور مضطرب تھا۔ سمندر کے مترنم ہلکوروں کی آواز میں زندہ لوگوں کی آواز مل گئی تھی۔ ناگہاں ایک آواز آئی اور پھر لاکھوں آدمیوں نے دوہرا کر وہی نعرہ بلند کیا؛

"افرودیتی"

"افرودیتی"

بجلی کے کڑے کی طرح شور پیدا ہوا۔ مینارِ نور کی دیواروں کے نیچے گویا ایک پوری قوم کی مسرت اور ولولہ ایک ناقابل بیان لذت بخش ہنگامے کی شکل میں گیت کی طرح گونج رہا تھا۔ لوگوں کا وہ سیلاب جو مہتابی پر رواں تھا اب تیزی سے جزیرے کی طرف مڑ گیا پتھروں پر چڑھ گیا' مکانوں کی چھتوں پر جا پہنچا' نشان والے مستولوں' مسلح برجوں کو چھونے لگا۔ جزیرے پر تل رکھنے کو جگہ نہ تھی' لیکن ہجوم تھا کہ بڑھتا ہی چلا جاتا تھا گنجان ہوتا جاتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا کسی دریا میں طغیانی آگئی ہے اور اس کی لہریں کسی بلند دشوار گزار ڈھلوان پر سے آدمیوں کی طویل قطاروں کو سمندر میں پھینک رہی ہیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی عورتوں اور مردوں کا دریا موجزن تھا۔ بطلیموس کے محل سے لے کر نہر کے کنارے تک' بابِ شاہی تک' بڑی بندرگاہ تک' یوراسٹس تک' آدمیوں کا ایک سوادِ عظیم تھا جس میں پاس کے محلوں سے برابر آدمی آکر شامل ہو رہے تھے۔ بانہوں اور چہروں کے اس متموج ہجوم پر' اس وسیع سمندر کے پھیلتے ہوئے بھنور پر' ملکہ بیرینس کا زرد پروں والا محمل اس طرح رواں تھا جس طرح کشتی ہچکولے کھا رہی ہو اور لمحہ بہ لمحہ' جوں جوں یہ خبر پھیلتی جاتی تھی' ہجوم کا شور ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

ہیلن (۲) کو جنگِ تراجنہ کے انجام پر فرانی (۳) کو الیوسس کی لہروں پر اور تائیس (۴) کو اضطخر (۵) کے جلانے پر یہ احساس فتح مندی' یہ شانِ کامرانی حاصل نہ ہوئی ہوگی۔

مغربی دروازہ سے گزر کر زرینہ اس سرخ عمارت کی پہلی مہتابی پر ظاہر ہوئی وہ دیوی کی طرح بالکل عریاں تھی۔ ایک ہاتھ میں ارغوانی دوپٹے کا ایک سرا' دوسرے ہاتھ میں دوسرا سرا' ہوا اس دوپٹے کو شام کی فضائے آسمانی کی طرف اڑائے لئے جاتی تھی۔ دائیں ہاتھ میں شیشہ تھا جس میں غروب ہوتا ہوا آفتاب منعکس تھا۔

آہستہ آہستہ سر جھکائے بہ انتہائے جلال و غایتِ جمال' ایک شانِ بے مثال کے ساتھ وہ باہر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جو بلند پایہ' شنگرفی برج کے ارد گرد پیچ کھاتی ہوئی اوپر جاتی تھیں۔ اس کا دوپٹہ شعلے کی طرح لرزاں تھا۔ ڈوبتے سورج کے آتشیں نور نے موتیوں کے ہار کو سرخ رنگ دیا تھا اور اب ہار لعل و یاقوت کا دریا معلوم ہوتا تھا۔ وہ چڑھتی رہی اور اس سیلابِ نور میں اس کے بدن کی تابناک جلد سے ہر آن ایک نئی شان کا ظہور ہوتا تھا۔ گوشت' خون' آگ' نیل' دیبائے سرخ' منور گلاب' ان تمام چیزوں کا رنگ جھلکتا تھا' ارغوانی دیواروں کے ساتھ ساتھ چکر کھاتی ہوئی وہ آسمان کی طرف صعود کر رہی تھی۔

حوالہ جات

(۱) ہیرو سٹراس ؛ ایک منچلا نوجوان، جس نے سکندریہ کی پیدائش کے دن ارتیمس دیوی کی ہیکل کو آگ لگادی۔

(۲) ہیلن ؛ مشہور قتالۂ عالم ہے جس کی وجہ سے جنگِ تراجنہ عالمِ وجود میں آئی۔ کئی شوہروں کی بیوی تھی۔

(۳) فرائنی ؛ یونان کی مشہور کسبی، جس کو نہاتے دیکھ کر مصوروں نے استرتی کا بت بنایا تھا۔

(۴) تائیس ؛ سکندر کی محبوبہ، جس نے ایران کی عظمت کو پھونک کر تماشا دیکھا تھا۔

( ) اصطخر ؛ ایران کا قدیم ترین شہر۔

حصہ پنجم

پہلا باب

شب سعادت

صدا یہ دے رہا ہے طور سے کون
کوئی کہہ دو مجھے فرصت نہیں ہے

جیل کے بڈھے داروغے نے کہا؛

"تم تو دیوتاؤں کی پیاری ہو' جو کچھ تم نے کیا ہے کہیں کسی میرے جیسے بچارے غلام نے اس کا سواں حصہ بھی کیا ہوتا تو تم دیکھتیں شکنجے میں کس دیا جاتا' الٹا لٹکا دیا جاتا' کوڑے مار مار کے پنجھا دیتے' ٹکڑے اڑا دیتے' گرم چمٹوں سے بوٹیاں نوچ نوچ لیتے' نتھنوں میں سرکہ ڈالتے' اوپر پتھر رکھ کر دم روک دیتے اور مر جاتا تو جلتے ہوئے میدانوں میں پھینک آتے کہ گیدڑ کھا جائیں۔ تم اپنی طرف دیکھو جو جی چاہا چر الیا' جس کو جی چاہا مار ڈالا' جس کی چاہی بے حرمتی کر ڈالی اور تمہیں سزا کیا ملتی ہے؟ آرام کرنے کے لئے ایک کمرہ اور میٹھا میٹھا شوکران (۱)۔ زوس کی بجلی گرے مجھ پر جو خبر ہو کہ یہ بات کیا ہوئی' محل میں تمہارے دوست ہوں گے۔"

زرینہ نے کہا "انجیریں دو مجھے میرا حلق خشک ہو گیا ہے۔"

بوڑھا غلام اس کے لئے ایک سبز ٹوکری میں ایک درجن خوب پکی ہوئی رس بھری انجیریں لایا اور پھر اسے تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔

وہ بیٹھ گئی پھر کھڑی ہوئی' کمرے میں ٹہلنے لگی' دیواروں پر ہتھیلیاں مارتی رہی۔ اسے معلوم نہ تھا وہ کیا کر رہی ہے۔ اس نے بال کھول دیئے کہ ذرا ٹھنڈے

ہو جائیں اور پھر فوراً ہی جوڑا باندھ لیا۔

اسے مجبور کیا گیا تھا کہ سفید اون کا ایک لمبا سا چغہ پہن لے۔ اس کی گرمی سے زرینہ پسینے میں نہا گئی تھی۔ اس نے بانہیں پھیلائیں۔ جمائی لی اور بلند دریچہ پر کہنیاں ٹیک لیں۔ باہر آسمان صفائے سیال کی طرح تھا اور ایسا کم رنگ و تابناک تھا کہ چاند کے سیلابِ نور میں تارے گم ہو کر رہ گئے تھے۔ آج سات سال ہوتے ہیں اسی طرح کی رات تھی جب زرینہ نے ناصرت کی سرزمین کو خیرباد کہا تھا۔ اسے یاد تھا پانچ آدمی تھے' ہاتھی دانت کے سوداگر' ان کے گھوڑوں کی دموں سے گوناگوں پھولوں کے طرے آویزاں تھے۔ وہ بچی کو گول کنویں کے پاس ملے تھے۔

اس سے پہلے وہ نیلی نیلی جھیل' وہ شفاف آسمان' وہ سرزمینِ جلیل کی نرم رَو ہوا' گھر کے چاروں طرف اور کتانِ سرخ شگفتہ تھے۔ جب وہ تتلیوں کے پیچھے دوڑا کرتی تو جھاڑیوں کے کانٹے اس کے ہاتھ میں چبھ جاتے۔ جھومتے ہوئے سبزے میں گویا ہوا کا اپنا رنگ بھی نظر آتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ان نتھرے ہوئے پانی کی نہروں میں نہایا کرتی تھیں جن کے کنارے شگفتہ گیر اس کی جھاڑیوں کے پاس سیپیاں مل جایا کرتی تھیں۔ پانی کی سطح پر بھی پھول ہی پھول تھے اور کمرِ کوہ پر بڑے بڑے سوسن کے پھول شگفتہ تھے اور سلسلہ کوہسار کا خط کسی کی نوبہار چھاتی کے خم کی طرح تھا۔

زرینہ نے ذرا مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں لیکن یہ ہلکا سا تبسم فوراً غائب ہو گیا۔ موت کا خیال اس کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ آخری لمحے تک وہ اپنے تصورات کے پھندے سے نکل نہ سکے گی۔

اس نے کہا "ہائے میں نے کیا کر دیا! میں اس مرد سے ملی ہی کیوں تھی؟ اس نے میرا کہا کیوں مان لیا؟ میں اس جال میں کیوں پھنس گئی؟ یہ کیا بات ہے کہ اب بھی اس وقت مجھے اپنے کئے کا افسوس نہیں ہے؟

خدا نے بھی میرے آگے کیا دو چیزیں رکھی ہیں۔ محبت پسند کروں تو جان سے ہاتھ دھولوں اور جان بچاؤں تو محبت سے ہاتھ دھولوں۔ میں نے کیا کیا ہے؟ کس جرم کی یہ سزا مل رہی ہے؟ یہ دکھ کیوں بھوگ رہی ہوں؟ بچپن میں کتابِ مقدس کے جو حصے اس نے سنے تھے ان کے اجزاء اسے یاد آنے لگے۔ سات سال سے اس نے کبھی ان کا خیال ہی نہ کیا تھا' لیکن آج وہ حصے اسے حرف بحرف یاد آ رہے تھے۔ اس کی زندگی

کے مطابق اس کی عقوبت کے پیش گو! وہ دبی زبان سے بولی ؛

''خداوند' رب الافواج فرماتا ہے :

''کیونکہ مدت ہوئی کہ تو نے اپنے جوئے کو پھاڑ ڈالا اور بند ھنوں کو توڑ دیا اور کہا کہ میں تابع نہ رہوں گی ہاں ہر ایک اونچے پہاڑ اور ہر ایک ہرے درخت کے تلے تو ڑنا کرنے کو لیٹی ہے''

''خداوند خدا فرماتا ہے :

اس نے کہا ہے کہ میں اپنے دھگڑوں کا جو مجھ کو روٹی اور پانی اور اون اور سن اور تیل اور شربت دیتے ہیں پیچھا کروں گی۔''

''خداوند خدا کہتا ہے :

تو کیوں کر کہتی ہے کہ میں ناپاک نہیں ہوں ؟ میں نے بعلیم کی پیروی نہیں کی ؟

وادی میں اپنی روش دیکھ اور جو کچھ تو نے کیا ہے معلوم کر۔ تو ایک تیز رو اونٹنی کی مانند ہے جو مست ہو کر ادھر ادھر دوڑتی ہے۔ مادہ گورخر کی مانند جس کی عادت ہے کہ دشت میں رہے اور جو ہوس کے مارے ہوا سونگھتی ہے' اس کی مستی کی حالت میں کون اسے پھرا سکتا ہے۔''

خداوند خدا کہتا ہے :

جب وہ مصر کی سرزمین میں چھنالا کرتی تھی' زناکاری پر زناکاری کی' سو وہ پھر اپنے ان یاروں پر مرنے لگی جن کا بدن گدھوں کا سا بدن اور جن کا انزال گھوڑوں کا سا انزال تھا۔ اس طرح سے تو نے اپنی جوانی کی شہوت پرستی کہ جس وقت مصری تیری جوانی کے پستانوں کے سبب تیری چھاتیاں ملتے تھے' پھر یاد دلائی''

زرینہ چلائی ؛

''یہ میرا ہی ذکر ہے' یہ میرا ہی ذکر ہے۔''

اور پھر خداوند کہتا ہے :

''دیکھ میں ان یاروں کو جن سے تیرا جی پھر گیا ہے بھاروں گا کہ تجھ سے مخالفت کریں اور وہ اپنے آئین کے مطابق تجھ پر حکم کریں گے اور وہ تیری ناک اور تیرے کان کاٹ ڈالیں گے اور تیرے باقی لوگ تلوار سے مارے جائیں گے''

اور پھر:

"اس لئے وہ ننگی کی جاتی' ہاں اسے لے جاتے اور اس کی لونڈیاں کبوتروں کی مانند کٹکتی ہوئی ماتم کرتیں اور چھاتی پیٹتیں"

لیکن اس نے اپنی تسلی کے لئے کہا: "کون جانتا ہے کہ خدا کا کیا مطلب ہے۔ کیا خداوند خدا یہ نہیں فرماتا:

"اور جب تمہاری بیٹیاں چھنالا کریں گی تو میں ان کو سزا نہیں دوں گا"

اور پھر کیا ایک جگہ خداوند خدا یہ نہیں کہتا:

"اپنی راہ چلا جا' خوشی سے اپنی روٹی کھا اور خوش دلی سے اپنی مے پی' کیونکہ خدا بھی تیرے کاموں کو قبول کرتا ہے۔ ہمیشہ اجلا لباس پہنے رہ اور اپنے سر کو چکناہٹ سے خالی نہ رکھ۔ اپنی بطالت کی زندگی کے سب دن جو اس نے سورج کے نیچے تجھے بخشی ہے' ہاں! اپنی بطالت کے سب دن اس جورو کے ساتھ جو تیری پیاری ہے عیش کرلے کہ اس زندگی میں اور تیری اس محنت کے درمیان جو تو نے سورج کے نیچے کی تیرا یہی بخرہ ہے کیونکہ وہاں گور میں جہاں تو جاتا ہے نہ کام' نہ منصوبہ' نہ آگاہی' نہ حکمت ہے"

وہ کانپنے لگی اور دبی زبان سے یہ الفاظ دوہرائے:

"کیونکہ وہاں گور میں جہاں تو جاتا ہے نہ کام' نہ منصوبہ' نہ آگاہی' نہ حکمت ہے"

"نور تو بیٹھا ہے اور سورج کا دیکھنا آنکھوں کو اچھا لگتا ہے"۔

اے نوجوان تو اپنی جوانی میں خوش ہو اور اپنی بلوغت کے دنوں میں اپنا جی بہلا' اور اپنے دل کی راہوں میں اور آنکھوں کی منظوری میں چل کیونکہ انسان اپنے لبدی مکان میں چلا جائے گا اور ماتم کرنے والے گلی گلی پھریں گے' پیشتر اس سے کہ چاندی کی ڈوری کھولی جائے اور سونے کی کٹوری توڑی جائے اور گھڑا چشمے پر ٹوٹ جائے اور حوض کا چرخ ٹوٹ جائے' اس وقت خاک خاک سے جا ملے گی جس طرح آگے ملی ہوئی تھی"۔

وہ پھر کانپنے لگی اور دبی زبان سے یہ لفظ دہرائے "اس وقت خاک خاک سے جا ملے گی جس طرح آگے ملی ہوئی تھی"۔

اور جب اس نے اپنے خیالات کی رَو کو روکنے کے لئے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تو اس کو ناگہاں غیر متوقع طور پر زندہ جلد کے نیچے اپنی کھوپڑی کی وہ شکل محسوس ہوئی جو موت کے بعد وہ اختیار کرے گی۔ کنپٹیوں کا خلا بڑے بڑے آنکھوں کے گڑھے غضروف کے نیچے چپٹی ناک اور آگے کو نکلی ہوئی جبڑوں کی ہڈیاں' وہ سہم گئی کیا اس کی یہ شکل ہو جائے گی۔ اس کی آنکھوں کے آگے خوفناک طور پر صاف اس کی لاش کی تصویر آگئی۔ اس نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا تاکہ اس نہایت معمولی سی بات کی جسمانی نوعیت کو سمجھ سکے جو اسے آج تک نہ سوجھی تھی یعنی یہ کہ اس کی لاش کا ڈھانچہ خود اس کے زندہ بدن کے اندر پوشیدہ تھا۔ یہ کہ لاش کا وجود موت کا نتیجہ نہ تھا' کوئی تغیر جسمی نہ تھا' کوئی انجام نہ تھا بلکہ لاش ایک چیز تھی جو آدمی اپنے ساتھ لئے لئے پھرتا تھا' ایک سایہ جو جسم انسانی سے جدا نہیں کیا جاسکتا تھا اور یہ کہ زندگی کی لڑیاں ابھی سے قبر کے نشانات جیسی تھیں۔

اس کے دل میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا ہوئی' جنوں کی حد تک پہنچی ہوئی' ہر چیز کو ایک بار پھر دیکھوں' زندگی پھر شروع کروں' ہر کام پھر کروں' موت کے خلاف بغاوت کر رہی تھی۔ اس نے اس امکان کو مسترد کر دیا تھا کہ آج جو دن چڑھ رہا ہے اس کی شام وہ نہ دیکھ سکے گی۔ اس نے اس امکان کو مسترد کر دیا تھا کہ یہ حسن' یہ جسم' یہ ذہن رسا' یہ ہوس کار نفسانیت سے پر زندگی ختم ہو جائے گی اور ایسے وقت جب لذتِ حیات اپنے نقطہ کمال پر تھی' ختم ہو جائے گی اور گل سڑ جائے گی۔

کسی نے اس طرح دروازہ کھولا کہ آواز پیدا نہ ہوئی' ڈیمیٹر یس اندر آیا۔

حوالہ جات

(۱) شوکران: Hemlock ایک زہر جسے پی کی آہستہ آہستہ بے حسی طاری ہونے لگتی ہے۔

دوسرا لباب

خاک خاک سے جا ملتی ہے

کیفیتِ روحِ پاک معلوم نہیں
حالِ دلِ دردناک معلوم نہیں
جھوٹی ہے تمام علم کی لاف زنی
خاکی انساں کو خاک معلوم نہیں

زرینہ نے چیخ کر کہا؛
"دیمیطر لیس!"
اور جھپٹ کر آگے بڑھی۔ لیکن کم عمر صناع نے احتیاط سے دروازے کو بند کیا اور بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کی طرف ایسے بے پناہ سکون سے دیکھ رہا تھا کہ زرینہ کی رگوں میں خون جم گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بانہیں پھیلا کر جھپٹ کر اسے آغوش میں لے لے گا' اس کا منہ چوم لے گا اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کی طرف ہاتھ تو بڑھائے گا۔

دیمیطر لیس بے جس و حرکت کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ چپ چاپ کھڑا رہا' گویا آئینِ شاہی کی حرف بہ حرف پیروی کر رہا ہے اور بہ زبانِ حال صاف صاف کہہ رہا ہے کہ "ارشاد ہو' تعمیلِ حکم کی جائے گی" پھر یہ دیکھ کر کہ زرینہ نے کچھ ارشاد نہیں کیا وہ چار قدم رکھ کر دریچہ کے پاس پہنچ گیا۔ روزن سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھنے لگا۔

زرینہ پشتِ بستر پر بیٹھی تھی، آنکھیں بے نور سی تھیں، ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔

دیمیطر لیس نے کہا، گویا اپنے آپ سے کہہ رہا ہے "یہی موزوں بھی ہے، موت سر پر منڈلا رہی ہو تو عشق کا کھیل کھیلنا بہت بھونڈا معلوم ہوگا، لیکن مجھے حیرت کا اعتراف کرنا ہے کہ آغاز ہی سے اس عورت کو انجام کیوں نظر نہ آیا کہ اس نے اس جوش و خروش کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے یہ کھیل ختم ہوا۔ مجھے کچھ افسوس تو ضرور ہے کہ انجام یہ ہوا کیونکہ ذرا سوچنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیچاری زرینہ کا قصور تو صرف اتنا تھا کہ اس نے کھلے الفاظ میں اس آرزو کا اظہار کر دیا تھا جو تقریباً تمام عورتوں کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی اور لوگوں کی آتشِ غضب کو بجھانے کے لئے ایک قربانی کے بکرے کی ضرورت نہ ہوتی تو میں یہ انتظام کر دیتا کہ اس بلند نظر ہوس کار کم عمر عورت کو صرف جلاوطن کر دیا جائے۔ اس طرح میرے سر سے بھی بوجھ اتر جاتا اور وہ غریب بھی زندگی کے لطف سے محروم نہ ہوتی۔ لیکن حالات ایسے نازک ہو گئے ہیں کہ یہ ہو نہیں سکتا، محبت کے یہ نتیجے نکلتے ہیں۔ شہوانیت کے ساتھ کسی اور خیال کی آمیزش نہ ہو یا کسی خیال کے ساتھ لذتِ جسمانی شامل نہ ہو تو انجام مہلک نہیں ہوتا۔ بہت سی عورتوں سے لذت یاب ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن توفیقِ ایزدی یاور ہو تو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ تمام منہ ایک ہی جیسے لذت بخش ہوتے ہیں۔"

دیمیطر لیس اخلاقیات کے متعلق اپنے ایک نظریے کا خلاصہ ایک لطیفے کی شکل میں بیان کر کے اپنے خیالات کی معمولی رفتار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے بھولی بسری کہانی کی طرح یاد آیا کہ گزشتہ شام وہ کسی کے گھر کھانے پر مدعو تھا، پھر اور دعوت قبول بھی کر چکا تھا، لیکن واقعات کے ہجوم میں اسے اپنا وعدہ بھول گیا۔ اب اس نے دل میں طے کر لیا کہ اپنی بد تہذیبی کے لئے عذر پیش کرے گا۔ پھر وہ یہ سوچنے لگا کہ آیا اپنے بوڑھے درزی کو بیچ دے۔ وہ ایک معمر غلام تھا اور پچھلے عہدِ حکومت کی تراش خراش کی رسمیات پر مرتا تھا اور نئے فیشن کی چنٹ والی قبائیں نہ سی سکتا تھا۔ اس کا ذہن ایسا پر سکون تھا کہ اس نے اپنی سیخ پنسل کی نوک سے دیوار پر زیگریس اور دیوتاؤں کا خاکہ سا بنایا جو پہلے سوچے ہوئے خاکہ سے ذرا مختلف تھا، یعنی مرکزی صورت کے

دائیں بازو کی جگہ بدل دی گئی تھی۔ اس نے ابھی اپنا کام ختم ہی کیا ہوگا کہ کسی نے ہولے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

دیمیطر لیس نے بڑے اطمینان سے دروازہ کھول دیا۔ بوڑھا جلاد اندر آیا۔ اس کے عقب میں دو سپاہی تھے جن کے سروں پر خود تھے۔ جلاد نے ملکہ کے محبوب کی طرف دیکھ کر کھیسیں نکال دیں اور کہا؛

''میں چھوٹی سی پیالی لے آیا ہوں۔''

دیمیطر لیس خاموش رہا۔

زرینہ نے گھبرا کر سر اٹھایا۔

داروغہ زندان نے کہا؛

''آ لڑکی، وقت آ پہنچا، شوکران پس چکی، بس اب یہی کام باقی ہے کہ تو اسے پی لے۔ ڈر مت، تجھے پتہ بھی نہ لگے گا کہ کیا ہو گیا۔''

زرینہ نے دیمیطر لیس کی طرف دیکھا۔ دیمیطر لیس نے آنکھیں نہیں جھکائیں، آنکھیں لڑائے کھڑا رہا۔ زرینہ اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کے سبز دائروں میں پتلیاں پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ زرینہ نے دائیں طرف ہاتھ بڑھا کر پیالی لے لی اور آہستہ آہستہ لبوں کی طرف لے گئی۔ لب ترکئے، ذائقے کی تلخی اور زہر خورانی کی تکلیف کو کم کرنے کے لئے شوکران میں شہد اور منشی ادویات ملا دی گئی تھیں۔

آدھی پیالی پی گئی۔ پھر یا تو اسے اگاتھان کے ڈرامے تھائیس کے کسی منظر کا خیال آیا جس میں ایسا ہوا تھا یا شاید خود بخود اس کے دل میں جو جذبات پیدا ہو رہے تھے ان سے یکبارگی متاثر ہو گئی۔ بہر نوع کوئی وجہ بھی ہو، آدھی پیالی پینے کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا کر دیمیطر لیس کے سامنے بھی یہی زہر پیش کیا۔ کم عمر نوجوان نے ہاتھ کے اشارے سے اس ناموزوں تجویز کو مسترد کر دیا۔ پھر ارضِ یہود کی یہ عورت باقی زہر بھی پی گئی اور ایساڈگڈگا کے پیا کہ پیالی کی تہ میں جو سبز سی تلچھٹ باقی تھی وہ بھی نہ چھوڑی اور اب اس کے چہرے پر ایک دردانگیز تبسم پیدا ہوا جس میں حقارت کا رنگ بھی جھلک رہا تھا۔

اس نے داروغہ سے پوچھا؛

''اب کیا کرنا چاہیے مجھے ؟''

''ذرا کمرے میں ٹہلو' جب پاؤں بھاری ہونے لگیں تو چت لیٹ جاؤ اور زہر پھیلنا شروع ہو جائے گا۔''

زرینہ دریچے کی طرف گئی' سہارے کے لئے دیوار کے ساتھ ہاتھ ٹیک لیا' ماتھا ہاتھ پر رکھ لیا' اور بھنشی صبح پر اپنی گمشدہ جوانی کی آخری نظر ڈالی۔ مشرق رنگ کے سمندر میں غرق تھا۔ ایک طویل پٹی جو ورقِ آہنی کی طرح زرد تھی افق کے ارد گرد لپٹی ہوئی نظر آتی تھی' گویا زرد رنگ کی شال ہو۔ ذرا اوپر آسمان پر علی الترتیب یاس کبود' پیل گوش اور تانبے کے شکن در شکن رنگ جھلک رہے تھے جو بتدریج محو ہوتے ہوئے آسمان کے بلند ترین حصوں کے سفیدی مائل لاجوردی رنگ میں تحلیل ہو جاتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ رنگوں کی یہ محفل برہم ہوتی چلی گئی۔ ایک سنہری تار ظاہر ہوا' بلند ہوا' پھیل گیا۔ ایک باریک سرخی آمیز خط نے کم تاب فضا کو روشن کر دیا اور خون میں نہایا ہوا آفتاب طلوع ہوا۔

خداوند کہتا ہے :

''نور تو بیٹھا ہے اور سورج کا دیکھنا آنکھوں کو اچھا لگتا ہے''

جب تک اس کے اعضا میں طاقت قائم رہی زرینہ کھڑی رہی' پھر وہ کانپی' سپاہیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے مجبوراً اسے اٹھا کر بستر پر ڈال دیا۔ وہاں بوڑھے داروغے نے عبا کے جھول نکالے اور اس کے اکڑے ہوئے اعضا پر عبا کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔ اس نے زرینہ کے پاؤں کو دبا کر پوچھا ؛ ''دباؤ معلوم ہوتا ہے ؟''

اس نے جواب دیا ؛ ''نہیں''

اس نے اس کے زانوؤں کو دبا کر پوچھا ؛ ''اب دباؤ معلوم ہوتا ہے ؟''

اس نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا اور پھر ناگاہ سر اور منہ کی طاقت استعمال کر کے کیونکہ اب اس کے ہاتھ بھی بے جان ہو چکے تھے وہ بستر سے اٹھی کیونکہ اس کے دل میں پھر آرزو کا شعلہ بھڑک اٹھا تھا اور شاید یہ بات بھی تھی کہ اس بے ثمر ساعت کی حسرت کاری اس کے دل میں سلگ رہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ دیمیطر لیس اس دعوتِ عشق کا جواب دے سکے وہ بے جان ہو کر گر پڑی اور اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بے نور ہو گئیں۔

جلاد نے اس کے لباس کے بالائی جھول اس کے منہ پر ڈال دیئے۔ایک سپاہی نے اس خیال سے کہ دیمیطر لیس اور زرینہ ایک دوسرے کی محبت کے اسیر تھے' تلوار سے بالوں کی ایک لٹ کاٹ دی جو زمین پر گر پڑی۔

دیمیطر لیس نے لٹ اٹھالی اور درحقیقت یہی لٹ خود زرینہ تھی۔اس کے حسن کی سنہری یادگار 'زرینہ کی وجہ تسمیہ! اس نے انگوٹھے اور ایک انگلی کے درمیان لے کر لٹ کو گھما کر دیکھا' بالوں کو آہستہ آہستہ علیحدہ کیا اور اپنے سلیپروں کے تلے جو خاک تھی' اس میں ملادیا۔

تیسرا باب

غیر فانی زرینہ

دیدہ ور آں کہ دل نہد تا بہ شمار دلبری
در دل خاک بنگر و رقصِ بتان آذری

دیمیطر لیس نے اپنے سرخ نگار خانے میں پہنچ کر جو سنگ مرمر' چوب بست اور نمونوں سے پٹا پڑا تھا' مستقل ارادہ کر لیا کہ اب کام کرنا چاہیے۔ بائیں ہاتھ میں تیشہ' دائیں ہاتھ میں ہتھوڑی لئے وہ اس مجسمے کو تراشنے میں مصروف ہو گیا جس کو اس نے نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ یہ مجسمہ ایک دیوزاد گھوڑے کی چھاتی اور شانوں سے عبارت تھا جو وہ پوسیدوں کی ہیکل کے لئے تراش رہا تھا۔ سر کی حرکت کی وجہ سے باریک کٹی ہوئی ایال کے نیچے گردن کی جلد چین دار ہو گئی تھی اور ایک نہرِ کم آب کی موجوں کی طرح اقلیدسی شکلوں میں اندر کی طرف خم کھا گئی تھی۔

آج سے تین دن پہلے دیمیطر لیس کی فرسودہ زندگی کی تمام دلچسپیاں سمٹ سمٹا کر اس عظیم الشان' قوی ہیکل مجسمے کی صورت گری کی تفصیلات پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ اب زرینہ کی موت کے دن گویا دنیا ہی بدل گئی تھی۔ جیسا سکون وہ حاصل کرنا چاہتا تھا وہ میسر نہ ہوتا تھا اور وہ طبیعت کو جو طرح طرح کے خیالات کی وجہ سے پریشان

تھی یکسو نہ کر سکتا تھا۔ سنگ مرمر اور اس کے درمیان پردے کی طرح ایک نقاب حائل ہو گیا تھا جو اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ اس نے ہتھوڑی پھینک دی اور گرد آلود چبوتروں کے درمیان ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔

ناگاہ صحن سے گزر کر اس نے ایک غلام کو آواز دی اور کہا ؛

"نہانے کا انتظام کرو اور عطریات بھی تیار کرو۔ مجھے نہلاؤ' عطر اور روغن ملو' میرا سفید لباس لاؤ اور گول انگیٹھیوں میں خورات جلاؤ۔"

جب غلام اسے نہلا دھلا کر فارغ ہو چکے تو اس نے دو اور غلاموں کو بلایا اور کہا ؛

"بندی خانے کے داروغے کو یہ مٹی دے آؤ اور اسے کہو کہ اس کمرے میں رکھ دے جہاں زرینہ کسبی نے دم توڑا تھا۔ اگر ابھی تک اس کی لاش گڑھے میں نہ توپ دی گئی ہو تو اسے کہنا کہ جب تک میرا حکم نہ پہنچے لاش کو اسی طرح پڑا رہنے دے۔"

اس نے اپنی پیٹی کی تہوں میں ایک اوزار ٹھونس لیا اور وہ مرکزی دروازہ کھولا جو ڈرومز والی سڑک پر کھلتا تھا۔

ناگاہ وہ دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ حد نظر تک پھیلی ہوئی افریقیائی خطوں کی دھوپ نے اسے چندھیا دیا تھا۔ گھروں کا اور بازار کا رنگ سفید ہونا چاہیے تھا لیکن عمودی آفتاب کے شعلے چمکتی ہوئی سطحوں پر اس طرح رنگ و نور کا مینہ برسا رہے تھے کہ چونے سے لپی ہوئی گلیاں اور دیواریں شدتِ حرارت سے تاباں ہو کر طرح طرح کے رنگوں کی گونج ہو کر رہ گئی تھیں۔ سیاہی مائل نیلے' سرخ و سبز نرگسی گل زرد' خام رنگ کے بڑے بڑے لرزاں داغ ہوا میں حرکت کر رہے تھے اور شفاف شعلوں کی شکل اختیار کر کے مکانوں کے چمکتے ہوئے ہاتھوں پر بے حرکت پڑے نظر آتے تھے۔

اس پردۂ نور کے پیچھے مکانوں کے خطوط بھی ٹیڑھے ٹیڑھے سے نظر آ رہے تھے۔ بازار کی دائیں دیوار مبہم طور پر فضا میں خمدار ہو گئی تھی' بادبان کی طرح تیر رہی تھی اور بعض جگہ نظر ہی نہیں آتی تھی۔ ایک پارۂ سنگ کے پاس ایک کتا لیٹا ہوا بالکل خون میں نہایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

دیمیطریس کے دل میں اس منظر کو دیکھ کر تحسین و توصیف کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اس نے اس منظر کو اپنی نئی زندگی کا عکسِ ظاہری تصور کیا ایک عرصہ دراز سے

اس کی زندگی پر سکون خاموش اور رات کی طرح خلوت گیر تھی' ایک عرصہ دراز سے اس نے چاند کی شعاعوں کو اپنا چراغِ راہ سمجھ رکھا تھا۔ ایک نفیس اندازِ نشست کے ست رُو خطوط کو اپنا معیار بنا رکھا تھا۔ اس کا آرٹ بے جان تھا۔ اس کے مجسموں کی سطح پر ایک لرزتی ہوئی خشکی چھائی ہوئی تھی۔

اس مہم غم انجام کے دوران میں جس نے اس کے دل کو مضطرب کر دیا تھا' آج اپنی عمر میں سمائی جاتی اس کش مکش میں اسے فتح حاصل ہوئی تھی اور اگرچہ وہ دوسری بار امتحان میں مبتلا ہونے سے ڈرتا تھا لیکن اس نے یہ ضرور سمجھا کہ قسم کھا کر اپنے آپ کو یقین دلائے کہ آئندہ کسی حالت میں اس بلند مقام سے نیچے نہ اتروں گا جہاں اپنے آپ کو لئے دیئے رہنا ضروری ہے۔ کم از کم اسے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ صرف وہی چیز گوشہ دل میں جگہ پانے کے قابل ہے جو کسی انسانی جذبے کی تہ کی خبر لاتی ہو (یہ چیز مرمر کے قالب میں ہو' رنگ کی صورت میں ہو یا شعر کی شکل میں! اس سے بحث نہیں ہے) یہ بھی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ جسمانی حسن محض خام مصالحہ کی حیثیت رکھتا ہے جسے دکھ سکھ ایک نیا پیکر بخش سکتے ہیں۔

یہ سوچتا ہوا وہ بندی خانے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا جہاں اس کے دونوں غلام اس کے منتظر تھے۔

انہوں نے کہا "سرخ گندھی ہوئی مٹی لے آئے ہیں۔ لاش چارپائی پر پڑی ہے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ داروغہ آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے"

نوجوان چپ چاپ اندر چلا گیا۔ لمبے گلیارے سے گزر کر چند سیڑھیاں چڑھ کر موت کے حجرے میں پہنچا اور احتیاط سے دروازہ بند کر لیا۔

لاش چارپائی پر پڑی تھی۔ سر دوپٹے کے نیچے سپاٹ معلوم ہوتا تھا۔ ہاتھ بڑھے ہوئے' پاؤں جڑے ہوئے' ناخن رنگے ہوئے' پور پور چھلے' پیلے پیلے پاؤں میں چاندی کے پازیب۔

دیمیطر لیس نے دوپٹہ اٹھایا۔ ابھی اس نے چھوا ہی تھا کہ درجنوں مکھیاں بھنبھنا کر اڑیں۔ وہ کانپ گیا۔ اس کے باوجود سفید اونی لباس کو ہٹا کر اور سمیٹ کر بالوں پر ڈال دیا۔

زرینہ کا چہرہ اس لبدی رنگ سے جگمگا رہا تھا جو موت بالوں اور پپوٹوں کو

بخشتی ہے۔ گالوں کی نیلگوں زردی میں جو باریک باریک لاجوردی رگیں ابھری ہوئی نظر آرہی تھیں ان کی وجہ سے بے حرکت سر مرمری معلوم ہوتا تھا۔ باریک لبوں پر ناک کے شفاف نتھنے ذرا چمک رہے تھے۔ کانوں کی نزاکت غیر مادی سی معلوم ہوتی تھی۔ دتیمطر لیس نے کبھی کسی رنگ میں اپنے خواب میں بھی بے نور ہوتی ہوئی جلد کی یہ مافوق الفطرت خوبصورتی اور چمک نہ دیکھی تھی۔

اسے زرینہ کے وہ لفظ یاد آئے جو اس نے پہلی ملاقات کے دوران میں استعمال کئے تھے۔

''تم نے ابھی تو میرا چہرہ دیکھا ہے۔ تمہیں کیا معلوم میں کتنی خوبصورت ہوں۔''

ناگاہ ایک شدید جذبے کے زیر اثر گویا اس کا سانس رکنے لگا۔ وہ زرینہ کا حسن دیکھنا چاہتا تھا۔ اب وہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنی سہ روزہ محبت کی یادگار حاصل کرنا چاہتا تھا جو اس کی موت کے بعد بھی قائم رہے۔ وہ اس قابلِ تحسین جسم کو عریاں کر کے ایک نمونے کی طرح استعمال کر سکتا تھا۔ زرینہ کی جو اضطراب انگیز وضعِ جسمی اس نے خواب میں دیکھی تھی، اسی وضع کا ایک مرمری بت تخلیق کر سکتا تھا یعنی غیر فانی زندگی کا مجسمہ!

دتیمطر لیس نے ٹھنڈی بانہوں کے نیچے ہاتھ دے کر لاش کو سرہانے کھینچ لیا، سر کو دائیں گال کی طرف موڑ دیا اور بال اٹھا کر جھکی ہوئی پشت کے نیچے پھیلا دیئے۔ پھر اس نے دایاں ہاتھ اٹھا کر کہنی کو ماتھے پر موڑ کر رکھ دیا۔ بے جان انگلیوں کو بند کر دیا، گویا تکیے کو بھینچ کر تھام رکھا ہے۔ عضلات کے دو نہایت جمیل خطوط کان اور شانوں سے اتر کر دائیں پستان کے نیچے جمع ہو گئے تھے جو ایک پکے پھل کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ پھر اس نے رانوں اور پنڈلیوں کا انتظام کیا۔ ایک ٹانگ ایک طرف تنی ہوئی تھی دوسری کا زانو اٹھا ہوا تھا اور ایڑی قریباً گلے کو چھو رہی تھی اس نے بعض تفصیلات میں ترمیم کی، کمر کو بائیں طرف جھکا دیا۔ زیور، کنگن، چوڑیاں، پازیب، ہار، چھلے اتار دیئے تاکہ عریانی کی مکمل اور صاف ہم آہنگی میں کوئی چیز بے آہنگی نہ پیدا کر سکے۔

اب نمونہ مطلوبہ وضع (۱) اختیار کر چکا تھا۔

دتیمطر لیس نے جو گیلی مٹی منگوائی تھی میز پر رکھ دی۔ دبا کر گوندھ کر انسانی

شکل دے کر اس نے اپنی صنعت کار انگلیوں سے ایک مہیب و عظیم شکل تخلیق کی۔

اس نے دیکھا بے حرکت لاش وہی وضع عشق اختیار کئے پڑی تھی لیکن دائیں نتھنے سے خون کی ایک باریک دھار لبوں پر گر رہی تھی اور نیم وا منہ کے نیچے قطرہ قطرہ گر کے خون جمع ہو رہا تھا۔

دیمیطر لیس کام کر تا گیا۔ اب مٹی جاندار ہو گئی۔ اس نے ایک شکل اختیار کر لی، زندہ ہو گئی، جسم کے اوپر بایاں بازو گول اور بہت بڑا نمودار ہوا۔ گویا کسی چیز کو آغوش میں لئے ہے۔ پنڈلی کے عضلات ابھر آئے، ایڑیاں تنی ہوئی تھیں۔

جب رات نے سینہ زمین سے اٹھ کر اس پست کمرے کو تاریک کر دیا تو دیمیطر لیس اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ چار غلام اس مٹی کے نمونے کو اٹھا کر نگار خانے لے گئے۔

اسی شام لیمپ کی روشنی میں وہ پاریائی سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے کو کٹوانے میں مصروف تھا اور ایک سال بعد تک بھی وہ اس مجسمے کو بنانے میں مصروف رہا۔

حوالہ جات

(۱) وضع؛ Pose تسلی بخش ترجمہ نہیں ہے۔ Haim اپنی لغت میں یہی ترجمہ دیتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے اس سے بہتر لفظ اختیار کرنا ممکن ہے۔

چوتھلباب

رحم

اثر میرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

"داروغہ جی! داروغہ جی! دروازہ کھولئے۔"

روڈس اور مرطس ہندی خانے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں۔

دروازہ نیم وا کیا گیا۔

"کیا بات ہے؟"

مرطس نے کہا "ہم اپنی گوئیاں زرینہ کا منہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ بیچاری زرینہ آج صبح مر گئی جو۔"

"چلو ہٹو اس کا منہ تم نہیں دیکھ سکتیں۔"

"نہیں داروغہ جی! مہربانی کیجئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ ہم کسی سے بات نہیں کریں گے۔ وہ ہماری گوئیاں تھی۔ ایک بار منہ دیکھ لینے دیجئے تھوڑی دیر ٹھہریں گی چپ چاپ۔"

"اور جو کسی کو پتہ چل گیا؟ تمہاری وجہ سے مجھے سزا مل گئی تو؟ جرمانہ تم تھوڑے ہی دو گی۔"

''کسی اور کو پتہ کیسے لگے گا۔ بند ی خانے میں اور تو قیدی ہے نہیں۔ سپاہیوں کو آپ نے بھیج ہی دیا ہے۔ ہمیں پتہ ہے' مہربانی کر کے مان جائیں' ہمیں اندر آنے دیں۔''

''اچھی بات آجاؤ لیکن دیر تک نہ ٹھہرنا۔ یہ رہی کنجی' تیسرا دروازہ ہے۔ جاؤ تو بتا کر جانا۔ دیر ہو گئی' مجھے نیند آرہی ہے۔''

نرم دل بوڑھے نے انہیں آہنِ کوبیدہ کی کنجی دے دی۔ جو اس کی پیٹی میں لٹک رہی تھی اور دونوں اچھوتیاں لپک کر تاریک گلیارے میں ہو رہیں۔ ان کے پاؤں میں چپلیاں تھیں اس لئے تیز بھاگنے کے باوجود کوئی صدا پیدا نہ ہوتی تھی۔ داروغہ اپنے گھر چلا گیا' کوئی مجرم تو تھا ہی نہیں جس کی حفاظت کا فکر ہوتا۔ اس زمانے میں مصری قوانین کے مطابق قید کی سزا کسی کو نہیں دی جاتی تھی۔ اس مختصر سے سفید گھر میں' جس کا داروغہ یہ نرم دل بوڑھا تھا' صرف وہی قیدی رکھے جاتے تھے جن کو سزائے موت کا حکم ہو چکا ہو۔ اس کے علاوہ کوئی بند ی خانہ کے پاس بھی نہ پھٹکتا تھا۔

جب بھاری کنجی قفل میں پھرائی گئی تو روڈس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی سہیلی کو روک دیا۔

''میں ڈرتی ہوں شاید مجھے اس کا منہ دیکھنے کی ہمت نہ ہو۔ مرطس! مجھے بڑا پیار تھا اس سے۔ تم پہلے جاؤ۔''

مرطس نے دروازہ کھولا' جونہی اس نے اندر کا نظارہ دیکھا اس نے کہا روڈس تم کھڑی رہو ابھی اندر نہ آنا۔''

''کیا بات ہے؟ تم بھی ڈر گئیں؟ بستر پر کیا ہے' کیا مر گئی؟''

''ہاں مر گئی بیچاری۔ ذرا ٹھہرو میں ابھی بتاتی ہوں باہر ٹھہری رہو۔ ادھر نہ دیکھنا۔''

زرینہ کی لاش ابھی تک وجد کی اس وضع میں تھی جو دیمیطر لیس نے غیر فانی زندگی کا مجسمہ بنانے کے لئے قائم کی تھی۔ لیکن انتہائی مسرت' وجد اور شدتِ درد و اضطراب کے آثارِ جسمی یکساں ہوتے ہیں' اس لئے مرطس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ زرینہ نے کیسے کیسے دردناک عذاب' کیسی کیسی ہولناک تکلیفیں' کیسے کیسے شہیدوں کے سے دکھ برداشت کئے ہوں گے' تب لاش کی یہ انوکھی شکل بنی ہے۔

وہ پنجوں کے بل آگے بڑھی۔ شفاف نتھنوں سے خون کا قطرہ قطرہ بہہ رہا تھا۔ جسم کی جلد بالکل سفید تھی۔ چاند پہ دھبا ہوتا ہے' یہاں نہیں تھا۔ چھاتیوں کی پیلی پیلی کچیں نازک ناف کی طرح پھیل گئی تھیں۔ اس کم بقا صنم خوابیدہ میں ایک گلابی سی جھلک بھی باقی نہ رہی تھی کہ زندگی کے آثار کا شبہ ہو لیکن پیٹ کی نرم نرم جلد میں کہیں کہیں زمردی نقطے نظر آرہے تھے جو اس بات کے شاہد تھے کہ اس جسم نو بہار میں جو ابھی ٹھنڈا بھی نہیں ہوا کروڑوں نئی زندگیاں پرورش پا رہی ہیں جو پہلی زندگی کی جگہ لینا چاہتی ہیں۔

مرطس نے لاش کا بازو پکڑ کر جھکا کر پہلو کے ساتھ لگا دیا۔ اس نے بائیں ٹانگ کو پھیلانا چاہا لیکن زانو اکڑ گیا تھا اور اسے اپنے مقصد میں پوری کامیابی نہ ہوئی۔

اس نے آہستہ سے کہا؛ "روڈس! آؤ' اب آجاؤ"

روڈس کانپتی ہوئی داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا' آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں' جونہی روڈس اندر آئی دونوں اچھوتیاں ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگیں۔

"ہائے بچاری زرینہ پیاری' بچاری زرینہ"

بس بار بار یہی کہتی تھیں

انہوں نے ایک دوسرے کے گال پر بوسہ دیا۔ یہ بوسہ شہوانیت سے بالکل خالی تھا۔ ان کے آنسوؤں نے ان کے لبوں کو اس تلخی غم کا ذائقہ چکھایا جس کو یہ کم عمر سہمی ہوئی لڑکیاں محسوس کر رہی تھیں۔ رو رو کے برا حال ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے کی طرف اداس نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی یکبارگی دردانگیز آواز میں سرگوشیاں کرنے لگ جاتیں اور ان کے الفاظ آخر کار سسکیوں کی شکل اختیار کر لیتے۔

"ہائے ہمیں کتنا پیار تھا اس سے' وہ کوئی گوئیاں تھوڑی ہی تھی بچاری' وہ تو ماں تھی' ماں جی۔"

روڈس نے پھر کہا "باجی اماں' باجی اماں"

مرطس روڈس کو لاش کے قریب لے آئی اور آہستہ سے کہا؛ "منہ چوم لو"

دونوں بستر پر ہاتھ رکھ کر جھک گئیں اور سسکیاں بھرتے ہوئے برف کی طرح ٹھنڈی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

پھر مرطس نے دونوں ہاتھ زرینہ کے بالوں میں ڈال کر اس کا سر اٹھا کر یوں

کہا۔

"زرینہ! پیاری گوئیاں!! دنیا میں تم جیسی پیاری کوئی ناری تھی ہی نہیں۔ تم دیوی کی طرح تھیں' لوگ باگ تمہی کو دیوی سمجھتے تھے' اب کہاں ہو؟ ان لوگوں نے تم سے کیا کیا؟ تم جیتی تھیں تو تم سے ہر ایک کو سکھ اور انند پہنچتا تھا تمہارا منہ پھل سے بڑھ کر میٹھا' تمہاری آنکھیں اجالے سے بڑھ کر چمکدار تھیں' تمہاری جلد شاندار لباس کی طرح تھی جسے تم نے کبھی نہ چھپایا اور تمہاری جلد پر پریم کا انند اس طرح تیرتا تھا جس طرح ہمیشہ رہنے والی مہک ہو۔ جب تم بال کھولتی تھیں تو ان میں سے سب آشائیں نکلتی تھیں اور جب تم ہمیں اپنی ننگی بانہوں میں لیتی تھیں تو ہم دیوتاؤں سے موت مانگتی تھیں۔"

روڈس جھکی ہوئی رو رہی تھی؛

"زرینہ! پیاری گوئیاں!!! ابھی کل کی بات ہے' تم جوان تھیں اور جیتی جاگتی تھیں' آنے والے دنوں کی امیدیں تمہارے دل میں سلگ رہی ہوں گی اور' اب تم بے جان ہو۔ اور کچھ بھی ہو جائے تم اٹھ کر ہم سے کبھی بات نہ کرو گی۔ تم نے آنکھیں بند کر لیں اور ہائے ہم تمہارے پاس نہ تھیں۔ تم دکھ بھوگ رہی تھیں اور تم کو پتہ نہ تھا کہ دیواروں کے پیچھے ہم تمہارے لئے رو رہی ہیں۔ مرتے وقت تمہاری آنکھوں نے کسی اپنے کو ڈھونڈا ہو گا اور ہائے تم کو ہماری دکھ بھری آنکھیں نظر نہ آئیں"

بنسی بجانے والی روتی رہی' گانے والی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"زرینہ' پیاری گوئیاں! تم نے ایک دن کہا تھا کہ تم ہمارا بیاہ کروا دو گی' لو اب رو رو کے گلے مل رہی ہیں۔ اس منگنی کو دیکھ کر دل بھر آتا ہے' لیکن پریم سے بڑھ کر دکھ نے ہمیں ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ ہم دونوں مل کر رو چکیں' اب کبھی جدا نہ ہوں گی۔ زرینہ اب ہم تیری لاش کو دبانے کے لئے لے جائیں گی اور تیری قبر پر اپنے بال کاٹ کر پھینکیں گی"

اس نے خوبصورت لاش کو ایک کمبل میں لپیٹ لیا اور روڈس سے کہا؛ "ہاتھ بٹاؤ"

انہوں نے آہستہ سے لاش اٹھائی لیکن بیچاریوں کو بوجھ زیادہ معلوم ہوا پھر زمین پر رکھ دی۔

مرطس نے کہا: ''چپلیاں اتار لیتے ہیں' ننگے پاؤں چلتے ہیں' داروغہ جی سوگئے ہوں گے' اگر سوتے رہے تو گزر جائیں گی اور اگر ان کی آنکھ کھل گئی تو وہ روک دیں گے۔ کل کیا ہوگا اس کی کوئی فکر نہیں۔ جب داروغہ جی دیکھیں گے کہ کمرہ خالی ہے تو ملکہ کے سپاہیوں سے کہہ دیں گے کہ انہوں نے لاش گڑھے میں توپ دی' قانون بھی تو یہی ہے۔ روڈس ڈرمت' چپلی پٹی میں ٹھونس لے' زانوؤں کے نیچے ہاتھ دے کر اٹھا' پاؤں آگے لٹکتے رہیں' آہستہ آہستہ' ہولے ہولے' چپ چاپ چلی آ۔''

پانچواں باب

تقدسِ مذہبی

جوانی گئی ' زندگانی گئی! محبت کی رنگین کہانی گئی
نہ پایا کسی نے محبت کا بھید بہت دیر تک خاک چھانی گئی
خدایا! وہ دنیا بھی ہوگی کہیں جہاں عشق کی بات مانی گئی
مبارک ہے میری جوانی کی موت
کہ یوں آپ کی بدگمانی گئی

جب وہ دوسری گلی کے موڑ پر پہنچیں تو لاش کو زمین پر رکھ کر چپلیاں پہن لیں' روڈس کے پاؤں ایسے نفس و نازک تھے کہ ننگے پاؤں سڑک پر چلنے سے زخمی ہو گئے تھے' خون بہہ رہا تھا۔

رات انوار سے پر تھی اور شہر پر خاموشی مسلط تھی' زمین پر صاف صاف آہن رنگ سائے جلوہ گر تھے' جن کی شکل مکانوں کے خطوطِ تعمیری کے مطابق تھی۔ کمسن اچھوتیوں نے پھر لاش اٹھائی۔ چھوٹی نے پوچھا: ''کہاں جا رہے ہیں ہم؟ کہاں دبائیں؟''

''ہر میز انوبس کے قبرستان میں' وہاں کوئی آتا جاتا تو ہے نہیں' وہاں زرینہ میٹھی نیند سوئے گی۔''

''بیچاری زرینہ مجھے کبھی خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ میں

چوری چھپے اس کی لاش لے کر گلیوں میں سے گزروں گی' جیسے چوری کا مال ہو' نہ تابوت' نہ روشنی۔"

وہ زور شور سے باتیں کرنے لگیں' گویا لاش کی موجودگی میں چپ رہنے سے ڈرتی تھیں۔ زرینہ کی زندگی کے آخری دن کے واقعات نے انہیں حیران کر دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اسے کنگھی' ہار' شیشہ' کیسے حاصل ہوا۔ دیوی کا ست لڑاہار وہ خود نہ چرا سکتی تھی' مندر کی ایسی حفاظت کی جاتی تھی کہ زرینہ کے لئے یہ کام کرنا ناممکن تھا۔ کسی اور نے مندر میں داخل ہو کر یہ کام کیا ہو گا! لیکن کس نے ؟ جہاں تک ان کے علم کا تعلق تھا مندر کے وہ محافظ جو مقدس مجسمے کی نگرانی پر مامور تھے ان میں زرینہ کا چاہنے والا ایک بھی نہ تھا' اور اگر کسی اور نے یہ کام زرینہ کے لئے کیا تھا تو اس نے اس شخص کو بے نقاب کیوں نہ کیا اور کچھ بھی ہو ان تینوں جرائم کے ارتکاب کا مقصد کیا تھا' سوائے اس کے زرینہ کو مبتلائے عذاب کر دیا گیا اور تو کچھ بھی نہ ہوا۔ کوئی عورت جب اس قسم کا کام کرتی ہے تو اس کا خاص مقصد ہوتا ہے' اسے کسی سے محبت ہوتی ہے۔ یقیناً زرینہ کو بھی کسی سے محبت ہو گی۔ لیکن کس سے ؟

بنسی بجانے والی نے آخر کار کہا ؛ "یہ بات کبھی معلوم نہ ہو گی' کوئی اور بھی زرینہ کے ساتھ اس کام میں شامل ہو گا' لیکن کم سے کم وہ شخص ہمیں نہیں بتائے گا کہ اس کام کا کرنے والا وہی ہے۔"

اس مرحلے پر روڈس نے جو ضعف کی وجہ سے کانپ رہی تھی آہ بھر کر کہا ؛" مرطس میں اب نہیں چل سکتی' اب چلی تو گر پڑوں گی۔ دکھ اور تکان کی وجہ سے مجھے سدھ بدھ نہیں رہی۔"

مرطس نے روڈس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا ؛" پیاری کوشش کرو کسی نہ کسی طرح یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ اُس دنیا میں زرینہ کی زندگی کیسی گزرے گی یہ آج ہمارے ہاتھ میں ہے' اگر آج اسے دبایا نہیں اور اس کے ہاتھ پر درہم نہ رکھا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے چاری دوزخ کے دریا کے کناروں پر ادھر سے ادھر ماری ماری پھرا کرے گی اور جب مردوں سے ہمارا ملاپ ہو گا تو ہمیں الزام دے گی کہ ہم نے مذہب کی رسمیں پوری نہ کیں اور پھر جواب نہ سوجھے گا۔"

لیکن کم عمر نازنین مرطس کی آغوش میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مرطس نے کہا؛ "جلدی کرو جلدی! کوئی آرہا ہے اس طرف۔ ادھر لاش کے آگے میرے ساتھ کھڑی ہو جاؤ' اپنی قباؤں سے لاش کو چھپالیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا"۔

پھر اس نے اپنی بات کاٹ کر کہا؛ "ٹائمن ہے' میں نے پہچان لیا۔ ساتھ چار عورتیں ہیں۔ وہ تو ہر چیز کی ہنسی اڑاتا ہے' ہم پر بھی ہنسے گا۔ ہائے اب کیا ہو گا تم ٹھہرو روڈس! میں اس سے بات کرتی ہوں"۔

مرطس کی آواز میں عجز و نیاز کی ایک دنیا پوشیدہ تھی۔

"ٹائمن ٹھہرو! میں تمہاری منت کرتی ہوں' میری بات سنو' مجھے تم سے بڑی ضروری باتیں کرنی ہیں اور تنہائی میں کرنی ہیں۔"

نوجوان نے کہا؛ "بیچاری ننھی! کیا ہو گیا' کیسی پریشان نظر آتی ہو' کیا کاندھے کی گھنڈی کھو گئی یا گڑیا گر گئی اور اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی' افسوس ایسا نقصان تو گویا ناقابل تلافی ہو گا"۔

مرطس نے دکھ بھری نظروں سے ٹائمن کی طرف دیکھا' لیکن چاروں عورتیں فلوتس' سیسو' کیلسٹین اور طرفہ اس کے گرد جمع ہو گئیں۔

طرفہ نے کہا؛ "تیری اماں کی چھاتیوں میں دودھ نہیں رہا تو ہم کیا کریں۔ پگلی ہمارے پاس دودھ نہیں ہے۔ صبح ہونے والی ہے' تمہیں تو گھر بستر پر ہونا چاہیے تھا' بچیوں نے چاندنی رات میں سیر کرنا کب سے سیکھا ہے؟"

فلوتس نے کہا؛ "اس کی اماں؟ ارے یہ تو چاہتی ہے کہ ٹائمن کو چھین لے جائے۔"

اور کی لسٹین نے کہا؛ "مارو' کوڑے مارو اسے۔"

اور اس نے ایک ہاتھ مرطس کی کمر میں ڈال کر اسے اٹھالیا اور اس کی قبا کا دامن اٹھا رہی تھی کہ سیسو نے قطع کلام کر کے کہا؛ "جانے دو مرطس کو مردوں سے کوئی لگاؤ ہی نہیں ہے' چھوڑ دو میں کہتی ہوں چھوڑ دو اسے۔"

ٹائمن نے کہا؛ "کیا بات ہے؟ کیا واقعی کوئی ضروری بات ہے' لو ادھر آ کے میرے کان میں کہہ دو۔"

مرطس نے کانپتے ہوئے کہا؛ "یہ بازار میں زرینہ کی لاش رکھی ہے' میں اور

میری سہیلی قبرستان کی طرف لئے جارہے تھے،لیکن لاش اتنی بوجھل ہے کہ ہم سے اٹھائی نہیں جاتی۔ ذرا ہماری مدد کرو،بہت دیر نہیں لگے گی،پھر اپنی چہیتیوں کے پاس چلے جانا۔"

ٹائمن نے اطمینان دلانے کے لہجے میں کہا؛"بیچاری لڑکیاں؟۔۔۔اور میں تم پر ہنستا تھا،تم مجھ سے کہیں اچھی ہو،ضرور مدد کروں گا میں تمہاری،اپنی سہیلی کے پاس جاکر میرا انتظار کرو،میں آیا۔"

اس نے اپنی چاروں چہیتیوں سے کہا؛"کوزہ گروں کے بازار میں سے گزر کر میرے گھر چلی جاؤ میں ابھی آیا،میرے پیچھے نہ آنا۔"

روڈس ابھی تک لاش کے سرہانے بیٹھی تھی۔ ٹائمن کو آتے دیکھ کر اس نے کہا؛"کسی سے کہنا نہیں،ہم نے اس کی لاش اس لئے چرائی ہے کہ اس کی عاقبت سنور جائے،ٹائمن!ہماری بات چھپائے رکھنا،ہم تمہاری ہیں۔"

نوجوان نے کہا؛"بے فکر رہو"

اس نے لاش کو کاندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور مرطس نے زانوؤں کے نیچے ہاتھ رکھے۔ وہ چپ چاپ چل رہے تھے۔روڈس کانپتی کانپتی پیچھے پیچھے جارہی تھی۔ ٹائمن خاموش رہا۔ان دو دنوں میں جذباتِ انسانی نے اس کے بسترِ عشرت کے ایک اور عارضی رفیق کو ٹھکانے لگادیا تھا اور وہ اس افراط پر حیران تھا جس کی وجہ سے لوگ اس طلسمی شاہراہ سے بھٹک جاتے تھے جو معیاری مسرت کی طرف جاتی تھی۔

اس نے اپنے آپ سے کہا؛"سکون،تغافل،چین،ہوس آفریدہ اطمینان،۔۔۔کتنے آدمی ہیں جو ان چیزوں کی قدر کرتے ہیں،ہم مضطرب ہوتے ہیں،کوشش کرتے ہیں،امیدوں کے محل تعمیر کرتے ہیں،حالانکہ صرف ایک چیز قیمتی ہے اور وہ اس بات کا علم ہے کہ لمحہ گزراں کے خزانوں میں جتنی عشرتیں پوشیدہ ہیں ان کا رس کس طرح نچوڑا جاسکتا ہے اور اس بات کا علم کہ کس طرح حتی الامکان اپنے بستر ہی پر پڑا رہا جاسکتا ہے۔

وہ اب اجاڑ قبرستان کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔

مرطس نے پوچھا؛"کہاں دبائیں؟"

"دیوتا کے بت کے نزدیک۔"

"بت کہاں ہے؟ میں یہاں کبھی نہیں آئی، مجھے قبروں سے اور کتبوں سے خوف آتا ہے۔ میں نے دیوتاہرم انوبس کی شکل نہیں دیکھی۔"

کہیں باغ کے وسط میں ہوگا، ڈھونڈ لیتے ہیں۔ میں بھی یہاں ایک ہی بار آیا ہوں۔ جب میں بچہ تھا تو میری ہرنی کھو گئی تھی، اس کی تلاش میں آیا تھا۔ چلو چنار کی اس قطار کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، بت مل ہی جائے گا۔"

بت مل گیا۔

مرمر پر چاندنی اور نمودِ صبح کے بھنشی رنگ جلوہ گر تھے، درخت ہائے چنار کی شاخوں کی سرسراہٹ گویا دور سے سنائی دینے والے گیت کی طرح مبہم تھی لیکن کھجور کے پتوں کی ہم آہنگ و موزوں صدا کی وجہ سے (جو بارش کے قطروں کے ٹپکنے کی آواز سے مشابہ تھی) اسی طرح معلوم ہوتا تھا گویا ہوا تازہ اور صاف ہے۔ ٹائمن نے ایک گلابی سے پتھر کو ہٹایا جو زمین میں مدفون تھا اور دیوتا کے ان ہاتھوں کے نیچے جو گویا عملِ حنوط میں مصروف نظر آتے تھے، ایک قبر کھودی گئی۔ کبھی دیوتا کے ہاتھوں میں لاش ہوگی لیکن اب سوائے بھوری سی مٹی کے اور کچھ نہ تھا۔ نوجواں کمر تک قبر میں اتر گیا اور ہاتھ بلند کر کے کہا: "لاؤ، اتار دو یہاں، دوسرے گوشے میں رکھ کر قبر کا منہ بند کر دیں گے۔"

لیکن روڈس لاش پر گر پڑی۔

"ابھی نہ دباؤ، اتنی جلدی نہ کرو، میں اسے پھر دیکھنا چاہتی ہوں، ایک بار اور، ایک بار اور، آخری بار، ہائے زرینہ، بیچاری زرینہ، ہائے ذرا دیکھنا کیسی بدل گئی، ہائے کیسی خوفناک شکل ہو گئی۔"

مرطس نے وہ دوپٹہ جو لاش کے گرد لپیٹا گیا تھا نہ کیا تو چہرہ ظاہر ہوا اور اس میں اتنی جلدی تغیرات پیدا ہو گئے تھے کہ دونوں لڑکیاں چونک کر پیچھے ہٹ گئیں۔ رخسار چار گوشہ ہو گئے تھے، ہونٹ اور آنکھوں کے پپوٹے پھول گئے تھے، مافوق الفطرت حسن کا ایک جزو بھی باقی نہ رہا تھا۔ انہوں نے موٹا کفن سرکا کر سر ڈھک دیا لیکن مرطس نے جلدی سے کردن کے لئے زرینہ کے ہاتھ میں ایک درہم رکھ دیا۔ پھر لڑکیوں نے ہچکیاں لے لے کر جو کسی طرح ختم نہ ہوتی تھیں، بے حرکت اور نرم لاش کو ٹائمن کے حوالے کر دیا۔

جب زرینہ اس ریتلی قبر کی آغوش میں رکھی جا چکی تو ٹائمن نے لفن سرکا دیا۔ اس نے اپنا اطمینان کر لیا کہ درہم زرینہ کی بے حرکت انگلیوں کے درمیان پھنسا ہوا موجود ہے۔ سر کے نیچے ایک سپاٹ پتھر رکھ دیا۔ جسم پر پیشانی سے لے کر زانوؤں تک اس نے سنہری گھنے بال پھیلا دیئے۔

پھر وہ قبر سے نکلا اور دونوں لڑکیاں کھلے منہ والی قبر کے کنارے دوزانو ہو گئیں۔ اپنے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر اور ایک جگہ باندھ کر لاش کے ساتھ دبا دی۔

Aphrodite